

فکر تو نسوی

فکر تو نسوی



# فکر نامہ

طنز و تحریروں کا انتخاب

## فکر تونسوی

تقسیم کار

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

اپنے ہی نام —

اپنے پر اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں

## ترتیب

۹	عشق و خلق انجم
۱۳	تعارف کرشن چندر
۱۷	تکریتی مصنف
۲۹	۱۔ جنم سے جنم تک۔ آہ! نکو قنوی
۳۷	میری وصیت
۴۳	عالم بالا پر
۵۵	خدا کی جنت
۶۶	قبر سے واپسی
۷۶	میرزا نیر جہنم
۸۵	۲۔ زور خطابت — شاعرے میں صدیقی خطبہ
۹۱	مجلس دعا و کیٹی
۹۹	بیڈروں کی محفل میں
۱۰۶	بیالیسواں جنم بن
۱۱۷	۳۔ کچھ اپنی کچھ پرانی — گرم مشدہ کی تلاش
۱۲۷	نکرو قنوی نے ایکشن لیا
۱۳۶	وارنٹ گرفتاری
۱۳۵	بیویوں کی ٹریڈ یونین
۱۵۳	سوانحہ، ایک بیمار



- ۱۶۰ قد کے لیے کنیا کی ضرورت
- ۱۶۷ میں مالک مکان بنا
- ۱۷۵ چڑت لال نے ظلم بنائی
- ۱۸۵ بیوی کے بھروسے
- ۱۸۸ ۴۔ شوخی گشتار — اور سائیں بابا نے کہا
- ۲۱۱ ماؤدین ہتو آپریش
- ۲۲۵ دہلی جو ایک شہر ہے
- ۲۵۳ خط لکھیں گے
- ۲۷۷ ۹ ۹ ۹
- ۲۹۱ دل کی ڈائریاں
- ۳۱۷ لغات نکوی
- ۳۲۷ ۵۔ عرق انقبال — کروڑ پتی بن جاؤ گے
- ۳۳۰ ہم نوشیرواں بنے
- ۳۴۷ مسخرا
- ۳۵۷ ۶۔ پیاز کے پھلکے — آٹھ اخباری کلام

## پیش لفظ

مگر تو نسوی طنز نگاروں کی میں نسل سے قلق رکھتے ہیں، اُن میں تقریباً سب ہی کے قلم کی سیاہی سوکھ چکی ہے۔ انہوں نے لکھنا بند کر دیا ہے یا خود کو ڈھرا رہے ہیں۔ لیکن جدت اور تازگی کی تلاش نے تو تو نسوی کو ادبی موت کا شکار نہیں ہونے دیا۔ فنکار صاحب طنز و مزاح کے لیے غام مواد کتابوں اور تحفیل سے نہیں، بلکہ براہ راست زندگی سے حاصل کرتے ہیں۔

حمر کی ایک منزل ایسی آتی ہے جب بڑے سے بڑے جدت پسند انسان کے فکرو خیال اور احساس میں جمود آجاتا ہے اور وہ اپنے ذہن کے دریچوں کو اس طرح بند کر لیتا ہے کہ نئی فکری تادہ چا یا لکھ نہیں آ پاتی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ

پرانی نسل نئی نسل کے مقابلے میں احساس برتری کا شکار ہو جاتی ہے۔ دراصل یہ احساس برتری احساس کمتری کی دوسری شکل ہوتی ہے، اور وہی فن کار ادبی موت کے چنگل سے بچتا ہے جو نئی نسل اور نئے حالات کا ساتھ دیتا ہے۔ ایک محاس اور باشعور انسان کو ہر لمحے بدلتی ہوئی زندگی نئی بصیرت اور نئی آگہی دیتی ہے جس سے نئے نئے موضوعات جنم لیتے ہیں۔ میرے اس دعوے کا ثبوت روزانہ "غلاپ" کا مزاحیہ کالم ہے۔ جسے فکر و تنقیدی نگاہ سے دیکھیں۔ میری طرح سیکڑوں لوگ اخبار کی شاہ سرفی پڑھ کر مزاحیہ کالم "پیاز کے چھلکے" کے لیے صفحہ پٹ لیتے ہیں، اور یہ پورا کالم پڑھنے کے بعد ہی اخبار کا باقاعدہ مطالعہ شروع کرتے ہیں۔ مجھے یاد نہیں کہ فکر صاحب نے اس کالم میں کسی موضوع پر دوبارہ قلم اٹھایا ہو۔ اخبار کی خبروں کی طرح ان کا کالم ہمیشہ تازہ ہوتا ہے۔ صرف تازگی ہی اس کی خصوصیت نہیں بلکہ اس میں سیاسی، سماجی اور اقتصادی بصیرت، آگہی اور ہار یک جینی ہوتی ہے۔ پیشہ کے اعتبار سے فکر صاحب صحافی ہیں اور انھیں ہر حالی میں روزانہ ایک کالم لکھنا ہوتا ہے لیکن یان کی تخلیقی صلاحیتوں کا جادو ہے کہ ان تقریروں میں صحافیانہ انداز کے بجائے ادبی چاشنی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غلاپ کے مزاحیہ کالم کتابی صورت میں مرتب ہو کر اردو کے مزاحیہ ادب کا حصہ بن جاتے ہیں۔

فکر صاحب کی پیاز تو دیوار چین کی طرح ہے۔ جسے یا جوت ماجوت رات بھر جاٹ چاٹ کر بہت چھونا کر دیا کرتے تھے۔ لیکن صبح کو وہ پھر اپنی اصل صورت میں آجاتی تھی۔ فکر صاحب ہر روز صبح کو پیاز کے چھلکے اُتارتے ہیں لیکن پیاز رات کو پھراتنی ہی ہو جاتی ہے۔

ابھی تک پیاز نے دارمانی ہے اور ڈھکرنے۔ اردو کے طنز و ادب کے لیے وہ سوس تریں دن جو گا جب ان دونوں میں سے کوئی اپنی شکست مان لے گا۔

بہار نویں اور زرد نویں کے باوجود طنز و مزاح کا اعلیٰ ترین سیاق برقرار رکھنا ایک مجرب سے کم نہیں۔ اور تھو صاحب برسوں سے یہ مجرب دکھا رہے ہیں۔

فکر نے اس دور میں ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا جب ہمارا ایک سیاسی نظام ختم ہو کر دوسرا نظام شروع ہوا تھا۔ لیکن جس کے اقتصادی نظام میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ۱۹۴۷ء سے قبل ہندوستانیوں کو یقین تھا کہ آزادی جتنے ہی دن کے سب ڈکے دور ہو جائیں گے یہ محض خام خیالی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ حکومت کرنے والے صرف ہاتھ بدلتے تھے۔ ہندوستانیوں کی وہ دولت جو پہلے سمندر پار پھیل جاتی تھی اب اس کی تکلیف وہ سائش ہندوستانیوں ہی کے ایک محدود ترین طبقے میں ہو رہی تھی۔ جس نے ہم سب کو بے یقینی، احساس کمتری، عدم اعتماد اور معاشی بحران میں مبتلا کر دیا۔

مگر صاحب میں مصلح یا پناہ مند بننے کی صلاحیت نہیں۔ کیونکہ وہ خود کو سماج کا ایک عام فرد سمجھتے ہیں۔ انھیں بھی مصائب و آلام کا سامنا ہے۔ لیکن وہ ناامید ہو کر ذات کے خزاں خانوں میں گم نہیں ہوئے۔ وہ طنز و مزاح کے ہتھیار لے کر اس میدان جنگ میں کودے ہیں۔ وہ اپنے فن کے ذریعہ انسان میں حوصلہ اور ہمت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ شیع کی طرح جہل کرد و سردوں کو روشنی پہنچانے کے

قابل ہیں۔ خدا اس شخص کو ہمیشہ روشن رکھے۔  
 ”فکر نامہ“ فکر صاحب کی ساری زندگی کی ادبی کاوشوں  
 کا مجموعہ ہے۔ پوری کوشش کی گئی ہے کہ اس انتخاب میں  
 اُن کی تمام نمائندہ تقریریں شامل ہو جائیں۔

خلیق انجم

جزل سکری

## تعارف

میں ٹکروٹوسوی کو ایک شاعر کی حیثیت سے جانتا تھا۔ مجھے ان کے شاعر ہونے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ صرف ان کے نام کے آگے تو نسوی پر اعتراض تھا مگر جب شاعروں کے نام کے ساتھ جارجی اور جھنجھانوی ایسے القاب دیکھ لیے تو اپنا اعتراض واپس لے لیا۔

پھر ٹکروٹوسوی نے شاعری ترک کر کے طنز نگاری اختیار کی ہے تو دل ڈوبنے لگا کیونکہ ہرے بوڑھوں سے سن رکھا ہے کہ اچھے شاعر کبھی اچھے طنز نگار ثابت نہیں ہوتے۔ جس مزاح کی کمی ہوتی ہے مگر جب اپنے ورپے ٹکروٹوسوی کے طنز یہ مضامین پڑھنے کو ملے تو ماننا پڑا کہ ہر کچلے کے ساتھ چند استثنا بھی لگے رہتے ہیں۔ دنیا کے لیے وہ اب بھی ٹکروٹوسوی ہیں، میرے لیے ٹکروٹوسوی ہو کر رہ گئے ہیں۔

ہر مقبول طنز نگار اس میدان میں وارد ہوتے ہی سب سے پہلے اپنے کو پھر اپنی بیوی کو طنز کا نشانہ بناتا ہے۔ وہ ملازمندی ہوں۔ شوکت تھا نو سی یا ٹکروٹوسوی۔ یہ ہر دو ہستیاں اس لیے بھی مقبول ہیں کہ انھیں طنز کا نشانہ بنانے میں دعوے اٹالا حیثیت عرفی کا کوئی خطرہ نہیں (میدھا سیدھا تو میں عزت لکھو تو کسی پر رعب نہیں پڑے گا۔ ازالہ حیثیت عرفی۔ بھاری بھوک معلوم ہوتا ہے نا؟) بیویوں کی ٹیڑھوں میں ٹکروٹوسوی کی آزادی نسواں کی قائل معلوم ہوتی ہیں۔ کسی دوسرے مضمون میں پرانے رسم و رواج کی عادی، کبھی وہ شاہ خوب معلوم ہوتی تھی

کہیں پر پیسے کو دانت سے پکڑنے والی کہیں پر اپنے اطوار و گفتار میں شہد و شکر کی طرح شیریں کہیں پر نیزے کی آئی کی طرح تیز و تند۔ دراصل فنکو دوسروں کی بیویوں میں جو عیب یا خرابی دیکھتے ہیں فوراً اپنی بیوی پر لا دیتے ہیں۔ اس میں آسانی بھی رہتی ہے۔ بیویاں اپنے شوہروں کے مضامین کو "خرافات" سمجھ کر نہیں پڑھتیں۔ کسی دوسرے کی بیوی کا شوہر سر پہنڈنے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتا۔ اود بات کہنے کا حق بھی ادا ہو جاتا ہے۔ کچھ عیب جو اس امر کو صحیح نہیں سمجھتے۔ ان کے خیال میں صحیح بات یہ ہے کہ فنکو اپنی بیوی تو بدل نہیں سکتے، اس کی عادتیں بدلنے رہتے ہیں۔ طنز نگاری کی خاطر یا تنوع کی خاطر کون جانے؟

اپنے طنز پر اور مزاحیہ مضامین میں فنکو اپنے آپ کو بد مذہب و ملامت بنانے سے نہیں چوکتے، ایک تو انہیں اپنی شکل و صورت پر اعتراض ہے۔ مجھے بھی اعتراض ہے۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ ہم میں سے کون نکلی ہیرو ہے۔ کرشن چندر، کنھیا لال کپور، مجتبیٰ حسین، فنکو تو نسوی، ضمیر حفیظی، یوسف ناظم، سوئے ادب نہ ہو اس لیے بڑے بزرگوں کے نام نہیں گنتا۔ مگر اصل قصہ یوں ہے کہ جب خدا نے طنز نگاروں کو بنایا تو اتنا تو سوچ لیا تھا کہ یہ لوگ دوسروں پر نہیں گئے۔ اس لیے ان پر دوسروں کے ہنسنے بنسانے کا سامان بھی پیدا کر دیا گیا تاکہ توازن برقرار رہے۔ مگر یہ تو ایک فروغی امر ہے۔ فنکو دراصل اپنی ذات کو سارے سماج کی خامیوں کا مریخ بنا کر ہنستے ہیں۔ ان کی ذات تو ایک کھونٹی ہے۔ جس پر وہ افراد اور سماج۔ حالات اور کردار۔ نفسیات اور اخلاقیات۔ منافقت اور مذہبیت کے مظالم اور فنکو دفن، شجہ سے اور تضاد کے سراپ اور ان کے رنگارنگ لباس تاکہ نازک کر قارئین کو ان کی شہدہ گری اور ملج بازی کے اندھ بھی ہوئی بدصورت حقیقت سے آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ بادی النظر میں فنکو اپنے آپ پر ہنستے ہیں۔ گہری نظر سے دیکھیے تو وہ دنیا پر ہنستے ہیں۔ ماضی گہری نظر سے دیکھیے تو وہ ہنستے نہیں ہیں، دور ہے ہوتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ طنز نگار کے آئینہ نگار نے نہیں دیکھے۔ افسانہ نگار۔ ناول نگار۔ وقائع نگار

زندگی کے ایسے پر آپ کو دلاتا ہے۔ طنز نگار نہ سنا ہے۔ وہ ادب کے صدف میں ایک آنسو کو منجمد کر کے اُسے قد آبدار بنا دیتا ہے۔ اس سنسی کی پرتوں کو ٹٹول ٹٹول کر اس ایک آنسو کی نرمی گری اور آنچ کو پالینا کسی ہندو قوم ہی کا کام ہے۔ ورنہ آج کل اکثر مجلس تہنہ تر تہنہ تر ہوتی ہے۔ جہاں ہزاروں لوگ کسی ایک فقرے کی ظاہری تماش و خراش پر سو پے بگے بغیر بے تحاشا تہنہ لگاتے ہیں۔ مگر اس ایک آنسو تک کون پہنچ سکتا ہے!

نکو کے مزاج اور طنز کی کئی پرتیں ہیں۔ اسی لیے شاید اُس نے اپنے نکاح کا نام "پیاز کے پھلکے" رکھا ہے جو شمالی ہند کے روزنامے "ملاپ" میں بڑی باقاعدگی سے شائع ہوتا ہے اور جس نے شمالی ہند کے لوگوں کی حس مزاح کی صحت اور تہذیب میں ایک بہت بڑا رول ادا کیا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ پیاز کے پھلے دو ایک پھلکے زیادہ کڑے نہیں ہوتے۔ یہی حال نکو کے مزاج کا بھی ہے۔ پھر جوں جوں پیاز کے پھلکے اُترتے جاتے ہیں اُس کی کڑواہٹ بڑھتی جاتی ہے۔ یہی حال نکو کے طنز کا بھی ہے۔ آخری گھٹلی بڑی کڑوی ہوتی ہے۔ اس قدر کہ آنکھ میں آنسو آ جاتے ہیں۔ اسی طرح جب آپ نکو کے مزاج کی آخری گھٹلی پر پہنچتے ہیں تو ذہن میں اس کی تلخی اپنی پوری تیزی اور تندی کے ساتھ چھا جاتی ہے۔ پیاز کے پھلکے... اسم با ستمی اسی کو کہتے ہیں۔

نکوئی اعتبار سے وہ سوشلسٹ ہیں۔ انقلابی۔ آدرش وادی۔ وہ اس گلے سرے سماج کو بدنام چاہتے ہیں۔ ہندوستانی معیشت کو تاناہ اور توانا دیکھنا چاہتے ہیں۔ نابرابری کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ پرانے فیوڈل اسایب کی جگہ انسانیت پرست اقدار کو مداح دینا چاہتے ہیں۔ زندگی میں جہاں جہاں پر بد صورتی ہے، ظلم ہے، پستی ہے، اندھی اعتقاد پرستی ہے۔ اس کی جگہ نکو اک ایسے نظام فکر کے حامی ہیں جہاں رنگ و نور کی شادابی ہو، باہمی الفت اور محبت کی باریابی ہو اور نئی نکوئی نظر اور نئے سائنسی علوم کی کامیابی ہو۔

نکو اپنے طنز و مزاح میں ہمیشہ ان مقاصد کے لیے لڑے ہیں جو کے لیے



صدیوں سے انسانیت پرست ادیب ہر ملک اور ہر عہد میں لڑتے اور جدوجہد کرتے آئے ہیں۔ مگر نے اپنے مقصد کی آفاقیت اور اپنے فن کی بلوغت پر کبھی حزن نہیں آنے دیا۔ ان کا مقصد اعلا ہے اور کہنے کا ڈھنگ نرالا ہے اس لیے ادب کی تاریخ میں وہ ہمیشہ عزت و احترام سے یاد رکھے جائیں گے۔

کرشن چندر

# فکرِ بیتی

میرے جنم پر دیوتاؤں نے آکاش سے پھول نہیں برسائے۔ کیونکہ وہ حدیث کے راج محل پر پھول برسائے ہیں معصوم تھے۔ وہاں ایک شہزادے نے جنم لیا تھا یعنی جنم سے ہی میرے اور دیوتاؤں کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ اب تک کشیدہ ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ شہزادے اور ادیب کو ایک ہی تاریخ اور ایک نمکھنر میں پیدا نہیں ہونا چاہئے۔ اسے آپ قانونِ فطرت کا نقص بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن دیوتاؤں کا رول بھی غیر مشرعیانہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔ انھیں پھولوں کے استعمال کا مناسب ڈھنگ آنا چاہئے تھا۔ اور اگر نہیں آتا تو خدا کو کچھ اٹلی جنٹ دیوتا پیدا کر کے چاہئیں۔

میں قوس میں پیدا ہوا۔ اگر قوس میں پیدا نہ ہوتا تو لاڑکانہ میں پیدا ہو جاتا۔ ٹمبکٹو بھی کوئی بری جگہ نہیں تھی۔ لیکن ہر جگہ مجھے فکر تھا کہا جاتا اور ہر جگہ میرا باپ چوہدری سرائی سنگھ کا میزبانی و مصیبت لائے ہی ہوتا۔ جس کے خلاف تو قیام ایک ادیب جتنا ایتنا اور دینا پھول نہ برساتے صرف اسٹیشن بنی پر کہ میر منشی کی چھت کے نیچے ڈیرہ کو کمرے نہیں ہیں۔ صرف ڈیرہ کمرہ ہے۔

بیس برس بعد میرے باپ نے مجھ پر انکشاف کیا: ”تمہارے پیدائش کی خبر

مجھے جیتو ساریاں لے سنائی تھی تو میرے منہ سے صرف اتنا نکلا تھا " پر ساتواں بچہ ہے اور شاید بچائیوں کی طرح بھوکوں مرنے کے لئے پیدا ہوا ہے؟

یعنی میرے والد (محترم) کے لئے میری پیدائش کی اہمیت صرف منہ سوں تک محدود تھی، پانچواں، چھٹا، ساتواں - نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کے ساتھ ساتھ سہاروں کے بھی میرے تعلقات بگڑ گئے۔ آج تک بگڑے ہوئے ہیں۔

منہ سوں کو قرآن ان کا مقدر نہیں بننا چاہیے۔

مگر جیتو ساریاں مجھے سہارے نہیں سمجھتا تھا۔ بلکہ ایک بچہ سمجھتا تھا جس میں معصومیت ہوتی ہے۔ وہ گاؤں میں واحد شخص تھا جس نے مجھے پیار سے دیکھی محلے میں گڑھی، ٹنگڑی بانٹی اور اتنا بھی نہیں سوچا کہ وہ ایک سستی اور گھٹیا چیز یا منٹ رلم ہے۔ وہ صرف اس بات کا قائل تھا کہ خوشی بانٹنی چاہئے۔ چاہے وہ گھٹیا اور سستی ہی کیوں نہ ہو۔

اور پھر ایک دن مجھے یوں لگا جیسے جیتو ساریاں کی بٹی میا لڑکان ہو گئی ہے اور پھلاؤ کو دیکھتے ہی میں نے بھی چھلانگ لگائی اور جوان ہو گیا۔ اس چھلانگ پر مجھے حیرت ہوئی اور مست رہی ہوئی۔ اور پرست نچرل تھی نچرنے ہم دونوں کے ہونٹوں پر گلاب کدائے اور میرے پاؤں جیتو ساریاں کی ٹاڑھی میں ایک دم سفید بال، آگے اور میں نے پھانڈ کے گھڑے پر ایک ہلکا "ٹاشن" کتک بھینکا۔ جسے اٹھائے ہوئے وہ کمونیکس سے آ رہی تھی اس "ٹاشن" سے اس کے سر اور چھاتی میں ایک دلکش "ٹناؤ" آ گیا۔

"تمہیں شرم نہیں آتی" بھاتو نے تن تنہائی چھاتی کو پلو سے ڈھانپ کر کہا۔

"آتی ہے" میں مسکرایا۔

وہ منہ پھیر کر شرما گئی وہ شرمانے کی ادب میں مسکرایا کرتی تھی۔

اور بھر گئی دن تک ہم اپنے دل کی دھڑکنوں کی بھاشا سمجھتے رہے اور بھڑل ہنس دل میں اعلا ن کیا کہ یہ پیار کی بھاشا ہے اور اس پیار میں جیتو ساریاں

کو دہی معصومیت نظر آئی جو ایک بچے میں ہوتی ہے اور اس نے میرے باپ سے کہا  
 "میرٹھی! تمہارا بیٹا میری بھانجی کے گھر بے پرکھر بیٹھنا ہے۔"

"اے ایسا نہیں کرنا چاہیے، کیوں کہ ہمارا خندان شریف ہے۔" میرے باپ کا  
 خیال تھا کہ میں بچوں کو باسی سرکھے شکرے پانی میں بھگو کر کھلاؤں گا میں وہ بھی شریف  
 خندان کے بچے کھلا سکتے ہیں برع و بآہ کسی کی زر خرید غلام نہیں ہوتے

میرا باپ ایڈورن میں خوش رہنا زیادہ بہتر سمجھتا تھا۔ مگر اس خوش کو ایک  
 دن نمبر دار کے لڑکے داؤد خاں نے زبردست حملہ کیا دیا۔ جب بچا تو شباب  
 کا سر غور بلند کے گمنوں سے آ رہی تھی، اور میرے کٹر کا انتظار کر رہی تھی تو داؤد  
 خاں نے اپنی ریشیں قمیص کے بازو بھاٹو کے راستے میں پھیلا دیئے۔ وہ بازو  
 کٹکی نہیں گئے، بلکہ داؤد انہیں آغوشِ محبت سمجھ رہا تھا، اس نے بھاٹو کو چیلنج  
 دیا۔ "مجھ سے عشق کرو۔ ورنہ ...."

"ورنہ ....؟" بھانجی نے ورنہ جتنے بکے بچے میں کہیں ایسی سہنہ "وہ گاؤں میں  
 سوائے میرے ہر ایک سے کہہ سکتی تھی مگر جیتو ساربان کے پاس صرف دو اونٹ  
 تھے۔ اور نمبر دار کے پاس تین گھوڑیاں، پانچ بیل اور چھ شکاری کتے تھے۔ ان سبھوں  
 نے مل کر بھانجی کو گروسوتے میں اٹھایا اور ایک پہاڑی کھوہ میں لے گئے۔ اور پھر پہاڑی  
 کھوہ سے تلچہ چھین سٹائی دیں۔ اور انگوٹوں نے منحوس آواز میں نکالیں اور پیاری  
 کڑے کہلاتے ہوئے کھوہ سے بھاگ گئے اور میری چھت پر آ گئے۔ یہ عشق کی معصومیت  
 کی اور اس کی روح کی تو بہن تھی۔ جسے آگے چل کر شاعر وادیب کے غالب میں ڈھنسا  
 تھا۔

"میرا کیوں؟ آخر کیوں؟" میں نے باپ سے پوچھا، جیتو ساربان سے  
 پوچھا۔ دونوں نے ہم آہنگ ہو کر جواب دیا "ایسا ہی ہوتا ہے بیٹا! یہ جنگ کی ریت  
 ہے جس میں نمبر دار اور خاندان ایک دستہِ خزان پر شیعہ کمر غی کھاتے ہیں۔ اور  
 کے بچے باسی کڑھی کھاتے ہیں، مرضی ان کی فریاد نہیں سنتی۔"

اور پھر راتوں رات گاؤں سے بھاگ گیا۔ اور گاؤں میں کسی کو بھی نہیں بتایا کہ میں ایسے جاگ کو بدل دوں گا اور مرغن اور باسی رونی کا فاصلہ مشادوں کا پھاتو کو بھی نہیں بتایا۔ کیسے بتانا۔ اس نے تو کنوئیں میں چھلناٹک لگا دی تھی۔ باسی ٹکڑے نے اپنی توہنی کے بدلے خود کشی کر لی تھی۔

چنانچہ خود کشی کے ہی میرے تعلقات بگڑ گئے۔ ایسی پھاتو سے ہی بگڑ گئے جو خود کشی کر کے سمجھتی ہے کہ اس سے لغاتیدار اور نمبردار کے دسترخوان سے مرغن بھاگ جائے گی۔

اور پھر ایک دن یوں ہوا کہ میری شہنی معصوم بچی راج رانی جس کے پاس نہ راج تھا نہ وہ رانی تھی۔ صرف ایک گلاسٹرا کیلا اور کتابیں تھیں۔ بستے میں باندھے اسکول جا رہی تھی۔ کہ یکایک خطرے کا مارن بجا آسمان پر ہوائی جہاز منڈلانے لگے۔ ان ہوائی جہازوں میں کوئی بسنہ کیلا اور کتاب نہیں تھی۔ بلکہ ہم تھے اور انھوں نے کہا کہ یہ جنگ ہے۔ اور اگر تم اسکول جاؤ گی تو ہم پینیک کر رہے تھیں ہلاک کر دیں گے کیونکہ ہم نے کتابیں پڑھ کر ہی یریم بنائے ہیں۔ اور معصومیت پر یریم مجھے یوں لگا جیسے نمبردار کا لڑکا داؤد خان پھاتو کے گھڑے پر اچھے گھوڑے کا سم مار کر کہہ رہا ہو مجھ سے عشق کرو اور نہ۔۔۔۔۔“

اور مجھے غصہ آگیا۔ مجھے نہ معلوم تھا کہ خصہ انسان کو اندھا بنا دیتا ہے۔ پھر میں نے لاڈلا سپیکر اپنے کاندھے پر رکھ لیا اور گاؤں گاؤں گھومنے لگا۔ ”ہم امن چاہتے ہیں۔ امن۔ کس لئے؟ شہنی راج رانی کے لئے۔ اس کے بستے کے لئے پرائمری فادرے کیلئے معصوم انھوں میں گنگنا نے نیگو رادر کالی واس کے لئے۔“

اور گاؤں کے ادبڑ کھابڑ راستوں پر مجھے کانٹے چبھے جھاڑیوں نے اٹھایا کیپڑے بست پٹ کیا، سرکھی مٹھی چائے، ابلتی بھوک اور ہوشوں کی پیڑیوں نے تجھے تھامنے دئے کہ یہ مقدس کا رہے۔ مہٹھی پٹا گھائے گی۔ اور مرغن اور باسی رونی کا فاصلہ مٹ جائے گا۔ اور کسی پھاتو کا گھڑا خود کشی نہیں کرے گا۔ اور پھر

سہرائی جہاز کا ہم شرم سے بچھل جائے گا اور معصوم راج رانی کا گلا سڑا کیلا ایک سیب میں بدل جائے گا۔ اور اس سیب پر ٹیگور کی گتیا بھلی لگے گی۔

لیکن جب میں امن کا لاڈلا سپیکر کا ندھے پر رکھے چل رہا تھا تو ایک ٹیلے پر بھجے بابا گورو دھن سنگھ بلا جہندہ برس تک کیلے کو سیب میں بدلنے کی خاطر جلی میں رہ گیا تھا۔ اس کی معصوم بھارت کو کسی نے ہم سے ہلاک کر دیا تھا اور وہ غصے میں آکر عذریہ پایا بن گیا تھا اور امریکہ بھاگ گیا تھا۔ وہاں سے دخانی جہاز میں بندوقیں بھولایا تھا مگر جہاز کو پایا اور بندوق سمیت انڈمان جلی کی دلدل میں پھینک دیا گیا تھا۔ ایسا تھا بابا گورو دھن سنگھ۔ اس نے میرے کندھے پر امن کی فاحشہ کو دیکھ کر استہزائیہ قہقہہ لگایا اور کہا۔

”تم بیوقوف ہو رنگ میں!“

کیا امن کی صدا لگانا بے وقوفی ہے بابا؟

”کیا امن؟ کس کے ساتھ امن؟ وہ شفق پر کا کر بولا۔“ جو لوگ شکاری تھے جھوڑ کر ٹیگور کی گیتوں کو بھنبھوڑتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہم امن سے کیسے رہ سکتے ہیں۔ مرلی کو تم نے پالا ہے مگر اسے نمبردار کا بیٹا تھا نمبردار کے ساتھ بیٹھ کر کھانا ہے۔ کیا ہم اس کے ساتھ امن سے رہیں! ہمارا باپ کیا کام کرتا تھا۔

”چوہدری خراسن سنگھ کا میری مشقی تھا“

”بس وہی! اس نے امن کا لاڈلا سپیکر زور سے گرا دیا۔“ ہمارے چہرے

پر حیرانی میں جو جھریاں ہیں۔ وہ اسی خراسن سنگھ نے ڈالی ہیں۔ یہ جھریاں جب مٹ سکتی ہیں جب ہم خراسن سنگھ سے جنگ کریں گے۔ امن نہیں۔“

کیا بابا گورو دھن سنگھ میرے باپ کی طرح ایبٹ آباد میں خوش رہنا جانتا تھا؟ چند ماہ بعد تاکہ بابا گورو دھن کے تعاقب میں پوریاں نے اس کی ریڑھ کی پٹمی پر گولی چلا دی۔ اس نام پر تھا کہ اس نے کسی چوہدری خراسن سنگھ کی جاگیر میں آئیں اسے دوبارہ کھانا کھانے کی نصیحت۔

تعلقات کشیدہ کرنے کے لئے ہی اس دنیا میں آیا تھا۔

نہایت احترام سے یہ سوال میں نے جمینی داس رنگ سارے کیا۔ جو مجھ سے اکٹھے گھنٹے روزانہ کام لیتا تھا اور دو آٹے روزانہ دیتا تھا۔ میں اس کی بھارتی رنگ سارکسٹی میں حسناؤں کے دوپٹے اور سبز زری کی پگڑیاں۔ نارنجی۔ گلابی سرسئی رنگتا تھا کیونکہ مجھے بھوک لگتی تھی اور کمپنی کو اس بھوک کا علم تھا۔ دو آٹے میں دال روٹی تو ملتی تھی۔ لیکن آٹو گو بھی کی سپیشل سبزی نہیں ملتی تھی۔ ڈھابے کے مالک سرسئی چند کو میں نے لاکھ سمجھایا کہ سپیشل سبزی کے لئے میرا من بے حد نچاٹا ہے۔ لیکن وہ کہتا۔ لاچ بری بلا ہے۔ شاستروں میں سے اسے پاپ کہا گیا ہے

میں نے سوچا، شاستر دو آٹے روزانہ پالنے والوں کے لئے نہیں لکھے گئے۔ اور ایک دن بور ہو کر میں نے جمینی داس سے کہہ دیا۔ "ماستر جی! کبھی کبھی یوں لگتا ہے، جیسے میرے آپ کے تعلقات کشیدہ ہو جائیں گے۔"

وہ بولا۔ "کوئی حرج نہیں۔ میرے تعلقات تو اس سپاہی سے بھی کشیدہ ہو گئے ہیں جو مجھ سے پانچ روپیہ مالانہ رشوت لیتا ہے۔ ہم کیا ہو تم کو اتنا مشغور بھی نہیں کہ تاریخی اور دیلا رنگ ملنے سے کون سا رنگ جنم لیتا ہے، قرمزی یا بادامی۔" میں نے کہا۔ "میں تو اتنا جانتا ہوں کہ تھا سیدار کا رنگ جب کرسی نوٹ کے رنگ۔ میں ملتا ہے تو پھیل کا رنگ جنم لیتا۔ جسے آپ ہر شام شاموں پھیل فروش سے خرید کر کھاتے ہیں۔"

پس کر جمینی داس نے مجھے فحش گالی دی۔ اور ملازمت سے الگ کر دیا۔ اور کہا۔ تم دوپٹے رنگنے کا فن کبھی نہیں جان سکتے۔ دیا وہ سے زیادہ تم پگڑی اور دوپٹے کی قوس قرز پر ایک نلکے سے ہو۔

کہنا ہنہ اور ہنہ!

میں نے تھا سیدار سے رپورٹ کی۔ اس نے کہا۔ اگرچہ فی الحال جمینی داس

سے میرے تعلقات کشیدہ ہیں۔ لیکن لوگوں کے متعلق اس کا نقطہ نگاہ صحیح ہے۔ وہ لوگوں کی بے باک زیادہ سمجھتا ہے جنہیں تو مچھلی کھاتا ہے۔

میں نے دل ہی دل میں مقنا سیدار پر اپنی ہتھ اندلی۔ اور بھاگ گیا ، بھاگتا گیا۔ بھاگتا گیا حتیٰ کہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

دراصل بھاگتے بھاگتے میں تیل چنبیلی سپیشل کی فرم کے قریب سے گذر رہا تھا جس کے مالک دھومی مل نے مجھے پہچان کر سے ہونکے دیکھ کر میرے ہاتھ میں برش اور سیاہی کا ڈبہ بکٹا دیا کہ ہمارے تیل کا اشتہار شہر بھر کی دیواروں پر لکھ آؤ۔ تم بہت ترقی کر جاؤ گے جس آدمی کو دو لقمے مل جائیں۔ اسے ترقی کہتے ہیں۔

مگر میں نے سوچا کہ دو لقمے بانٹنے کا سہرا اٹھیں ملتا ہے جو تیل کی ساخت میں ٹکا لوں سے فراڈ کرتے ہیں۔ ایک دن میں نے دھومی مل ڈاڈ سے کہا۔ مجھے چار لاکھ عنایت کر دیجئے۔ کیونکہ آج خطرہ ہے کہ اشتہار لکھتے لکھتے مجھے بھوک لگ جائے گی۔

وہ بولا۔ "میرے بزنس کا اصول ہے کہ مزدوروں کو جب پینہ آئے اسے اجرت دے دو۔ لہذا چاؤ، پہلے پینہ پیدا کرو۔"

میں نے کہا۔ "بشارتیں اصول ہے۔ لہذا ہاں ہی ہاں!"

ہاں ہی ہاں۔ "اس نے میری تائید کی۔

اور پھر دن بھر می جینے کی انکارے انگلی دھوپ میں دیواریں لکھتے لکھتے مجھ پر ہندوستان بھر کا افلاس گذر گیا۔ مجھے پینہ آیا۔ پٹریاں جنہیں آنکھوں میں چنگاریاں تڑتڑائیں۔ جسم میں بے در پے تڑپڑپاں آئیں۔ ہڑام سے بھوک کے بھوک کے بھول لگے۔ نروس سسٹم کو سینکڑوں جھکولے کئے۔ اور میں دھومی مل کی فرم سے دس بارہ گز کے فاصلے پر غش کھا کر گر پڑا۔ میرا پینہ دھومی مل نے دیکھا یا نہیں لیکن جب چپتیس گھنٹے کے بعد مجھے ہوش آیا تو میں ایک تابش میں لیٹا تھا۔ اور



ساجاں پر دیش کی ایک حسینہ مجھے ہنکھٹا ہنسل رہی تھی۔

میں نے پوچھا: کیا تم جیتہ ساریاں کی بیٹی پھاتو ہو؟

وہ پہاڑی چیل سے اپنی پتھر لی چھپاتیاں چھپاتے ہوئے بولی۔ ”پہلے تم بتاؤ  
تو راکھ کہاں ہے۔ مجھے تم پر پہاڑا رہا ہے۔ مجھے دہن بنا کر گھر لے چلاؤ۔“

میں نے کہا: ”اس دنیا میں جہنم لیتے ہی میرا گھر کھو گیا۔ جب تک میں اسے تلاش  
نہ کروں اس وقت تک تم میری دہن بننا ملو گی کر دو۔“

لیکن اس نے بتایا کہ بہت جلدی میں ہے۔ دو چار منٹ میں کسی کی دہن بننا  
چاہتی ہے۔ ورنہ وہ حرامی تو سر بازار آ جائے گا۔ جو مجھے بہکا کر لایا ہے کہ میں تختیں  
شہر کی راجکارہ بنادوں گا۔ لیکن یہاں لا کر اس نے میرے کنوارے کا ریشہ مقرر  
کر دیا۔ اس لئے آؤ۔۔۔ آؤ ریشہ کی اس دنیا سے بھاگ چلیں اور کس پہاڑی  
کھوہ میں بیٹھ کر دہا دہن کا ازلی گیت گائیں۔

اور میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ کل جب وہ تو سر بازار نشترے میں میرے  
رخسار کو گندیری سمجھ کر جوں رہا تھا تو کہہ رہا تھا کہ میں انسانیت پرست ہوں۔ اس  
بے ہوش چھوکرے کو سڑک سے اٹھا لایا۔ کیونکہ اس کی ناک بڑی مصوم لگی۔ مجھے  
دھوکا نہ دینے والی لگی۔ میں دھوکے والی ناکوں کی خوب پہچان رکھتا ہوں میں اسے  
اپنا شاگرد بنادوں گا۔

مگر پھر دہا دہن کے بھاگنے سے پہلے چھاپا بار پولیس آگئی اور تو سر بازار کے شاگرد  
کو گرفتار کر کے لے گئی اور پھر تو سر بازار کو زندگی بھر بندھ دے گی۔ پولیس کو اس کی اور میری  
ناک کی پہچان نہیں تھی۔ جیسی ناک اور پولیس سے میرے تعلقات کشیدہ ہو گئے  
آج تک کشیدہ چلے آ رہے ہیں۔

اور پھر مجھے یاد نہیں۔ میں رگ گیا۔ اور جیسے مجھ پر صدیاں گزر گئیں۔ ازل سے  
اب تک پھیننے والا انسانی کارواں گزر گیا۔ اور میں نے دیکھا کہ کچھ گھاؤ ہیں۔ کچھ پتھریاں  
ہیں کچھ انگارے ہیں جو میرا مسلسل تعاقب کر رہے ہیں۔ انہوں نے گیا کے جنگل میں

مجھے روک لیا، وہاں شایر، ایک ٹھنڈا پیر تھا اور وہاں ایک بوردہ، ایک گیلی بنیٹیا  
تپسیا کر رہا تھا اور پھر گیا کہ آسمان سے ایک قلم گرا اور خدا آئی: ”جہاں جہاں سے  
بھیا گئے ہو، وہاں وہاں واپس جاؤ اور اس قلم سے تپسیا کرو اور اس تپسیا سے گھٹاؤ کرو  
اور پھر ہی کوا اور سنگارے کو صحن، جذبے اور الفاظ عطا کرو اور یہ خدا کا حکم ہے اور  
یاد رکھو، خدا کا حکم اٹل ہوتا ہے۔۔۔۔“

اور اس خدا میں مسرت تھی جو میرے مساموں سے پھول کی طرح کھل اٹھی اور  
میں نے ظلمِ مہتمم میں پکڑ لیا جس سے یہ پھول خوشبو دینے لگے۔ اور مجھے یوں لگا جیسے  
یہ میرے مفقود حیات کی خوشبو ہے۔ کیلے اور سیب کے فاصلے کو ختم کرنے والی خوشبو  
ہے۔ اور اسی خوشبو پر تیرے تیرے میں دنیا کو یہ بتانے کا اہل ہو سکا کہ دیوتاؤں نے  
میرے جنم پر پھول کیوں نہیں برسائے۔ اور کہ خدا صرف ایک شرط پر انکی جینٹ دیوتا  
پیدا کر سکتا ہے۔ اگر پچانو خود کشی نہ کرے بلکہ گوردھن باجے کی طرح نو سر بازوں  
سے جنگ کرے۔

جنم سے پھر جنم تک

ہستی کے مدت فریب میں آجائو اسد  
عالم تمام حلقہ دارم خیال ہے

# آہ افکر تونسوی

بالآخر سہمہوستان کے ریزنم خود مشہور و معروف ادیب جناب فکر تونسوی  
راہی ملک عدم ہو گئے۔ اس سے پہلے ان کے والد صاحب بھی انتقال کر گئے  
تھے۔ اور اس سے پہلے دادا صاحب بھی۔

مرحوم موضع تونسہ ملک پنجاب میں پیدا ہوئے تھے۔ مگر مرے دہلی میں موت  
کے وقت بریلی میں ہوتے تو بریلی میں مرتے۔ جہاں مرگ نہیں تھے اور خوشی کا مقام  
ہے کہ وہ اپنی عمر سے نسبتاً زیادہ ہی جی کر مرے۔

مرحوم کو برسوں پہلے ایک پامسٹ نے بتا دیا تھا کہ آپ کو مرنے سے پہلے  
بیش بہادری سے ملے گی۔ مگر فوس کہ پامسٹ کی صرف ایک بات صحیح نکلی یعنی وہ  
مر گئے اور دولت والی بات انتہائی بے بنیاد نکلی۔ اس پامسٹ کے بارے میں  
عام مشہور تھا کہ اس کی وہی بات صحیح نکلتی ہے جو واقعی صحیح ہوتی ہے۔

مرحوم کے انتقال میں کوئی حرج نہیں تھا۔ صرف ایک لحاظ سے یہ موت دردناک  
ہے کہ وہ مرنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ انھیں دنیا میں ابھی بہت سے کام کرنا تھے۔ مثلاً  
۔ انھیں ایک صوفیہ سیٹ خریدنا تھا جس کی تناوہ پندرہ سال سے لے پھرتے تھے۔  
ایک پبلشر سے ٹوٹو میں میں کرنا تھی۔ جو ابھی تک مرحوم کی شرافت نسبی کے باعث ملو  
چلی آرہی تھی۔ اور انھیں کسی حسینہ سے محبت بھی کرنا تھی۔ کیونکہ یہ کام بھی گزشتہ چالیس

برس سے التزامی پڑا تھا۔

مرحوم کو وہم تھا کہ وہ کسی اونچی جگہ سے گر کر مر جائے گا۔ چنانچہ مرحوم نے ہر اونچی چیز سے پرہیز کرنا تھا۔ اونچے پہاڑ، اونچی سواری اونچے جانور، اونچے آدمیوں جیٹے کہ اونچے عہدے پر پہنچنے سے بھی بچتے تھے۔ ایک مرتبہ انھیں عذرشہ پیدا ہوا کہ کہیں لڑکی کرانے کرتے وہ کمیونٹ پارٹی میں لیڈر نہ بن جائیں۔ چنانچہ اسی ڈور سے کمیونٹ پارٹی چھوڑ دی۔

بہذا وہ صرف پیدل ہی چلا کرتے تھے۔ پیدل چلنے کی انھیں کافی مشق تھی اپنے عہدہ انٹلاس کے پورے بیس سال پیدل چلتے کاٹ دیئے تھے۔ لیکن۔۔۔ زشتہ تقدیر کو کیا کہیے کہ باوجود احتیاط کامل کے وہ اونچی جگہ سے ہی گر کر ہر لوگ سدھارے۔ ایک دن کتاب پڑھتے پڑھتے پیدل جا رہے تھے کہ سڑک کے ایک چھوٹے سے گڑھے میں پاؤں جا پڑا۔ گرے اور پھر اسی وقت اٹھے جب انھیں جنازے کے لئے اٹھایا گیا۔

احتیاط نے انھیں آخری وقت پر دعا دی حالانکہ انھوں نے پوری زندگی احتیاط میں گزار دی تھی۔ احتیاط کہیں گولی کپا تک نہیں کھاتے تھے کہ کہیں کھانسی نہ ہو جائے۔ اور جب کھانسی ہو جاتی تو اس کا علاج نہ کرواتے کہ کہیں ڈاکٹر غلط دوائی نہ دے دے۔

مرحوم اپنے جینچے ایک بیوی اتنی نیچے اور چند دشمنی چھوڑ گئے۔ دشمن دو قسم کے تھے۔ ایک وہ جن سے مرحوم نے قرضہ لیا تھا اور دوسرے وہ جنھوں نے مرحوم سے قرضہ لیا تھا۔ رسم جنازہ کے وقت تمام دشمنوں نے اعلان کر دیا کہ آج سے دشمنی ختم اور اب ہمیں مرحوم سے کوئی کٹا نہیں رہا۔

مرحوم اس سے پہلے بھی ایک بار فوت ہوئے تھے اور ڈیڑھ ماہ تک فوت رہے تھے۔ آخر تنگ آکر ایک اخبار کو چٹھی لکھ دی کہ وہ گنگا پور ضلع چھان میں بقیہ جاتا ہے۔ دراصل وہ موت کا اعلان کر کے عامہ الناس کو ایک خاک (SHOCK)

دیا جا رہے تھے مگر سوائے بیوی اور مالک مکان کے کسی نے آنسو نہیں بہائے  
لہذا وہ اپنی موت سے بے حد مایوس ہو گئے اور اعلانِ موت کی تردید کر دی۔

مگر اس مرتبہ وہ حقیقتاً انتقال کر گئے ہیں۔ اور ان کی موت کی تصدیق  
بڑے بڑے اہل الرائے اور ثقہ حضرات نے کی ہے۔ ان کے جنازے میں علماءِ دین  
شہر شامل ہوئے۔ ایک مانتی جلسہ بھی منعقد کیا گیا، جس میں ان کے پسماندگان  
کے لئے چندے کی اپیل کی گئی۔ ایک دانی شہری نے برسرِ جلسہ اعلان کیا کہ انھوں  
نے ایک فرم سے ڈیڑھ سو روپیہ لیتا ہے وہ وصول کر کے میرے چندے میں شمار  
کیا جائے (فرم مذکور دیوبند پرچی مکتی)۔ ایک پبلشر نے وعدہ کیا کہ حضراتِ مرحوم  
پر جہازِ حبشیت عربی کا مقدمہ کر رکھا ہے اسے واپس لیتے ہیں اور اس واپسی  
کو ہی ان کا ادراوی فنڈ تقصیر کیا جائے۔ اس پرتزائیاں بچانی لگیں اور پبلشر کو  
چھوٹوں کے ہار پہنائے گئے۔

مرحوم چند ایک اوصافِ حمیدہ کا مالک تھے اور چند ایک اوصافِ حمیدہ کے  
مالک نہیں تھے۔ اس لئے بڑے متوازن انسان تھے۔

دوسروں کو اذیت نہیں دیتے تھے۔ اپنے بچے کو چیت مانتے تو نیچے کے بجائے  
خود روئے لگتے۔ شفقتِ پدری کے سبب نہیں بلکہ اس ڈر سے کہ بچہ برا مان جائے گا  
پڑوسیوں سے بہت کم بولتے تھے کہ کہیں کوئی اختلاف رائے پیدا نہ ہو جائے۔ کم  
تعلیم یافتہ لوگوں میں حسد کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ قرضے کے کرائی جلدی لٹا دیتے  
تھے کہ قرض خواہ کو شک پڑ جائے کہ مذاقِ کر رہے ہیں۔ لیکن کئی بار قرضے کے کہیں واپس  
ہی نہ کرتے۔ اور اپنے آپ کو کافی رزقِ محسوس کرتے۔ اصولی طور پر خودی کے قائل  
تھے۔ لیکن آخری عمر میں خاصے خوشامدی ہو گئے تھے۔ کہا کرتے تھے۔ خوشامد کے  
بغیر خودی کو برقرار رکھنا انتہائی مشکل ہے۔ مگر اپنی خوشامد کا مذاق میں اڑایا کرتے  
تھے غرض بڑے رنگارنگ آدمی تھے۔

مرحوم کو اپنے خیالاتِ غلامی کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اور یہاں شوقِ انھیں نے دوبا

میں اپنے خیالات ظاہر کر بیٹھتے اور — یوں اپنا ترکش خالی کر بیٹھتے۔ چنانچہ لوگ انہیں جتنا پاکر ہلاک دیتے۔ اپنی طاقت کو بڑا سراسر انہیں رکھ سکتے تھے۔ اتنی ہی معمولی دھرمیوں اور علویوں تک سے مارکھا جلتے اور پھر ٹسوے بہاتے کہ دنیا کمینہ ہے کر رزوق ہے راہ! دنیا کے متعلق مرحوم کا تجزیہ کتنا حقلہ نہ تھا؟

مرحوم کی زندگی کا آغاز بے رزقوں سے ہوا۔ ماں روٹی کے سوکھے ٹکڑے پانی میں بھگو کر کھلاتی تو پروٹٹ نہ کرتے۔ رزوق دستور سے چاہتے۔ استناؤں کی تعلیمی قابلیت کی داد دیتے تو وہ فخر کی بجائے شرمنا جلتے، بھجولی انہیں دھکا دے کر گرا دیتے تو اس کا ذکر کسی سے نہ کرتے۔ زیادہ سے زیادہ گھر آکر طرزِ تپاک اہل دنیا پر ایک نظم لکھ دیتے۔

غرض ایسی ہی پے در پے بے رزقوں میں ان کی روحانی نشوونما ہوئی اور اگر فطراناً ذہنی نہ ہوتے تو لوگ ان کی ٹھریاں تک پس دیتے یہ ذہانت خدا کی دین یعنی انکا اپنا اس میں کچھ نہیں تھا۔ اپنی تو صورت ہی تو فیاں تھیں۔ اس کے والدین کی مالی حالت بہر حال کھا کر تعلیم اور دھوری چھوڑ دی اور ایک لگائے بڑے باں پگڑیاں اور دوپٹے رنگے کا کام کرنے لگے۔ بعد میں جب مشہور ادیب بن گئے تو بقتل اس رنگ۔ ریز کے بڑے مغرور رہ گئے۔

مرحوم نے رنگ ریزی کے بعد کئی پیشے اپنائے۔ رنگ ریزی، اکبر ریزی، کلر کی، اسکول ماسٹری، پینٹری، کانداری، چتر اسی گیری، طبابت — اور جب کہیں کامیاب نہ ہو سکے تو والدین نے رنگ آگراں کی شادی کر دی۔ اگر اس وقت شادی نہ ہوتی تو سنیا س دھارن کر لیتے۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ قدرت کو ان سے بڑے بڑے کام لیتے تھے۔ اس لئے قدرت نے ان کا بیواہ کر دیا۔ اہلیہ محترمہ نے آتے ہی ان کی سجاوٹ اور شرافت پر بنا بڑا ٹوٹاٹھلے شروع کر دیے۔ اور یہ اہلیہ محترمہ کی ہی دیہا ہے کہ وہ آخری عمر میں بڑے ڈپلومیٹ بن کر کہتے تھے۔ اگر میں کمینگی کو اپنا تا تو آج کس اسٹیٹ کا چیف منسٹر ہوتا۔

مرحوم اچھے خالص انسانیت پرست تھے۔ ہر وقت انسانیت کی بربادی کا خطرو  
لاحق رہتا۔ جتنی دیر جتنے، یہودی آدم کے علم میں ہے۔ اور اگر عمر خضر بھی مل جاتی تو بھی  
یہودی آدم کرتے رہتے۔ کچھ پوری طرح تو معلوم نہیں تھا کہ وہ کس قسم کی یہودی آدم  
چاہتے تھے۔ لیکن ایک بات صاف تھی کہ انسانیت کو کافی زیادہ بلند کرنا چاہتے تھے۔ مثلاً وہ چاہتے  
تھے کہ چور عدالت کے سامنے جاتے ہی مان لے کہ میں نے چوری کی ہے۔ انھیں  
بہت سمجھایا گیا کہ یہ ناممکن ہے مگر وہ مصرعے کہ ممکن ہے صرف مرنے سے  
ایک دفعہ پہلے بخش مانے کو چھاس فیصدی ممکن ہے۔

بہر کیف انھوں نے زندگی بھر بنی نوع انسان کی خاطر کام کیا۔ مثلاً نظموں  
کی ایک کتاب قلم بند کی۔ گلاس میں یہودی آدم کچھ زیادہ گہری ہو گئی کہ کسی آدم  
کی سمجھ میں نہ آ سکی۔ ادیبوں کی کئی غزلیں قائم کیں، جو آپس میں لڑ جھگڑ کر ختم ہو گئیں۔ دو منظر  
اخبارات اور چار ادبی ماہنامے بنائی گئے جو بنی نوع انسان کی عدم توجہی کے باعث  
یکے بعد دیگرے بند ہو گئے۔ ایک مرتبہ دیواروں پر یہودی آدم کے نعرے لکھنے کے  
یہ لکھے تو تند و تیز دھوپ کے باعث شرک پر بے ہوش ہو گئے۔ یہودی آدم کے سلسلہ  
میں ایک مرتبہ گرفتار بھی ہوئے تھے۔ لیکن میڈیکل گزٹرنڈ پر راکٹ پیسے گئے اور آئندہ  
گرفتاری سے توبہ کر لی۔ مگر عام طور پر انڈر گراؤنڈ انارکسٹوں اور باغیوں کو اپنے  
گھر میں پناہ دیا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو گئے۔

بعد میں معلوم ہوا کہ وارنٹ سیاسی خیالات کے باعث نہیں، بلکہ قرضہ کی وصولی کے  
سلسلہ میں جاری کئے گئے تھے۔ آخر چوکی نے فیور پیچ کر قرضہ چکا دیا۔ اس واقعہ کو یاد  
کر کے بڑے آبدیدہ ہو جاتے اور کہا کرتے، میری بیوی بنی نوع انسان کی بچی خادم ہے۔  
تیسری مرتبہ جب گرفتار ہوئے تو اس لیے کہ عالم سستی میں ٹیکسی والے سے لڑ پڑے، جو  
ناچانز کو یہ طلب کر رہا تھا اور یہ کہ ایہ یہودی آدم کے سنا فی تھا۔ نتیجتاً ایک ناست ٹوٹ گیا  
ایک ناخن اتر گیا اور پاؤں کی ایک ہڈی موٹ گئی۔

انسانیت کو بلند کرنے کے سلسلہ میں انھوں نے آٹھ درجن طنزیہ کتابیں لکھ ڈالیں۔



جو سب کی سب مقبول عام و خاص ہوئیں۔ اگرچہ ان کے پیشروں کو ہمیشہ شکایت رہی کہ ان کی کتابیں بھتی نہیں، جاسوسی ناول زیادہ بکتے ہیں، ایک بار انھوں نے ایک جاسوسی ناول بھی لکھا، وہ بھی نہیں بکا۔

ان کی تمام کتابوں میں یہودی آدم کے ہی تذکرے نہیں، جن میں چارپائی سے لے کر خداوند تعالیٰ تک ہر ایک کے خلقیات کی گئی ہے کہ یہ چبیزیں بنی نوع انسان کی خدمت کے لیے ہی پیدا کی گئی ہیں، خدا کو بھی وہ پیدا شدہ چیز سمجھتے تھے، کافر تھے نا۔ ہاں، افسوس ہے کہ ان کی کتابوں کے صرف ایک ایک ایڈیشن ہی بچے اور یہودی آدم اور حوری رہ گئی۔

لمنیرہ کتابوں کے علاوہ ایک سیاسی کتاب بھی لکھی جس میں ایک سیاسی رہنما کا قصیدہ تھا، مگر رہنما مذکور کے سیاسی نوال کے باعث کتاب مارکیٹ میں نہ آ سکی۔ یہ رہنما بھی یہودی آدم کے سلسلہ میں ہی کام کر رہا تھا۔

اعلیٰ پائیدگی ان کتابوں کے علاوہ انھوں نے ایک نہایت گھٹیا بازاری مشق سے ہمسر پودنوں ہی لکھا تھا، جو کچھ جسروں کی طرح خوب بچے صرف اسی کتاب کی رائٹنگ سے ہی ان کی بیوی نے طلاق دیوڑھوائے (مروم) ان زیورہ کو دیکھ دیکھ کر ہمیشہ مسرور آہ بھرتے اور کہا کرتے:

مستمر! یہ زیورہ نہیں، بنی نوع انسان کی بیٹیاں ہیں جو تم نے بہن رکھی ہیں۔ افسوس کہ انھوں نے مزید بازاری ناول لکھنے سے توبہ کر لی اور بنی نوع انسان کی مزید بچاؤ سوانح بن سکیں۔

اولاد! جب کہ مروجہ دنیا سے اُٹھ گئے ہیں، ان کے کاروبار سے نسیاں کی دوبارہ تدد و منزلت کرنا ضروری ہے۔۔۔۔۔ اگرچہ ان کی خاسیاں ان کے ساتھ ٹوٹ گئیں۔ اس لیے ہمیں کوئی خطرہ نہیں رہا۔ ان کی خوبیاں ہمارے درمیان رہ گئی ہیں، اور اب یہ دنیا کا فرض ہے کہ ان خوبیوں کو تہیوں کی طرح پائے پوسے اور بس منظم کام کو مرحوم

اوسو را۔۔۔۔۔ چھوڑ گئے ہیں اے پورا کسے۔ اور اگر پورا نہ کیا گیا تو خطرہ ہے کہ مرحوم کی روح ایک بار پھر بیان آجائے گی اور ایک بار پھر دنیا میں انسانیت پر حق کا پہیہ گھومتا ہو جائے گا۔ آمین، آمین!

## میری وصیت

میں یہ وصیت نامہ اس لیے لکھ رہا ہوں تاکہ میرے بعد میری جائیداد پر جو  
 ڈیڑھ لکھ روپے کے مکان پر مشتمل ہے جھنگڑا کھڑا نہ ہو جائے اور میرے وارث ایک  
 دوسرے کا خون نہ کر ڈالیں۔ کیوں کہ گزشتہ دنوں ہمارے محلے کے ایک بھائی نے  
 دوسرے بھائی کا ایک گھٹنا اور ایک ٹانگ اس بات پر توڑ دی تھی کہ ان کا مرحوم باپ  
 اپنے پیچھے جو اینٹیں چھوڑ گیا تھا ان کی تقسیم پر جھگڑا ہو گیا تھا۔ ایک بھائی نے ایک اینٹ  
 زیادہ اٹھائی تھی۔ اینٹ کا سائز چھ اونچے ضرب دس اونچے بتایا جاتا ہے۔

میں یہ وصیت چنگی لکھ رہا ہوں، کیوں کہ میں نہیں جانتا کہ میں کب مروں گا  
 مختلف جو تشریروں نے میری عمر مختلف بتائی ہے۔ ایک نے پچاس سال ایک نے پچتر  
 اور ایک نے نوے۔ یہ تینوں اندازے صحیح بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی۔ کیوں کہ آج کل

کے جو تئیں قلعہ پہلشروں کی کتابیں پڑھنے میں۔ میری عمر اس وقت اسیالیس سال ہے۔ میں ممکن ہے میں ایک سو اڑتالیس سال تک بھی زندہ رہوں۔ کیونکہ سنا ہے کئی بڑے بڑے بڑے ہی عمر تک جیتے رہتے ہیں۔ اتنی ہی عمر تک زندہ رہنے کی صرف دو وجہیں ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ وہ زیادہ سے زیادہ دیر تک صبح کی سیر کا لطف اٹھاتے رہیں اور وہ کسی یہ کہ ان کی خبر اخباروں میں شائع ہو سکے کہ نلاں صاحب ایک سو اڑتالیس سال کی عمر کے ہیں لیکن ابھی زندہ ہیں۔ بچانے ان کے زندہ رہنے چلے جانے کی وجہ کیا ہے ؟

پہر کیف میں ممکن ہے صرف اخباریں خبر چھپانے کی خاطر مجھے بھی ایک سو اڑتالیس سال تک زندہ رہنے کی حماقت کرنی پڑے۔ حماقت انسان کی مجبوری ہے غلامی نہیں ہے ! میرے گھر کے چھاڑا دیں، ساتواں زیر تعمیر ہے، میں نے زندگی میں جو کچھ کہا ہے وہ افراد سے اپنا فرض نبھی سمجھ کر کہا ہے۔ میرا بڑا لا کا جب خود کمانے لگا تو مجھے نمایاں خیر و دے کر مجھ سے الگ ہو گیا۔

چند سال پہلے ایک بری اینٹ نے مجھے موت کا ہوا دکھا کر گمراہ کر دیا تھا اور میں نے دو ہزار روپے کا بھیہ کر دیا تھا۔ دو سال تک قسطیں ادا کرتا رہا۔ اس دلدان میں وہ بری اینٹ خود مر گیا، اچانک ایک دن میں اپنے دو چھوٹے بچوں کی باتیں سن کر گمراہ راست پر آ گیا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

”پتو! ڈیڈی نے یہ کیوں کر وار کا ہے ؟“

”ہمارے لیے۔“

”ہمارے لیے کیسے ؟“

”دیکھ بے وقت ! جب ڈیڈی مر جائیں گے تو یہ دو ہزار روپے ہمیں مل جائیں گے۔“

”نہ جانے ڈیڈی کب مرے گے ؟“ ————— ”جب جگوان چاہیں گے۔“

”نہ جانے جگوان کب چاہے گا !“ (خند ہی آ رہا)

اور میں راہ راست پر آ گیا اور مجھے کی مزید قسطیں دینا بند کر دیں۔ کیوں کریں نے سنا تھا کہ جگوان مجھے بچوں کی روائیں جلد قبول کر دیتا ہے..... اس لیے میں وصیت

مکہ بچوں کو اگر میری موت کے بعد میری کمپنی میری جہاد میں قسطنطین واپس کر کے توڑ دیں  
میرے بچوں کو نہ دیے جائیں بلکہ کسی قبیلہ کے کو دیے جائیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میرے بعد  
میرے بچے بھی جہاد میں گئے لیکن موت کے بعد میرے بچے بھی تمہارے برابر ہیں۔

میرا جو دیشہ کرے کامکان ہے اسے میرے گھر کے چار افراد میں تقسیم کر دیا جائے  
احتیاطاً عرض ہے کہ میں نے یہ مکان بھارت شدہ حار قناس کمپنی سے قرض کے گھر پر  
تھا اور میرے گھر واسے نہیں جانے کہ میں نے قرض کی قسطیں کن کن غنیہ مریتوں سے ادا کیں۔  
شکایتیں نے بچوں کی نیکیوں میں سے کپڑا بچا یا نہیں بولے سے دیے جڑا ہیں بچا ہیں۔

ایک بار میں نے اپنے چھوٹے بچے منتوش کو چھوٹے سائز کی سیٹ خرید کر دی یعنی سائز  
بچا یا۔ میں نے بچوں کے دھرم میں پانی ملا کر انہیں تباہ کر دیا وہ صحت کے لیے مفید جوتا  
ہے۔ میں نے تین تین بچوں کو ایک ایک چار پانی پر سلا کر ان میں برادوں و اخوت پیدا کی،  
کالچ کی چوڑیاں پہنا کر میں نے بیوی کو نہایا وہ وائٹ اور دلکش مہا اور اپنا تین چوتھا  
عمر یہی کو یہ سمجھانے پر صرف کی کہ تم چاند کی طرح حسین ہو۔ بچوں کو چاند گھنے اور ساڑیاں  
نہیں پہنتا۔

یعنی اس صحت میں نے قرض کی قسطیں ادا کیں اور یہ باتیں میرے گھنے میں کسی کو  
معلوم نہیں، اگر میں اپنا غم نہ چھپاتا تو گھر واسے کبھی خوش نہ ہوتے اور یہی میری ذہانت تھی۔  
انسان غریب ہر تو ذہین ہو جاتا ہے اور صرف ذہانت ہی نے غریبی کا ساتھ دیا ہے۔ قناس  
کمپنیوں نے نہیں؛

لیکن میری ذہانت کے باوجود قناس کمپنیوں کی وہ قسطیں بھی ملک باقی ہیں اس لیے  
قانونی طور پر کمپنی ہی اس مکان کی مالک ہے۔ اگر میرے وارث میری قسطیں ادا نہ کریں  
تو بلاشبہ اسے قرض ہوئے دیں۔ میں اپنے مرنے کے بعد بھی اپنے اسلاف کو ہندو بھینا چاہتا  
ہوں۔

میرے بعد میرے بچوں کا کیا مستقبل ہوگا؟ میں کوئی دائے نہیں چاہتا  
کیونکہ میری تحریروں سے ہے کہ ہر بچہ اپنا مستقبل خود بناتا ہے، والدین تو بچہ کی کڑی ہیں

جسے ہر بچہ آسانی سے توڑ دیتا ہے اور توڑنے کے بعد کوئی خواہ مخواہ لگایا ہے کوئی کلرک بن جاتا ہے۔ کوئی بیرسٹر کوئی غنڈہ اور کوئی تھانیدار۔۔۔ کبھی کبھی کسی خواہ مخواہ فروش کا بچہ دفتری بھی بن جاتا ہے اور اس دفتر کا پھر جیب کاٹتے ہوئے بھی پھرتا جاتا ہے۔

اس لیے بچوں کے ہاں میں پلیگ کو ہیئت کرنے کا کوئی حق نہیں، البتہ فروا فروا میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میرا ڈاکا پاشی تو نظر اچھڑنے کے لیے بھاگ جائیگا، لیکن وہ تھالی سینا میں بلیک کی ٹمٹیں جتنا ہے۔ دوسرا ڈاکا رام کمار کوئی نہ کوئی سٹو جلائے گا۔ اگرچہ اس بے چارے کو ابھی یہ علم نہیں کہ اس کے اندر دھرم کے نام پر لوٹ چلانے کی کتنی صلاحیت موجود ہے۔

آج کل وہ ایک دیوبی کا بھگت ہے جو ہزاروں لگاتی ہے۔ رام کمار بھی ہزاروں کھائے گا۔ گوردن کرکار پر چڑھے گا۔ کوٹھی میں رہے گا۔ بڑے ٹپے ٹپے سٹریٹس اس کے پیچھے پاؤں دھوئیں گے جینائیں اس کے ارد گرد رقص کریں گی اور رام کمار انھیں بتائے گا کہ یہ رقص یہ خوشبو میں آتا اور پر مانتا ہے وصال کا ذریعہ ہیں۔

اور اگر رام کمار یہ سب کچھ نہ کرے گا یعنی وہ ذرا سا بھی ٹھہر گیا تو لڑکیاں جاکر چھلانگ لگا دیں گی کیونکہ آتم ہنتیا بھی آتما اور پر مانتا ہے وصال کا ذریعہ ہے۔ تیسرا ڈاکا بھگت ناتھ چپڑاسی، قلی، بس کھنڈیشٹر، اور ڈو ویزن کرک، ان میں سے کوئی عہدہ پانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اگر سماج نے اسے ان میں سے کوئی چیز حاصل نہ کرنے دی تو وہ کیونٹ پادری میں شامل ہو جائے گا یا شاعر بن جائے گا۔ بھولے ناتھ بنیادی طور پر نیک اور خلص آدمی ہے۔ اس لیے اس کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ کلرک بن جائے، پھر شادی کرے، پھر بچے پیدا کرے، جیسا کہ ہر بے بس گزشتہ میں رواج چلا آ رہا ہے۔ البتہ وہ منہ کا مزہ پانے کے لیے کلرکی کے ساتھ ساتھ کسی سیاسی پارٹی کا صدر بھی بن جائے اور شاعری وغیرہ بھی کرتا ہے تو کوئی رنج نہیں۔ سو سائنسی ایسے لوگوں سے بھری چلی ہے۔

میری دو لڑکیاں بھی ہیں جنہیں میں لوگوں سے زیادہ پیار کرتا ہوں۔ بڑی لڑکی بااثر اٹھائیس سال، ابھی تک کنواری بیٹی ہے، وہ دوشیزگی میں بھی بیوہ ہی معلوم ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اس نے دوشیزگی اور بیوگی کی درمیانی منزل خواب ہی خواہیں پار کر لی ہے۔

میں نے کئی بار جان بوجھ کر آنکھیں بند کیں تاکہ وہ کسی کے ساتھ بھاگ جائے، وہ نہیں بھاگی، شاید اس کا خیال ہے کہ عزت و درخانہ انوں کی لڑکیاں کسی سے پیار نہیں کرتیں بلکہ پیار اور شادی کے مراحل خواب میں طے کرنے کے بعد جو گن بن جاتی ہیں یا سماج سدھار کا کام کرنے لگتی ہیں۔

برہنہ بالاکا مستقبل طے شدہ ہے یعنی بیوگی اور سماج سدھار، جب اپنا سدھار نہ ہو سکے تو سماج ہی کا سدھار نہ پا رہا ہے۔

دوسری لڑکی ورنالا ہے۔ دھماکیس سال، اگر اس کی زندگی میں کوئی غیر متوقع حادثہ نہ ہو گیا تو وہ اپنی بڑی بہن کے نقش قدم پر چلی گی۔ گزشتہ دو برس سے وہ اکثر خاموش رہنے لگی ہے۔ یہ خاموشی خطرناک ہے۔ بچے شک ہے کہ وہ میری موت کا انتظار کر رہی ہے۔ لاش میں جلدی انتقال کر جاؤں تاکہ اس کی خاموشی کے طوفان کو کنا دے توڑنے کا موقع مل سکے۔ بچے اس سے شک کا بڑی جھٹ ہے میں نہیں چاہتا کہ یہ یاد یا شادی سے پہلے اس پر بھی ہوگی کا زمانہ آجائے، بیوگی سے پہلے کم از کم شادی شدہ تو ہونا ہی چاہئے۔ شادی نہ ہو ہی پیار رہا ہو! ورنالا کا خاموش طوفان چھری پر معاً نہ بدل سکے تو میری دیت ہے کہ وہ ضرور کنا دے توڑے اس سے میری تمنا تو سکین طے گی۔ سماج سدھار کے لیے میں صرف ایک لڑکی بھیٹ کر سکتا ہوں، دونوں نہیں!

میرے خاندان کی سب سے بڑی سنیا میری بیوی ہے، وہ سادی زندگی میری ساتھ محبت اور نفرت کے درمیان شقی رہی ہے۔ میرے بعد وہ اٹھریں مار مار کر روئے گی کہ میرے سر سو سائے نہ لگنا لاکھ میں اس کے سر پر جیشہ چلائی، دھوپ کی طرح پھیلا، اندہ میری پہلی کی طرح ہو گئی رہی۔ میرے بعد دھوپ اور پہلی دونوں کا رول ختم ہو جائے گا اور گھبراہٹ میں ایک اندھیرا چھا جائے گا۔ اس اندھیرے سے بچنے کے لیے یہی کہا کرتی ہے کہ سنے بھگوان! بچے میرے ہنسی دیو سے پہلے اس دنیا سے اٹھالے، اگر بھگوان ایسا نہ کر سکا تو مجھ کو آ میرے بعد ہی میری جائیں ہوگی۔ وہ ایک دلیر عورت ہے۔ لیکن صرف میرے لیے بڑوں کے سامنے۔ جب بڑوں درمیان سے نکل گیا تو اس کی دلیری بیکار ہو جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ میرے بعد وہ خاندان کے

شیرازہ کو بکرنے سے روک نہ سکے گی۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ جب شیرازہ بکھر جائے تو وہ کسی دوسرے آقائے شرم میں داخل ہو جائے۔ کیونکہ ہر چند وثنانی عورت کی دو منزلیں ہیں۔

گھر ہستی اور دوسرا آقائے شرم و درمیان کی سبھی منزلیں دھوکا ہیں، فریب ہیں۔ چھلاوہ ہیں۔

اس کے علاوہ میرا اپنے نتیجے کی دشمن چھوڑ کر جانا، ہوں۔ یہ سب دشمن کہیں میسر

دوست تھے جب ایک ایک کے میرے دشمن بن گئے تو میں نے مزید دست بٹانا چھوڑ دیا

اس لیے اس وقت میرا کوئی دوست نہیں ہے اور میری دوست کے مرجانے میں مجھے بہت اذیت

رہی ہے۔ مجھے اطمینان ہے کہ اب میرا کوئی دوست میرے چوں سے ہمدردی کرنے نہ

آئے گا۔ صرف دشمن ہی آئیں گے جو کہیں گے، اب مرحوم سے ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے۔

میں نے زندگی میں کچھ لوگوں کے ساتھ نیکیاں کیں جن کا احترام زندگی میں کسی نے

نہیں کیا۔ لیکن اب وہ انہیں اپنے دماغ کے قبرستان میں سے کھود کھود نکالیں گے

اور کہیں گے۔۔۔ مرحوم عظیم تھا، نیک تھا جس کا پھل اسے فرو دینے کا تھا۔ بلکہ کچھ

مزید نیچا کرنے کا موقع نہیں ملا، ورنہ وہ اور نیکیاں بھی کرتا۔

یہاں کچھ لوگوں سے برائیاں بھی کی ہیں جنہیں لوگوں نے میری زندگی میں ہیشہ یاد رکھا

ہے۔ لیکن میرے مرنے کے بعد وہ انہیں بھول جانے کی کوشش کریں گے۔ یہ ان کے کڈاؤ کی

کی جلدی ہوگی۔ اخلاق ہیٹ موت کے بعد بلند ہوتا ہے۔ لیکن انہیں یہ بھی جاننا چاہیے کہ

انہوں نے میں مجھ سے کافی برائیاں کی ہیں۔ اس لیے برائیوں کا حساب کتاب برابر سمجھا

جائے۔ اور اس سلسلہ میں مزید حقیقات بند کر دینے، اگرچہ بالکل بھروسے میں نہیں ہوں۔

میرے گھر میں کچھ فرنیچر ہے، کچھ برتن ہیں، کچھ کپڑے ہیں جنہیں میرے گھر سے

میں میں تقسیم کریں یا نہ کریں ایک ایک کریں اور ایک ایک سا بیٹ پر ایک دوسرے

گھنے توڑیں یا نہ توڑیں، مجھے اس سے کوئی دل چسپی نہیں۔ لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا۔

کہ یہ سب چیزیں مائے ہیں محاسن بھی گننا بھی۔ اس لیے

اس کے علاوہ میرے پاس کچھ کتابیں ہیں۔ ان میں، کثرت مانگے کی ہیں، کچھ جرائد ہوں

میں، کسی ۱۰ بھری کو دان کو دی جائیں۔ کچھ خلوط ہیں، جن میں کچھ ان دوستوں کے ہیں،



جو انھوں نے دشمن بننے سے پہلے لکھے تھے، پھر رشتے داروں کے ہیں، جو زندگی میں بھی بے معنی تھے اور مرنے کے بعد بھی بے معنی ہوں گے اور کچھ خطوط وہ ہیں جو میری محبوبہ نے مجھے لکھے تھے، دنیا کے ہر انسان کے پاس کم یا زیادہ ایسے پیغم پتر ضرور ہوتے ہیں، لیکن میری محبوبہ اب ایک شادی شدہ معزز خاتون ہیں اس لیے میری وارث ان خطوط سے بیک میل کرنے کی کوشش ضرور کریں گے لیکن موت سے ایک سو ن پچھ میں ان محبت ناموں کو تلف نہ کروں گا۔ میں اپنی محبوبہ کو بھی وصیت کروں گا کہ اگر اس کے پاس بھی میرے کچھ خطوط ہوں تو انھیں تلف نہ کرے۔ رُسا ہونے یا کرنے کا کیا فائدہ۔ رُساؤں صرف زندہ انسانوں کے لیے مناسب ہے :

اپنا وصیت نامہ قسم کرنے سے پہلے میں اپنے وارثوں کو ایک ضروری اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ مجھے ایک حیوانی ریڈیو رکھو برویاں شامیری نے کہا تھا کہ میری موت کسی اور نبی جگہ سے گرنے سے ہوگی۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میرے وارثوں کو چاہیے کہ اس حیوانی کو بکھڑا کر اسے کسی اور نبی جگہ سے گلا دیں، تاکہ اس کا جھوٹا اگر میرے حق میں صحیح ثابت نہ ہو تو اس کے حق میں ہی صحیح ثابت ہو جائے !!

## عالم بالاپر

جب میرا انتقال ہو گیا اور شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی کہ اس عظیم المرتبت  
 ڈاکٹر نے بھی تصدیق کر دی جس نے امتحان کے فوراً بعد اپنی نہیں مانگ لی تھی تو میری موت پر  
 تمام اعداء اور قریباؤں نے دھمکنے میں مصروف ہو گئے۔ چنانچہ اس مصروفیت سے فائدہ اٹھا کر  
 میں نے نفسِ منصری سے پروا نہ کی اور کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے کے راستہ باہر نکل گیا۔  
 باہر گشتا ٹوپ اندھا ہوا تھا۔ اگرچہ تھوڑے پوری آب و تاب سے بن رہے تھے، لیکن اس  
 کے باوجود کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے آنکھیں من من کر دیکھنا چاہی لیکن آنکھیں غائب تھیں  
 اور میں اپنی بینک بھی گھر چھوڑ آیا تھا۔ اللہ! میری آنکھیں کہاں گئیں۔ اور اگر آنکھیں  
 نہیں ہیں تو یہ برقی تھوڑے کچھ کیوں دکھائی دے رہے ہیں۔ میں خوف زدہ ہو کر رو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے  
 یا تو میرے پاؤں نہیں ہیں یا دھڑکی غائب ہو گئی ہے۔ میں نے گھبرا کر ہاتھوں کو چمڑا دیا۔ ہاتھ بھی نہیں تھے۔  
 میں نے سامنے فیکٹری ایریا کی طرف دیکھا۔ پورا ایریا غائب تھا۔ منہ موڑ کر اپنے گھر کی طرف دیکھا  
 گھر بھی غائب! یا اپنی! یہ سب چیزیں کہاں گئیں؟ کیا یہ سب چیزیں مر گئیں؟ کیا میرے ساتھ  
 ہی سب فنا ہو گئے؟ کیا جب ایک انسان متاثر ہو تو اس کے ساتھ ساری کائنات مر جاتی  
 ہے۔ ساری سڑکیں مر جاتی ہیں۔ سارے مکان مر جاتے ہیں۔ سارا ٹریفک مر جاتا ہے؟

”ااااا“ اچانک ایک شہزادہ قہقہہ خانی دیا۔ لیکن اگر میرے کان نہیں ہیں تو کسی کس چیز سے راتوں میں؟ سوچ کیے راتوں اور صبح کیے راتوں؟ حواس غصہ کی یہ شہزادہ بڑی حیرت انگیز تھی۔

مستحق موت؟

میں نے قہقہے لہرایا۔

(اور یہ قوت ناطقہ کہاں سے آگئی؟)

لے گئے ہیں ایک نرم و نازک ہاتھ نے چمچاٹھا لیا اور مجھے لے کر فوار میں اُڑنے لگا۔

میں نے عرض کیا۔

10/2/74

تعارف و تعارف

رسلی اکوازیں خواب آئے۔

[illegible]

Figure 1

22/11/2019

مجلس

”تو میرکون ہوشربا، دُرکا، مالقی، رام پیاری.....“

”میں ان سب کا کچھ ہوں۔ مین ان میں سے کسی کے جوڑ کسی کی آنکھیں کسی کے

اتھ کبھی آئے گی سو..... قید و تہ سے بیکل محبوب، تمہاری تشاؤں کا مکمل ٹکس.....

”تم دنیا میں کیوں نہیں ملیں؟“ میں نے فانی قسم کا ڈرامہ لکھ بول کر دھانک بننے کی کوشش کی۔

”کیونکہ دنیا میں تم صرف میرا خواب دیکھتے تھے اور حقیقت سے گزرتے تھے، مہمان

4. . . . .

میں تقدیرے نامہ ہوا۔

اس سے پوچھا۔

”اب تم مجھے کدھرے جا رہی ہو؟“

”تشنہ تناؤ کی پردوں پر سوار کر کے محبت تیس اڑائے لیے جا رہی ہے اس قوت اعلیٰ کے حضور میں جو تمام تر تشکیلات کی خالق ہے۔“

”میری محبوبہ تو فلا سفر بھی ہے : چٹا مسکرا کر سوچا۔

مجھے اس کا فقرہ یوں لگا جیسے اس نے کسی کتاب میں سے رٹ رکھا ہے  
مجھے شک۔ ہوا کہ میری محبوبہ چور ہے، دوسروں کے فقرے چراتی ہے۔  
یہ سوچ کر مجھے وہ شاعر حضرت نادر دولت آبادی یاد آ گیا جو اپنی غزل  
شاکر ہمیشہ کہتا تھا:

”نما صباں ! یہ تو ارد ہے، سرقہ نہیں ہے دونوں

میں بڑا فرق ہوتا ہے!“

اس کی تمام غزل میں تو ارد کا شکار ہو گئی تھیں۔

نہ جانے عجب بہ نے میرے دل کی بات بھانپ لی یا کیا ہوا کہ اچانک  
اس نے مجھے کے ساتھ اپنا ہاتھ چھوڑ دیا اور میں جیسے بکھر رہا تھا فضا میں جھولنے  
لگا اور پھر جیسے ایک گہرا نیلا بادل میری گردن سے پٹ گیا۔ بالکل ایک رستی  
کی طرح۔ اور مجھے یوں... محسوس ہوا کہ وہ مجھے یوں اوپر ہی اوپر کھینچنے لگا ہے،  
جیسے کنویں سے پانی کی گڑوی کھینچتے ہیں۔

میں پھینا۔

”ابے ظالم! میرا دم گھٹ جائے گا۔“

بادل نے بڑے خاعرانہ لہجے میں کہا:

”تکراؤ نہیں۔“

دم ہوا کی موت ہے دم کے سوا کچھ بھی نہیں

مصرع سن کر میں نے داد کے بے تالی بھائی چاہی۔ لیکن جیسے قریب

کے کسی نے کہا

”ہشش! یہاں تصنیع ممنوع ہے، خواہ غواہ اپنی سزا میں کیوں اعزاز کرتے ہو؟“

میں نے آواز کی طرف دیکھا

”آپ کا اسم شریف؟“

”رام پھاری؟“

میں اُسے پہچان گیا۔

ڈرامہ پھاری ہندی اور کالی مرچوں کا تھوک سوداگر تھا اور اُن میں ملاوٹ کیا کرتا تھا، اس کی گردن میں بھی بادل کا رشتہ بندھا تھا، پھر میں نے دو درتک غور سے دیکھا تو بہت سے بادلوں کی بہت سی دہیاں بہت سے انسانوں کے گلے میں بندھی ہوئی تھیں۔

”ہوں! تو سب حضرات انتقال فرما کر جا رہے ہیں۔“

میں نے اُن میں سے کئی لوگوں کو پہچان لیا۔

ہنس دھسور کیل تھا جس کی چار جوان بیٹیاں جہنم نہ ہونے کی وجہ سے کنوار ہی بنی تھیں۔ گورنام ڈرائیور جس نے آٹھ آسنے کی خاطر ایک دوسرے ڈرائیور کے چھسرا لگو نپ دیا تھا۔ میدر بخش کہاڑیا جو گورنمنٹ بورڈیو دو نوں سے دھوکا کیا کرتا تھا۔

کئی انتقال یافتہ حضرات ایسے بھی تھے جنہیں میں پہچان نہ سکا۔ کئی فرانس یا بھانیہ کے اطراف کے مملوک ہوتے تھے، جنہوں نے مجھے دیکھتے ہی نسلِ قادیان سے اپنا منہ موڑ لیا۔

(خدا کے سامنے جا کر ان کی شکایت ضرور کروں گا۔)

کچھ دیر اُڑتے رہنے کے بعد اچانک ایک دھماکا سا ہوا جیسے جہازوں

سراپک ساتھ کسی چھت سے جا کرائے ہوں، اور پھر جیسے ہزاروں سورتوں کی روشنی چاروں طرف پھیل گئی اور ہزاروں ارغنون پھنے لگے اور حمد و ثنا کے ہزاروں گھنٹے گھنٹا اٹھے!

مجھے شک ہوا کہ یہ شاید دنیا کے عظیم ترین طعنہ نگار و فتنہ گر تو نسوی کے استقبال کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ میرا دل فرط مسرت سے دھڑکنے لگا، کیوں کہ خدا کے ساتھ قربت کا لمحہ نزدیک آ رہا تھا۔ میں خدا سے دو چار ڈائریکٹ باتیں کرنا چاہتا تھا اور بالخصوص دنیا کا اڈمیررے کی حقیقی وجہ تفسیر معلوم کرنا چاہتا تھا۔

اُس وقت میں روئی کے ایک بگے بگے کھالے کی طرح اڑ رہا تھا۔ فضا میں ہزاروں گالے میری طرح بگے بگے پھیر رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے بہت سے رفیو جی اپنے گھمراہے لگے ہو کر اپنے کلیم کے فارم دفتروں میں بیٹے گھوم رہے ہوں۔ رفیو جیوں کے ساتھ یوں جھگڑنا مجھے برا لگا۔ کیونکہ اس سے میری انفرادیت خطرے میں پڑ رہی تھی۔ چنانچہ میں نے زور سے پکارا۔

”اے خدا تو کہاں ہے؟“

ہزاروں آوازیں ایک ساتھ گنبد کی آواز کی طرح گونجیں۔

”اے خدا تو کہاں ہے؟“

میں نے کہا۔

”بیٹا فتنہ گر تو نسوی! یہاں تو انفرادیت قائم رکھنا انتہائی مشکل نظر آتا ہے سو رہنما

دوبارہ خدا کو پکارنے کا حوصلہ نہ پڑا۔“

میں نہیں جانتا، میں کتنے ہزار برس اسی طرح خلا میں بھٹتا رہا کیوں کہ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ عالم بالا ایک منٹ ہماری زمین کے سینکڑوں برسوں کے برابر ہے۔ وہاں وقت اتنا دیرسرا چلتا ہے کہ پورا سفید صہ آدھے منٹ میں ختم ہو سکتا ہے وقت کی یہ کاہلی مجھے غلط پسند آئی۔ بہر کیف بالا خسروہ وہاں نہیں آگیا جب ایک فرشتہ نے مجھے اپنی تھنگلیاں پر چڑھایا اور خلا کے بسیط دہالہ کے ایک دروازہ میں داخل کر دیا۔

دروازہ کے اندر ایک میز پر ایک کلرک ایک بہت بڑا رستہ رکھو لے بیٹھا تھا۔  
مجھے دیکھتے ہی بولا۔

”کون ہو کہاں سے آئے ہو؟ اپنا نام اور پتہ لکھو اور“  
میں نے تڑپ کر کہا۔

”کیا مطلب؟ آپ مجھے نہیں جانتے؟ مجھے تو سارا ہندوستان جانتا ہے  
میرا نام فکر تو فوسوی ہے!“

”کون سی مخلوق سے تعلق رکھتے ہو؟“ مجھ سے دوسرا سوال کیا گیا۔

”رائیٹر رائٹر۔ میرا مطلب ہے ادیب ہوں لیکچر، طنز نگار  
کلرک نے سر کھجایا۔ بے چارہ کوئی ان پڑھ ہو گا۔ رائیٹر کے معنی میں نہیں جانتا  
تھا۔ اس کے ساتھ کلرک نے مجھ سے کہا۔

”دیکھ گھبراؤ نہیں۔ اپنا صحیح پتہ لکھو اور تاکہ تمہارے لئے سزا و جزا کا فیصلہ  
کرنا آسان ہو جائے۔“

میں نے جل بھین کر کہا۔ ”تو لکھیے۔ مکان نمبر سی، اکیا ون موٹی شنگ۔ شہر دہلی  
ملک ہندوستان۔“

”یہ ہندوستان کیسے؟ کون سے سارے میں ہے؟“

”آپ ہندوستان کو بھی نہیں جانتے؟ اتنی بڑی عظیم سنسکرتی کا ملک! اور آپ  
پر جھٹتے ہیں۔ ہندوستان کیسے۔ سخت افسوس آتا ہے آپ کی نامکمل معلومات  
پر اور بے صاحب! ہندوستان وہ ہے جہاں کشید کا میلہ لگتا ہے۔ جہاں پیلی کی پروجا  
ہوتی ہے۔ جہاں گائے اور مسجد پر شاد ہوتے ہیں۔

سب کلرک جو فرشتے سے معلوم ہوتے تھے ایک دوسرے کا منہ نکتے لگے۔ جیسے

کہہ رہے ہوں۔

”ہوپ لیس کیس ہے۔“

میرا اپنا گلا بھی فرط غم سے کھرا یا۔ کیونکہ میرا تو خیال تھا کہ میری موت جس پر

سارا ہندوستان آنسو بہا رہا تھا۔ اس کی اطلاع یہاں پہنچ گئی ہوگی۔ لیکن یہاں فکر تو نسوی قوا ایک طرف ہندوستان تک کو کوئی نہیں جانتا تھا اور ادھر ہمارے ہندوستانی تھے کہ دن رات خدا کے گن گاتے تھے۔ چوتنگ خدا کا نام لے کر نقب لگاتے تھے۔ یہاں خدا کے رحمتیں ہندوستان کے چوروں کا خانہ ہی غائب تھا۔

جھلا کر میں نے کلرک سے کہا۔  
 ”دیکھئے صاحب آپ مجھے خدا سے ملا دیجئے۔ وہ مجھے آپ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔“

”دیری سوری!“ ایک فرشتہ نے کہا۔ ”وصالِ خدا صرف تیرا نوے جنم کے بعد ہی ممکن ہے۔ آپ صرف یہ بتا دیجئے کہ آپ کون سے سیارے سے آئے ہیں؟“  
 ”زمین کے سیارے سے۔“

”زمین کا ستیاریہ کہاں واقع ہے؟“  
 فکر تو نسوی۔ دہلی۔ ہندوستان۔۔۔۔ اور اب پر زمین کے سیارے کو بھی نہیں جانتے۔۔۔۔ میں نے طنز آگیا۔

”حضرات! آپ کا جغرافیہ بہت کمزور ہے۔ ارے صاحب زمین وہ سیارہ ہے جو چاند کے قریب واقع ہے۔ چاند یعنی چنڈاں، جہاں ایک بڑھیا بیٹھ کر چرخہ کاٹا کرتی ہے۔ جہاں پچھلے دنوں ہم نے ایک راکٹ بھیجا تھا۔  
 لفظ چرخہ جس پر ہماری پوری تخریب آدھی استوار کی گئی تھی بے کار رہ گیا ایک بوڑھے فرشتے نے ملائمت سے کیا۔“

”دیکھئے، آپ ذرا ہماری میٹری کا احساس کیجئے۔ خدائے بلند ویرن کی کاٹنا بہت وسیع ہے۔ اس میں لاکھوں سیارے، لاکھوں چاند اور لاکھوں سورج ہیں۔ اس لئے ناراض نہ ہو جئے اور ذرا رکئے۔۔۔“

یہ کہاس لئے ایک اور جیٹڑا اٹھایا۔ تھوڑی سی ورق گردانی کی اور آخر ایک ننھے سے خانے پر انگلی رکھ کر بولا۔



”مل گیا! یہ صاحب دراصل زمین کے اس حقربارے سے تشریف لائے ہیں جہاں انسان نامی مخلوق بستے ہے۔“

انسان کے نام پر سب فرشتوں نے منہ بنالیا۔

لہذا اس کیس کو.....“ بوڑھے فرشتے نے بات جاری رکھی۔ ”آپ ہماندہ سیاروں کے سیکشن میں بھیج دیجئے۔“

اور پھر حبیب شفاف سافرشتہ مجھے پیرانی جھنگلیا پر چپکا کر ہماندہ، سیاروں کے سیکشن میں چھوڑ گیا اور میری جان میں جان آئی کہ چونکہ یہاں میرا جانا پہچانا ماحول تھا، وہی خلافت، وہی ظلمت، وہی تنگی، وہی گھٹن جو میری پیاری زمین کے ساتھ مختصر معنی، مجھے یہاں مل گئی اور میری روح موتیے کے پھول کی طرح کھل اٹھی۔ ہماندہ سیاروں کے سیکشن میں ان گنت کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں۔ ٹرانسپورٹ سردس کے فرشتے نے مجھے عین اس کھڑکی کے پاس اتار دیا جس پر لکھا تھا۔

”اہل زمین کا دفتر اعمال!“

دفتر کے باہر انسان اور دوسرے حضرات الارض کا ایک ہجوم تھا، جو مکھیوں کی طرح بھینٹنا رہا تھا۔ کوئی ڈسپلن نہیں تھا، کوئی کیو نہیں تھا۔ ایک بے شکم شور تھا، جیسے ہمارے یہاں کی کچہریوں یا انڈر بوز دفتر کے سامنے نوکری کے خواستہ مندوں کا ہونا ہے۔ اور ایک دوسرے کو دھکے مارا کر آگے بڑھ رہے تھے، ہر شخص سب سے پہلے کھڑکی پر پہنچنے کا خواہش مند تھا۔ کچھ رو رہے تھے کچھ گارہے تھے۔ کچھ ایک دوسرے کو فری اسٹائل مٹکا بازی سے ہولہان کر رہے تھے۔ ان میں مختلف قوموں، ملکوں اور تہذیبوں کے افراد تھے۔ زرد، سرخ سفید اور سیاہ رنگ کے افراد اور وہ بھی ایک دوسرے کی انگلیاں توڑ رہے تھے۔ اور ہر انگلی ٹوٹنے پر اللہ اکبر اور جے شیو شنبھو کی قسم کے خدا پرستانہ نعرے لگاتے تھے اور قومی ترانے گاتے تھے اور فتح کی خوشی میں بندروں کی طرح کودتے تھے۔

کچھ دیر تک تو مجھے اپنی نسل کی مخلوق میں رہ کر قطع آنا رہا۔ لیکن ایک مرتبہ

جب ایک ہاتھ نے مجھے خرا مخرا مجھے سونڈ سے اٹھا کر اچھال پھینکا تو سارا مزا  
بکر کرا ہو گیا۔

میں نے ہاتھ کی جگہ سے کہا۔

”حضرت! یہ غیر مہذبانہ حرکت کس سلسلہ میں ہے؟“

لیکن وہ چونکہ ایک کلاسیکل سنگیت نگار تھے مارے کلاکار کو سونڈ پر اچھالنے  
میں مصروف ہو گیا تھا۔ اس لئے میری بات کا جواب نہ دے سکا اور میں جو انتقال  
کے بعد نہ جانے کیسے کیسے بلند خیالات اور احساسات کے کریں آیا تھا یکدم احساس  
ہو گیا۔ خدا سے ملاقات کی امیدیں تو پہلے ہی خاک میں مل چکی تھیں۔ اور اب اگر  
کوئی احساس باقی رہ گیا تھا تو صرف اپنی بے مائیگی کا، اپنی بے بسی کا اور اس  
قصیدہ کا جو میرے مستقبل کے بارے میں نہ جانے کب ہوئے والا تھا۔

بالآخر ہمت کر کے میں بھی انسان بن گیا۔ دھکم پیل شروع کر دی۔ اور کسی نہ  
کسی طرح کفر کی گے پاس پہنچ گیا۔ اور کلرک فرشتہ کو جو ہمارے سڈرل سیکر ٹر میٹ  
کے کلرک کی طرح بے حد ٹھکانا مذہ اور پریشان خاطر نظر آ رہا تھا اپنا نام اور پتہ بتا کر  
عرض کیا۔

”جناب! براہ کرم ذرا میرے اعمال کی فائل ملاحظہ کیجئے۔ اور بتائیے کہ میری  
آئندہ پوزیشن کیا ہے؟“

کلرک فرشتہ نے بادل تا فرستہ فائل کھولی۔ اسے اٹھا لیا۔ اور ایک پمپلی مسکراہٹ  
کے ساتھ بولا۔

”کیا یہ ٹھیک ہے کہ تمہاری ماں تمہیں سوکھے ہوئے ٹکیٹے ایاں کرکھلا یا کرتی تھی؟“  
”بجا فرماتے ہیں آپ!“

”کیا یہ صحیح ہے کہ تم انسانوں کی اخلاقی غراوٹوں اور مذہبی حرکات سے بہت دکھی  
رہتے تھے؟“

”صحیح ہے جناب!“

”اور کیا یہ بھی صحیح ہے کہ تم نے عمر بھر اپنی تحریروں سے نزع انسانی کی بیہودگی کے لئے کوشش کی۔“

فرشتے نے ایسے ہی متعدد سوالات کئے۔ جن کا جواب مجھے مجبوراً اثبات میں دینا پڑا۔ کیونکہ جھوٹ بولنے پر سزا بڑھ جانے کا خطرہ تھا۔ اگرچہ صرف سچ بولنے کے نقطہ نگاہ سے میں نے فرشتہ مذکور کو یہ بھی بتا دیا کہ میں نے اپنی بے وقوفیوں کے یا عدسہ کی احباب کو چلی گئی بھی سنائیں۔ ایک بار ہیوی کو بھی زد و کوب کیا تھا۔ کئی بار اقتصاد کی تنگ دامنیت کے کارن جھوٹ بھی بولے تھے۔ اور وہ چار مرتبہ کچھ انسانوں سے دھوکا بھی کیا تھا۔

بالآخر قائل پر میرے دستخط کرانے کے بعد فرشتہ کلرک نے کہا۔

”تمہارے بارے میں حکم الہی یہ ہوا ہے کہ تمہیں ایک بار پھر زمینی پردا پس بھیجا جائے۔“

”کس جرم میں؟“

”میں نے پوچھا۔“

”کیونکہ تم ایک بھٹے انسان ہو۔“

”تو کیا بھلا ہونا جرم ہے؟“ میں تلملایا۔ ”میں دوبارہ زمینی پردہ پہن جانا چاہتا ہوں۔“

مجھے جہنم میں بھیج دو۔“

”تم حکم الہی سے مستثنیٰ نہیں کر سکتے۔ زمین کے سوا اسے کوئی دوسری ضرورت نہ“

”میں نہیں جاؤں گا!“

”میں نے پاؤں نیک کر کہا۔“

”تمہیں جانا ہی پڑے گا!“

فرشتہ نے گرج کر کہا۔

”میں نہیں جاؤں گا!“ — ”میں نہیں جاؤں گا!“ — ”میرا بچہ تیز ہو گیا —“

”مجھے خدا سے ملا دو۔ میں خدا سے ڈار کر کٹ بات کروں گا۔ کہاں ہے خدا؟“

میرے اتنا کہتے ہی ایک ساتھ بہت سے قہقہے گونج اٹھے۔ اور پھر۔  
 ”کہاں ہے خدا؟“

”کہاں ہے خدا؟“

کی کرداروں آوازیں کئے لگیں۔ اور پھر سارا ماحول گھومنے لگا۔ ہزاروں گھنٹے  
 ٹٹا ٹٹا اٹھے۔ اور خدا اے عظیم کی حمد و ثناء میں کروڑوں نغمے ایک ساتھ گائے جانے  
 لگے۔ اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے جھپٹ لیا پراکھا کر زور زور سے  
 گھمایا اور پھر اچھال دیا۔ اور میں لڑھکیاں سی کھا کھا کر گرنے لگا۔  
 نیچے۔

اور نیچے۔

اور نیچے۔

اور پھر ایک دم سکون سا چھا گیا۔ ایک عجیب پر اسرار طمانیت سی پھیل گئی  
 ایک خاموشی، شانتی اور تسکین۔ !

جیسے سمندر کی نہر میں کوئی ڈرہ جا کر بیٹھ جائے۔

اور پھر میں نے سنا۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا

”اب خطرہ ٹل گیا ہے۔ مریض نچ جائے گا!“

# خدا کی جنت

اور پھریں ہوا کہ میں جنت کے دروازے پر پہنچ گیا۔

مذہب نے وہ کون تھا، حضور کوئی فرشتہ ہی ہو گا، جس نے مجھے جنت کی طرف لے آیا اور جیسے ہزاروں میل کا سفر ایک ثانیے میں طے کر کے مجھے یہاں چھوڑ گیا وہ اتنی عبادت میں تھا کہ میں اس کا شکر یہ بھی ادا نہیں کر سکا۔

دروازے کے باہر خدا کی دردی پہنے ایک مریں سا فرشتہ اسٹول پر بیٹھا سات بھری بیٹری پی رہا تھا۔ میں نے اپنا شبہ دور کرنے کے لئے اس سے پوچھا "جناب عالی! جہاں میں کھڑا ہوں کیا یہ جنت کا دروازہ ہے؟"

چہرہ اسی فرشتے نے میری طرف دودنی چار قسم کی نگاہ سے دیکھا۔ جیسے کہنا چاہتا ہو، مگر میں بتا دوں تو تم اس اطلاع کے گتے پیسے دو گے! — لیکن میری پیچیدہ حالت دیکھ کر وہ شاید مایوس ہو گیا۔ اور جیسے وہ کوئی ذمے داری لے لے کر تیار نہ ہو، کہنے لگا؟ "کون ہو تم؟"

"فکر تو نسوی ہوں، کیا تم مجھے نہیں جانتے، ادبی رسائل نہیں پڑھا کرتے؟ ادبی رسائل اور فکر تو نسوی شاید اس کے لئے ناقابلِ فہم چیز ہیں، انہیں، ان کے ایک جھٹکے سے جیسے اس نے "ششاپ" کہا اور بولا "ادب شرب کو چھوڑ کام کیا کرتے ہو؟"

پہلے شاعری کرتا تھا، اب ....“

اسے جیسے کلیو (CLEW) ہاتھ آگیا، جھٹ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔  
 ”شاعر ہو؟ تو پھر یہاں کیوں آگئے، یہاں سے بال برابر فاصلے پر جہنم ہے، ابھی شاعر  
 وہاں جاتے ہیں۔“

میں نے توضاحت کرنا ضروری سمجھا۔ ”قبلہ! مگر میں شاعری چھوڑ چکا  
 ہوں۔ اس نے جنت ....“

”کس شاعری کے علاوہ کوئی اور کوالمی؟“

”ایک تشنہ لب بیکاری کو اپنا آخری سگرٹ دے دیا تھا۔ حالانکہ میں اسے  
 خود پینا چاہتا تھا۔“

اس نے ایک اور بیڑی نکال کر سلگائی (مجھے آفر نہیں کی) اور اس سے  
 پہلے کہ کوئی اور امتحانہ سوال کرتا کشاکش سے جنت کے پٹ کھلے اور اندر سے  
 جیسے ہزاروں لاکھوں فرشتے ایک دم پکار اٹھے۔

اور دوسرے لمحے میں جنت کے اندر تھا

حیرت ہوئی کہ خدا کیسی چھوٹی، چھوٹی ڈالٹوں پر جنت عطا کر دیتا ہے، ابھکارا  
 کو سگرٹ دے دو، ننگے کو لنگے، پینا دو، اندھے کو شرک پار کرادو — تو پھر  
 لوگ جنت کے حصول کے لئے بڑے بڑے مندر، مسرائی اور دھرم شائے کیوں بناتے  
 ہیں؟ شاید خدا کو دھوکا دیتے ہیں۔ شاید خدا سے دھوکا کھاتے ہیں۔

جنت میں قدم رکھتے ہی مجھے پہلا خیال یہ آیا کہ یہاں میری مادی اماں  
 ضرور موجود ہوں گی۔ کیونکہ جب اس کا جنازہ اٹھا تھا تو سارے محلے نے دعا  
 مانگی تھی کہ اے خدا! مرحومہ کو جنت میں جگہ دینا — اور کہتے ہیں، خدا رکھے  
 عامہ کا بہت احترام کرتا ہے۔

میرے واسطی پہلو میں دودھ کی ایک نہر بہہ رہی تھی اور ایک شخص جس  
 کی مونچھیں کسی مشہور انجینئر جیسے کی سی تھیں، اس نہر میں پانی کے ٹکڑے ڈال

ربا تھا۔ میں اس کے قریب چلا گیا اور پوچھا: ”کھائی کھانسی؟“ کیا آپ نے اس جنت میں میری دادی پر بھادلیسی گورد کھیلے؟“

اور جیسے نووارد سے کبھی مذاق کرنے کے شوقینا ہوتے ہیں، بولا: ”کوئی پر بھادلیسی؟ یہاں تو ہر تفسیری غوریت کا نام پر بھادلیسی ہے۔“

میں نے دادی کا حلیہ بیان کیا اور کہا: ”مرحومہ کے پاس دنیا میں ایک گائے تھی جس کا دودھ بیچ کر وہ گذر بسر کرتی تھی۔“

”کیا دودھ میں پانی بھی ملائی تھی؟“

”اوں ہوں! وہ ایمان اور عت سے روزی کما تی تھی!“

شخص مذکور نے ایک استہزائیہ تہقہ لگایا: ”ایمان اور عت؟“ قہ قہ قہ تو پھر جنت میں اس کا کیا کام؟ بال برابر قاصطے پر جنم ہے، وہاں جاکر معلوم کرو۔ اور یہ کہہ کر اس جنت مکانی نے زور سے ہانک لگائی۔ دودھ لے لو دودھ لگائے کا خالص دودھ جنت میں شعیث کیا ہوا۔“

کتنا بڑا جھوٹ بول رہا ہے شخص۔ ملاوی ڈودھ کو بھی خالص کہے جا سکتا ہے اس نے میری دادی کے متعلق بھی جھوٹ بولا ہو گا۔ وہ ضرور جنت میں ہو گی۔ میں نے اس کی ہانک سے بچنے کے لئے کانوں میں انگلیاں دے ڈالیں اور تیزی سے آگے چل دیا۔

جنت کا ماحول انتہائی دلغریب حسین تھا۔ ساری جنت ایرکنڈیشنڈ ہو رہی تھی۔ دودھ اور شعیث کی تہریں تو یوں عام تھیں جیسے کسی امیر زاوے کی الماری میں رنگارنگ کی نکئیایاں لٹک رہی ہوں۔ چاروں طرف نرم اور مسرخ پھول کھلے ہوئے تھے۔ جیسے کنواری کنواری حسینا میں، پتوں میں سے پھوٹ پھوٹ کر باہر آگئی ہوں۔ پیڑوں پر طرح طرح کے پھل، دیہاتی دوشیزاؤں کی طرح جیسے جھولا جھولا رہے تھے۔ اور نیلگوں اور سنہری پہاڑیوں کے عقب سے ایک مسخر کن مسخری نغمہ، ہر ابراہیم اور کراہم تھا۔

ماحول کے اس طلسم میں جیسے میں گھلتا جا رہا تھا۔ اگر یہ خراب نہیں تھا تو جنت حق جنت نہیں تھی تو خراب تھا۔ ہر کیفیت وہاں میں سے جو بھی کیفیت تھی اولاد پرنا ورنشیل تھی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا: "بٹیا فکر تو نہی! بڑے خوش نصیب ہو۔ دنیا میں تم ایک سنگترا خریدتے ہوئے گھبراتے تھے کہ تمہارے افلاس اور سنگترے میں عددیوں کا فاصلہ تھا۔ لیکن یہاں صرف بھکاری کو ایک سنگرٹ دینے کے بدلے میں تعین وصول کے باعث مل گئے۔ جنت میں افلاس کی نہیں، کردار کی عزت ہوتی ہے۔"

لیکن جنت میں گھومتے گھومتے مجھے ایک اجنبی ہوا کہ یہاں کی آبادی بہت قلیل یعنی کہیں نہیں کوئی اکا دکا آدمی نظر آجائے۔ نعمتیں زیادہ نکلیں۔ انسان کم تھے۔ دنیا اور جنت میں یہ فرق تھا کہ وہاں نعمتوں کی اور یہاں انسانوں کی فیملی پلاننگ ہو چکی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ جنت میں صرف خوش نصیب آتے ہیں اور خوش نصیبوں کی تعداد ہمیشہ کم ہوتی ہے۔ لیکن میں نے سوچا، اگر یہاں چند بد نصیبوں کو بھی لبا دیا جاتا۔ تو ذرا درائش رہتی۔ درنہ سنان جنت میں کوئی کب رہ سکتا ہے؟

گھومتے گھومتے ایک شجر سایہ دار کے قریب آکر رک گیا۔ جس کے نیچے ایک حسین جمیل سٹول بدن کی نشیمن عورت کھڑی تھی اور ایک بھونڈا سا آدمی اس حسین بدن کو اپنی زبان سے چاٹ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا!

بھائی صاحب! کیا ....

بھائی صاحب نے جیسے سہم کر کہا: "یہ حور میری ہے متھاری نہیں ہے۔"

مگر تم اسے چاٹ کیوں رہے ہو؟

"اس کے بدن سے شہد کی طرح شیریں رس ٹپکتا ہے، اس شہد کو چاٹنے

سے ہی جنت کا مزا آتا ہے۔ کیا متعین ابھی تک کوئی حور لالٹ نہیں کی گئی؟"

میں نے کہا: "نہیں، ابھی خدا سے میری ملاقات نہیں ہوئی، تم یہاں کب سے

آئے ہوئے ہو۔ تمہارا اسم شریف؟"

"میں دھرمی مل ہوں ...."



”میں جس کی رڈ فیکٹری تھی اور جہاں نوجوان کمزاریاں نئی نئی روپے روزانہ پر  
مزدوری کرتی تھیں۔“

”ہاں اور یہی میری خدمت خلق تھی۔ میں ان غریب کمزاریوں کو روزگار  
دلاتا تھا اور ان کے کنارے بدن چائنا کرتا تھا۔“

”ذیل!“ میرے حلق میں یہ لفظ اٹک گیا، اور سوچا، یہ عورت بھی حور نہیں  
ہوگی، اسی رڈ فیکٹری کی ملازمہ ہوگی۔ جسے خدا نے جنت میں بلالیا ہوگا۔ تاکہ  
بدن چٹوانے کے کام آسکے! خدا کو جنت کے لئے بھی دنیا ہی سے حوریں میسر  
کرتا پڑتی ہیں۔ میں نے دل پر جبر کر کے شخص مذکور سے پوچھا، ”خدا کے دو جمال  
کا دفتر کیا ہے؟ جہاں میں اپنی آمد کی رپٹ کر سکوں۔“  
”میں نہیں جانتا،“ وہ شخص رکھائی سے بولا۔

ننگی حسینہ نے شاید کچھ بتانے کے لئے اپنا منہ کھولا، لیکن اس شخص نے  
جوت اپنا منہ اس کے ہوشوں پر رکھ دیا اور شہید چائے لگا۔ شہید ٹپکاتے  
برنس سرماہ بھر کر رہ گئے۔

جنت کے تغارے دیکھ دیکھ کر کبھی یقین آتا ہے جنت ہے، کبھی شک  
ہوتا ہے جہنم ہے، یقین اور عدم یقین کی اس کیفیت نے مجھے نڈھال کر دیا۔  
ایک حور ایک تالاب میں نہاتے ہوئے کنارے پر کھڑے ایک بھینے کو جلتنگ بنا رہی  
تھی۔ ایک درخت پر بہت سے کرنسی نوٹ اُگے ہوئے تھے۔ بھین کچھ آدمی توڑتے  
اور حلق میں نگل جاتے۔ ایک چھوٹی سی سبز بھاڑی پر ایک سرخ و سپید بچہ بیٹھا تھا۔  
دوسری کے ایک مٹ میں کھجوریں ڈیرڈیر کر کھا رہا تھا۔

اور ان کی گٹھلیاں نیچے پھینک رہا تھا۔ نیچے اپنے منہ کھولے  
کچھ تالواں اور لاغری بچے کھڑے تھے۔ جب بھی کوئی انگٹھل کسی بچے کے منہ میں آگرتی، وہ  
نفرہ لگاتا، ”انقلاب زندہ باد“ — اور باقی بچے نہایت نحیف آواز میں بہتے، ”ہمارے

لے بھی کچھ انقلاب زندہ باد!

میں نے ایک نا توں بچے سے پوچھا۔ ”برخوردار جنت میں آکر بھی گٹھلیاں کھا رہے ہو، اور بھلی بھوڑ کیوں نہیں کھاتے؟“

وہ بچہ حیرت سے میرا منہ تکتے لگا اور ایک دوسرے بچے سے بولا۔

”ذرا متناہ آدمی کیا کہتا ہے۔ اس کی بولی میری سمجھ میں نہیں آتی۔“

”کوئی مشرک ہو گا۔“ دوسرا بچہ بولا۔

”جنت کی بولی نہیں جانتا۔“ بتیرا بچہ کہنے لگا۔

”تو پھر جنت میں کیسے آگیا؟“ چوتھے نے فرمایا۔

اور پھر بھی بچے ایک ساتھ محمد پر سننے لگے۔

ہاں میں کیسے آگیا؟ کیسے؟ — معلوم بچوں کا یہ سوال ایک گٹھلی بن

کر میرے حلق میں پھنس گیا، اور میں ڈر گیا مجھے سچ مچ جنت کی زبان سیکھنی چاہیے

اگر مجھے جنت میں رہنا ہے تو مجھے جنت کی ساری آنکھیں چاہئیں، جنت کے سے

کان، جنت کی ساری سوچ۔ جنت میں آکر اصلی فکر تو تسوی کو مرنے جانا ہو گا اور

جنت مکان فکر تو تسوی کو زندہ کرنا ہو گا۔

پریشانی اور سراسیمگی میں ایک دم میری چیخ نکل گئی: ”اے خدا! اے

خدا! تو کہاں ہے؟“

پھر وہی ڈراؤنی خاموشی چھا گئی۔ برے بچے ہو فکر تو تسوی! یہ جنت

ہے یا گنبد! یہاں تو ہر چیخ کا ترجمہ چیخ میں کیا جاتا ہے۔ ہر فریاد کا مذاق فریاد میں

اڑایا جاتا ہے۔ کسی نہ کسی طرح یہاں سے نکلنا چاہیے، تم یہاں رہنے کے اہل

نہیں ہو۔

میں گھبراہٹ میں ایک طرف کو بھاگا، لیکن، ایک عجیب نظارے نے

میرے پاؤں روک لئے۔ — پھولوں کے ایک دم و تازگ بستر پہ ایک بوڑھا آدمی

دراڑ تھا، اس کے چاروں طرف انواع و اقسام کے کھانے اور پھلوں کا دسترخوان

بچھا ہوا تھا جنہیں کتے اور گیدڑا اور چوہے فوش فرما رہے تھے۔ مجھے گھن آگئی۔  
 لیکن گھن کے باوجود جیتو مجھے اس بوڑھے کے پاس لے گئی اور میں نے کہا  
 ”السلام علیکم“

اب اسے گھن آگئی منہ پھیر کر بولا: ”میں اسلام کا دشمن ہوں، اس لئے گڈ  
 ایرنگ کہو“

میں نے فوراً اپنی مذہبی اصلاح کر ڈالی اور انگریزی میں پوچھا: ”ویل!  
 آپ خود کھانا کیوں تناول نہیں فرماتا؟“  
 ”میں جانوروں سے پیار کرتا ہوں۔“  
 ”انسانوں سے نہیں کرتے؟“

شاید وہ خوش نہیں ہوا، اس نے ایک کتے کی طرف اشارہ کیا اور اشارہ  
 پا کر وہ قہار کتا مجھ پر بھونکنے لگا۔ کتے سے شہ پاکر ایک چوہے نے میرے پاؤں پر کاٹ  
 لیا اور اس سے پہلے کہ کوئی گیدڑ مجھ پر حملہ کرنا۔ میں بگ بٹ بھاگ گیا۔ اور جانوروں  
 کے قہقہے دہرائے میرا بچھا کرتے رہے۔ یہ قہقہے مجھے مانوس معلوم ہوئے۔ دنیا میں  
 ایسے قہقہوں کے کئی ٹیپ ریکارڈ بھرے جا چکے تھے اور ریڈیو اسٹیشنوں سے  
 عام مشائے جلتے تھے۔

بھاگتے بھاگتے یوں لگا کہ جیسے ایک شفقت بھرا مہربان ہاتھ میرے کندھے  
 پر آ پڑا ہے۔ میں نے رک کر دیکھا ایک حسین و جمیل نورانی چہرہ میرے سامنے تھا۔ میرے منہ  
 سے بے اختیار نکلا: ”مجھ پر اس نے کتے چھوڑ دیے۔ اس نے غلط سمجھا میرا کوئی قصور  
 نہیں حضور!“

نورانی چہرہ مسکرایا: ”غلط تم سمجھ۔ یہ بڑھا اپنی دولت کو اپنے احباب  
 اور مصاحبوں میں تقسیم کرتا تھا۔ دولت کی اس تقسیم پر خدا اس سے خوش ہو گیا  
 اور چند روٹے کے لیے اسے جنت عطا کر دی۔“

میں نے کہا: ”یہ کیسا خدا ہے؟ جو دولت کی منصفانہ تقسیم کے اصول ہی نہیں جانتا۔“ میں نے احتجاج کیا۔ جنت میں آنے کے بعد خدا کا خوف میرے دل سے نکل گیا تھا۔

نورانی ہاتھ میرے کندھے تقب تھپانے لگا۔ فکر و تسوی صاحب! خدا کی عظیم حکمت کو سمجھو کہ اس نے بڑھے کو جنت تو عطا کر دی، مگر بھوک چھین لی تم نے دیکھا نہیں نعمتوں کا ڈھیر اس کے سامنے تھا۔ مگر عامۃ الناس اسے گھٹا رہے تھے اور وہ خود کھانے سے محروم تھا۔ بھوک کا چھین جانا قہر الہی سے کم نہیں ہوتا۔

مگر فرشتے کا یہ فلسفہ مجھے مبہم نہ ہو سکا۔ یہ جنت کی فلاسفی تھی اس لئے میں خاموش ہو گیا۔ اور موضوع بدلنے کی خاطر پوچھا: ”اے مہربان! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ میں جنت میں ہوں یا جہنم میں؟“  
 ”ابھی بتانا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی دائیں انگلی سے خلا میں ایک گول دائرہ سا بنایا، اور پھر جیسے دور ہزاروں میلوں سے آواز آئی، اس دائرے میں داخل ہو کر سمارے پاس آ جاؤ۔  
 کیا یہ خدا کی آواز تھی؟

میں خوش ہو کر ہلکے حبابارے کی طرح دائرے میں داخل ہو گیا۔ اور پھر یوں لگا۔ جیسے نرم دناؤں کا ہوا کے دشال سمندر میں تیرنا جا رہا ہوں، میں کہاں جا رہا ہوں وہ فرشتہ کون تھا؟ دائرہ کیا تھا، وہ جنت کہاں گئی؟ کیا سچ میں خدا کے حضور میں جا رہا ہوں۔ کیا وہ بلائے والی آواز کوئی دھوکا تو نہیں تھی؟ میری منزل کہاں ہے؟ جنت یا جہنم؟ یا یوں ہی صدیوں تک، اقرنوں تک اس سمندر میں تیرتے رہنا۔

اپنے ہی سوالوں کے پیچوم سے میں گھبرا گیا۔ اور ایک کرناک چیخ نکلی: ”اے حضور راہ! اے حضور راہ! میں کہاں ہوں؟“

جواب میں میرے پاؤں کے تلوؤں سے جیسے ایک قہقہہ سا نکلا اور یہ قہقہہ نیچے اترتا چلا گیا اور قہقہے کے ساتھ ہی میں اتر گیا یہاں تک کہ میرے پاؤں ریشم ایسی مٹی سے جا لگے۔ اس نرم مٹی کے لمس سے میرا تناؤ ایک دم ختم ہو گیا۔ میری آنکھیں کھل گئیں۔ اور میں نے دیکھا کہ ایک درخت کے سامنے کھڑا ہوں۔ جو بیر بہتی ہوئی مٹی کی طرح لال بھبھوکا پھلوں سے لدا ہوا ہے۔ اور اس کے نیچے ایک عورت . . . . .

اورانی، گاڈ! یہ تو وہی عورت ہے جس کے خواب جنم جنانتر سے دیکھتا چلا آ رہے ہوں، بالکل وہی سراپا جس کا میں ہی خالق تھا جس کا ایک ایک انگ میں نے ہی تراشا تھا۔ نسائی حسن کے جس روپ کو خدا نے اودھورا چھوڑا دیا تھا اسے میں نے ہی مکمل کیا تھا۔ اور میں اس مکمل روپ کو تخیل کی مادی سے نکال کر حقیقت بنانے کے لئے صدیوں سے ٹھسکتا پھرتا تھا۔ اور آج وہ مل گئی تھی بالکل وہی میرے سامنے۔ کاپنج کی طرح بلوری چتون کا لباس پہنے میرے سامنے کھڑی تھی۔

میرا دل ایک دم اچھل کر حلق تک آ گیا۔

"یہی مختاری جنت ہے بیٹ جاؤ۔" پیر پرے ایک آواز آئی۔

میں نے پیر کے اوپر نگاہ ڈالی ایک قوس قزح رنگ کا نہایت ہی خوبصورت ناگ اپنی زبان باہر نکالے عجب سے مخاطب تھا اور اس کے ساتھ ہی اس نے ایک لال بھبھوکا پھل توڑ کر نیچے پھینک دیا۔

"تم کون ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں خدا ہوں۔"

خدا؟۔ میرا سر غرور خدا کے سامنے جھک گیا۔ "مگر اے خدا! تیری شکل سانپ کی سی کیوں ہے؟"

"کیونکہ میں شیطان بھی ہوں۔"

شیطان؟ بڑا کنفیوژن تھا۔ یہ کیا خدا ہے جو شیطان بھی ہے؟ یہ کیا شیطان ہے جو خدا بھی ہے۔ میرا دماغ چکر لے لگا۔ جنت اور میرے درمیان صرف ایک پھل کا فاصلہ تھا۔ میں کروں؟ کس کو خضر راہ تباؤں ہر سٹے بڑی گنجشک ہو رہی تھی۔

بے تابیہ میں اس سراپا محبوبہ کی طرف بڑھا۔ "ڈارلنگ! مجبور بھی بے تابیہ میری طرف بڑھی "ڈیر!" "ہم آغوشی ممنوع ہے، بے وقوف!" پٹر پٹر سے آواز آئی۔ اچانک لال بھبھوکا پھل زمین سے اڑ پڑا تھا۔ اور ہم دونوں کے ہونٹوں کے درمیان آکر رک گیا۔ اب دو پیا سے ہونٹوں کے درمیان صرف یہی پھل حائل تھا۔

"اس پھل کو کھا جاؤ!"

"اس پھل کو مدت کھاؤ!"

"اس پھل کو کھا جاؤ!"

"اس پھل کو مدت کھاؤ!"

دونوں معنی اور مثبت آواز میں مسلسل آئے لگیں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی۔ ایک دوسرے سے لڑتی ہوئی، بالکل دو متضاد جھبکڑوں کی طرح دو مہیب پہاڑوں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکرائے لگیں۔ اہ جوں جوں یہ جھبکڑا تیز ہوتا گیا۔ میں اور میری محبوبہ مارے خوف کے ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے اور قریب اور قریب اور پھر یوں لگا۔ جیسے ہمارے درمیان اس پھل کا فاصلہ بھی مدت گیا۔ وہ پھل بھی جیسے شیریں دس بن کر ہم دونوں کے ہونٹوں میں گھل گیا۔ اور پھر ہونٹ مل گئے۔ لال بھبھوکا ہونٹ گرم گرم، پیار سے بیکے ہونٹ اور ہم دونوں کے بدن لال بھبھوکا ہو گئے۔ اور عجب پر اسرار نشیلا بہروں کے جھولوں میں جھولنے لگے۔ اور دور سے۔ جیسے کسی بے بس خدا کی آواز

آئی رہی۔ یہ گناہ گار ہیں۔ انہیں جنت سے نکال دو۔“

اور بے بس خدا کی اسی آواز میں گھل مل کر آئی ہوئی بے بس شیطان کی آواز چنچتی رہی۔ ”ہاں انہوں نے ثواب کما لیا ہے، انہیں جنت سے نکال دو۔“ اور پھر خدا اور شیطان جیسے ایک دوسرے میں گھومتے ہوئے ایک دوسرے کا تقاب کر رہے تھے اور پھر ہر شے گھومنے لگی، پٹر، نہر، جنت — اور ہزاروں لاکھوں گھنٹے ایک دم بج اٹھے، اور جھکڑ چلتا رہا اور ہم جھٹکے کھلتے رہے۔ پھر اشلے، انگارے ہمارے ارد گرد بھیا تک رقص کرنے لگے۔ لیکن اللہ میں سے کوئی چیز ہم دونوں کو جدا نہ کر سکی۔ اور پھر جیسے کوئی نڈھال ہو جاوے ایسے ہی ہم ایک دھماکے ساتھ جیسے کروڑوں میل کی بلندی سے نیچے آگرے — اور پھر ایک دم پیارا پیارا سکون سا چھا گیا۔

اور ہم نے اپنی سہمی ہوئی آنکھیں کھول دیں اور کیا دیکھا کہ میں پہر جنت کے دروازے پر کھڑا ہوں۔ اور وہی فرشتہ اسٹولی پر بیٹھا بیڑی پی رہا ہے۔ اس نے میری طرف مسکرا کے دیکھا اور بولا: ”جنت سے ہوائے؟ کیسی لگی؟“ میں نے کہا: ”اچھی ہے۔ بالکل ہمارا دنیا ایسی — عشق وہاں بھی سبج

ممنوعہ ہے اور یہاں بھی۔“

وہ بڑے فخر سے بولا: ”میں نے تمہیں کہا تھا؟ جنت اور جہنم میں صُرتِ بالِ برابر کا فرق ہوتا ہے۔“

# قبر سے واپسی

اور پھر مرنے کے ایک ہفتہ بعد قبر میں میری آنکھ کھل گئی۔

مگر یہ ہوا کیسے؟ میرا تو باقاعدہ انتقال ہو گیا تھا۔ اگر انتقال نہیں ہوا تھا تو میری قبر کیسے بن گئی؟ ہو سکتا ہے کہ قبر کسی اور کے لئے کھودی گئی ہو اور موقع پا کر دفن مجھے کر دیا گیا ہو۔ مگر نہیں، سماج ابھی اتنا کرپٹ نہیں ہوا کہ دوسروں کی قبر پر قبضہ کر کے کے لئے خود لاش بن کر لیٹ جائے۔

تو کیا یہ ڈاکٹر کی غلطی تھی؟ مگر ڈاکٹر تو بڑا کوالیفائیڈ تھا۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے جتنے زندوں کو قبرستان پہنچایا تھا، ان میں سے ایک بھی زندہ ہو کر نہیں لوٹا تھا۔ میں بڑا پریشان ہوا۔ کس سے نقصدین کرائی جائے کہ میں مرجھا ہوں یا نہیں؟ چنانچہ میں نے قبر میں لیٹے لیٹے آزادی: "کوئی ہے؟"

جواب میں جیسے گھنڈ کی سی صدا آئی: "کوئی ہے؟"

میں نے پوچھا: "تم کون ہو؟ ڈاکٹر ڈنگا سنگھ ہو؟"

جواب آیا: "نہیں، میں ٹھکر تو نسوی ہوں۔"

تھینک گاڈ! میں نے سوچا، اپنی ہی جان پہچان کا بندہ مل گیا۔ یہ میرے ساتھ ہلک میل نہیں کرے گا چنانچہ میں نے پوچھا: "تم کہاں تملہ؟"

"میں تملہ سے اندر ہوں۔"



”اندرونی؟ مگر تم تو باہر نکل گئے تھے! انتقال کر گئے تھے! لوٹ کیوں آئے؟“  
جواب میں کچھ سسکیاں سی مشائی دیں۔ جیسے کوئی نادام ہو، بے حد بچھتا رہا  
ہو۔ جیسے کوئی بچہ گھر سے جھگڑ کر نکل جائے اور دن بھر بھوکا پیاسا رہنے کے  
بعد گھر لوٹ آئے اور دروازے سے لگ کر سسکیاں بھرنے لگے۔  
میں نے پوچھا ”رو کیوں رہے ہو فکر تو نسوی؟ میں پوچھ رہا ہوں انتقال  
کے بعد لوٹ کیوں آئے؟“

وہ بولا ”در اصل غلط فہمی سی ہو گئی تھی۔ یعنی انتقال میرا نہیں  
ہوا تھا، تنہا رہا ہوا تھا۔ میں تو تنہا سی روح تھی۔ تنہا رہے جسم سے نجات پا کر  
بڑی خوشی ہوئی تھی کہ چلو اس بے ہودہ انسان سے ہٹ چھوٹا۔ اب کسی معقول  
جسم میں جا کر کچھ دن عیش کروں گی۔ چنانچہ مفتہ بھرتنگ، مختلف جسموں کے دروازے  
کھٹ کھٹاتی پھری۔ ایک بادشاہ کے گھر گئی، ایک رئیس کے گھر، ایک نواب  
کے یہاں، ایک اسمگلر کے دروازے پر۔۔۔ یہاں تک ایک مسخ کے مہنت  
کے یہاں بھی گئی مگر کسی نے بھی دروازہ نہیں کھولا سب نے جواب دیا ”گو  
بیگ! ہم یہ بلا اپنے گلے نہیں منڈھیں گے جہنم میں جاؤ،“  
میں سنس دیا۔ ”تو حلی جانیں جہنم میں۔“

وہ بھی سنس دی ”آؤ گئی کہوں جہنم میں۔ فکر تو نسوی اور جہنم دونوں ایک  
دوسرے کا ترجمہ ہی تو ہیں۔“

”کتنا غلط ترجمہ ہے!“ میں نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا ”کاش! اس جسم  
کا دروازہ بھی تم پر بند رہتا۔“

”کیسے بند رہتا؟ تم تو اپنے تھے، غیر مفقودے تھے! چلو نکلو اس قبر  
سے باہر چلیں۔“

ادرا میں اپنی، گھسی پٹی روح کے ساتھ قبر سے باہر نکل آیا۔ قبر کی مٹی ابھی  
کچی تھی۔ پختہ نہیں کی گئی تھی۔ شاید میرے رشتہ دار اور مداح پختہ قبر کے لئے بھی

چند فراہم کرنے میں مصروف ہوں گے۔ جیسے ہی میں نے قبر سے سر باہر نکالا، دو آدمی جو شاید میری قبر کی مٹی گھوڑ رہے تھے، مجھے دیکھتے ہی دم دبا کر بھاگے۔ میں نے پیچھے سے آواز دی "تم کون ہو بھائیو! میری قبر پر دیا جلائے آئے تھے۔ یا میرا کفن چرائے؟ اور اب دوبارہ بھی آؤ گے یا یہ تمہارا آخری وزٹ تھا؟"

مگر میری آواز پر ان کی رفتار اور بھی تیز ہو گئی۔ اتنی تیز کہ ان میں سے ایک تو جھاڑی میں الجھ گیا، اور جھاڑی سمیت ہی بھاگتا چلا گیا، اور جیسے دل ہی دل میں کہتا گیا "واہ فکر تو نسوی! ہمیں تم سے ایسی توقع نہیں تھی، بریکار میں ہمارا قیمتی وقت ضائع کر دیا۔ اتنے وقت میں تو ہم کسی کے کھیت سے گئے تو ڈیلیتے یا خدا کی عبادت کر لیتے۔"

مجھے ان کی مایوسی پر واقعی صدمہ ہوا کہ میں زندگی میں تو کسی کے کام نہیں آسکا، مرنے کے بعد بھی کسی کے کام نہ آیا۔ اگر وہ کفن چور تھے تو کم از کم میرا چند گز کفن ہی حاصل کر لیتے۔ اور اگر دیا جلائے جائے تھے تو خدا ان کے کچھ گناہ ہیں بخش دیتا۔ میری بدولت انھیں کچھ تو مل جاتا۔ مگر آہ! یہاں بھی انھیں فکر تو نسوی کے سوا کچھ نہیں ملا۔

میں نے دیکھا کہ میری قبر کے باہر ایک تختی لگی ہوئی تھی، کچی قبر کی طرح یہ ایک کچی سی تختی تھی جس پر کچی سیاہی سے تحریر تھا۔

یہاں طنز نگار فکر تو نسوی ابدی نیند سو رہا ہے۔ وہ مر گیا، لیکن

اپنی چھوڑی ہوئی جہانم توں کے باعث ہمیشہ لافانی رہے گا۔

تاریخ پیدائش: جس دن قبصر جرمنی مرا تھا۔

تاریخ وفات: جس دن کوئی بھی نہیں مرا۔ سو فکر تو نسوی کے۔

تختی پڑھ کر مجھے یاد آیا کہ یہ سب فقرے میرے ہی ایک مضمون سے چرائے گئے ہیں۔ مجھے اپنے مباحول اور رشتے داروں کے ذہنی انفلاس پر بڑا فحش ہوا کہ وہ میری موت پر وہ اور کھیل فقرے بھی نہیں لکھ سکتے تھے تو تختی کے نیچے

کم از کم میرے معنوں کا حوالہ دے دیجیے۔

جب میں قبر سے باہر نکلا تو کھلی فضا اور ٹھنڈی ہوائ تھی جس میں قریب کی ریڈیو فیکٹری کا کڑوا کیلا دھواں ملا ہوا تھا۔ ریڈیو فیکٹری ابھی حال ہی میں سیٹھ جھنگن لال نے تعمیر کی تھی۔ قبرستان کے قریب اسے فیکٹری کی اجازت کیجے مل گئی۔ یہ میں نہیں جانتا۔ لیکن اتنے عجیب غریب معلوم ہوا تھا کہ سیٹھ جھنگن لال اب بھی گورنمنٹ کے ساتھ خط و کتابت کر رہا تھا کہ اس قبرستان کو یہاں سے ہٹا کر بادی سے دور دیکھا جائے اور یہ قبرستان مجھے الٹ کر دیا جائے۔ تاکہ میں فیکٹری کو پیلا کر ملک اور قوم کے لئے زیادہ سے زیادہ ریڈ پیدا کر سکوں۔

میں نے سنا تھا کہ لاشیں مٹرائیڈ پیدا کرتی ہیں۔ مگر یہاں لاشوں کے بجائے ریڈ مٹرائیڈ پیدا کر رہی تھی۔

اپنے کفن کو تہ بند کی طرح جسم پر پیٹے ہوئے میں نے شہر جانے کی ٹھانی اور گرد کی قبروں میں پڑے ہوئے مردوں پر حسرت کی ایک نگاہ ڈال اور ان سے کہا۔

اب تو جاتے ہیں مے کد سے میٹر پور میں گئے۔ اگر خدا لایا۔  
شہر کے بڑے گیٹ کے باہر ایک شال پر آج کا اخبار دیکھا، خرید نہیں سکا۔  
کیوں کہ پیسے ہی نہیں تھے۔ اخبار میں وہی پرانی خبر تھی۔ گھروں پر ہڑتالیں  
بھڑمی چھینو اندوہن، کیمرے ڈانس کے اشتہار۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ اخبار پڑھ  
کر یوں لگا جیسے باسی روٹی کھا رہا ہوں۔ اچانک ایک اخبار پر نظر پڑی جو میرے  
ایک چوتھی دوست جناب کجور اند کی طرف سے شائع کیا گیا تھا۔ لکھا تھا۔

فکر تو نسوی کا انتقال۔ پشپا گوئی پر نکلے  
مشہور جیوتشی آچار یہ جناب کجور اند جی نے دو برس پہلے طے

فکر تو نسوی کی موت کی پیش گوئی کی معنی کو آپ باون سال اور ڈیڑھ گھنٹے کے بعد اپنے بال بچوں اور نرضن خواہموں کو رونا دھوتا چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ یہ پیش گوئی منٹ اور سکند کی حد تک صحیح نکلی۔ لہذا اپنے مستقبل کے حالات جاننے کے لئے جیوشن کھجور رائند کی خدمات حاصل کیجئے۔

استخار پڑھ کر میں اداس ہو گیا۔ میرے زندہ سلامت لوٹ آئے پڑ چار کھجور رائند کے بزنس کو شدید دھکا لگے گا۔ کیا میں دنیا کا بزنس تباہ کرنے کے لئے واپس آیا ہوں؟ میں کھجور رائند سے مل کر اسے مشورہ دوں گا کہ تم ایک خنجر اٹھا کر مجھے دوبارہ مار دو۔

میں نے ایک اسکوٹر رکشا والے سے کہا گل مہر پارک چلو گے؟ ہمارے دہلی شہر میں یہ رواج تھا کہ اگر اسکوٹر رکشا والے سے چاندنی چوک چلنے کے لئے کہا جائے تو جواب دے گا کہ میں تو انڈیا گیٹ جاؤں گا۔ اور اگر انڈیا گیٹ چلنے کے لئے کہا جائے تو کہے گا کہ شاہدرہ چلنا ہے تو بے چلوں گا۔ مگر اس اسکوٹر والے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ شکل باندھ کر مجھے گھورنے لگا۔ میرے بدن پر سستا سارنشی کفن بندھا دیکھ کر بولا۔ ”آپ کون ہیں یہ مردے کا کفن کیوں باندھ رکھا ہے؟“

میں نے کہا ”میں فکر تو نسوی ہوں۔ یہ کفن میرا اپنا ہے۔ چرایا ہوا نہیں ہے۔“ ”فکر تو نسوی ہو؟“ اسکوٹر ڈرائیور گہرا اپنی سیٹ سے اچھلا۔ ”مگر وہ تو انتقال کر گیا ہے۔ اور تم؟“ یہ کہتے کہتے وہ اسکوٹر چھوڑ کر تیزی سے بھاگ گیا۔ شاید وہ مجھے بھوت سمجھ کر بھاگا تھا۔ میری حالت بھی کسی بھوت سے مختلف نہیں تھی بے سنگ جیسی ہوئی ڈاڑھی، سر کی بجائے بدن پر کفن، بھوک پیاس سے بڑیاں باہر ادا نکلیں اور جسم پر جگہ جگہ مٹی لٹری ہوئی اور پاؤں سے بھی لٹکا دھرت ہے کہ وہ من کرتے وقت مردے کو جوتا کیوں نہیں پہنایا جاتا؟

تھکن، بھوک، لڑچکی اور اداسی — جو عام ہندوستانی کے نصیب

میں ہے، میں بھی ان کا غمخوار بنا ہوا تھا۔ اب میری پوزیشن بے حد عبرت ناک تھی نہ میں اپنے گھر جا سکتا تھا۔ نہ واپس قبرستان جا سکتا تھا۔ سگریٹ پینے کی خواہش تیزی سے اٹھی مگر جیب میں ایک پیسہ نہیں تھا، بلکہ سرے سے جیب ہی نہیں تھی پہلے اپنے آپ کو فکر تو نسوی کہہ کر کسی بھی دکان دار سے سگریٹ ادھار لے سکتا تھا۔ مگر اب؟ حالانکہ میں سو فی صدی وہی فکر تو نسوی ہوں۔ لیکن مجھے کوئی سگریٹ تک ادھار نہیں دے گا۔ مرنے کے بعد فکر تو نسوی اپنا اعتماد اپنی ساکھ گھر چکا تھا۔ آہ! صرت سات دن میں فکر تو نسوی کیا سے کیا ہو گیا تھا۔

نفکا مارا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میں قریبی ٹکیو نیٹ ہال کی سیڑھیوں پر جا بیٹھا سیڑھیوں کے اوپر کپڑے کا ایک بڑا سا نیلے رنگ کا مائل لگا ہوا تھا۔

طنز نگار فکر تو نسوی کی یاد میں ماتمی جلسہ۔

رائٹرز اینڈ جرنلسٹ ایسوسی ایشن کی طرف سے

مارچ ۱۶ کو میرے دل میں ہلکے سی اٹھی۔ جی چاہا کہ عورت کے بعد عورت کا کفن پہنائے۔ فالے احباب سے ملوں اور ان کے گلے سے لپٹ لپٹ کر روؤں اور کہوں،

”یارو! میری جدائی میں ٹھنڈی آہیں منت بہرہ میں لوٹ آیا ہوں۔“

میں بیونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا ہال کے اندر داخل ہوا اور احساس کمتری کے مارے سب سے کچھلی بیچ پر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ سارے ماحول پر دھواں اور غم کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ اس بیچ کے سیاہ پردے کے نیچے سے ایک ماتمی دھن نک رہی تھی۔ کتنی لطیف دھن تھی۔ ماتم میں بھی کتنی گہرائی اور کتنا وقار بہرتا ہے جی چاہا کہ یہ دھن بھنی رہے۔ بجتی رہے اور میں مر رہوں۔ مر رہوں۔

اتنے میں جلے کا سگریٹ میز پر آیا۔ میں اسے جانتا تھا۔ اس نے ایک ادبی میگزین میں ایک مرثیہ لکھا تھا، ”فکر تو نسوی کے طنز کی موت اسی دن واقع ہو گئی تھی جس دن اس نے طنز پر مضامین لکھنے شروع کئے تھے۔“ اور میں نے یہ

فقرو پر ہر کر کہا تھا: "اگر یہ فقر و دل کش نہ ہوتا تو میں اس حاسد شخص نے منہ پر ہاتھ باندھ دیتا۔" اب سکرٹری نے زندہ ہوئے گلے سے کہنا شروع کیا: "دوستو! مقامِ تاسف ہے کہ آج ہمارا محبوب و مقبول طنز نگار فکر تو نسوی ہماری محفل میں موجود نہیں ہے۔ وہ ہمارے طنز پر ادب کو سونپا کر کے چلا گیا۔"

نام گسارا حباب نے دفور جذبات سے داد کی تالیاں بجائیں۔ ایک تالی میں نے بھی بجائی اور طنز پر ادب کو سونپا کر لے گئے غم میں شریک ہوا۔

اگلی نشستوں پر دو صاحب بیٹھے کھسکھس کر رہ گئے۔ ایک نے کہا "حرام زادہ بچو اس کر رہا ہے: فکر تو نسوی سے تو یہ انتہائی نفرت کرتا تھا۔" دوسرا بولا "اور میں نے سنا ہے کہ اس نے مرحوم کی بیوہ کی اولاد کے لئے پانچ ہزار روپے چندہ اکٹھا کیا ہے جس میں آدھا ہڑپ کر گیا ہے۔"

"ہی ہی ہی! کیوں نہ کرنا؟ یہ خود بھی تو ایک بیوہ ہے۔"

اس کے بعد صدر جلسہ نے مرحوم فکر تو نسوی کی قد آدم تصویر کو ایک پھول والا پنٹائی، پھول والا کی خوشبو اور ملائمٹ مجھے اپنے بدن میں محسوس ہونے لگی بعض اوقات ٹرسٹیڈی بھی کتنی ملائم اور مسطر ہوتی ہے! میں جیسے سستی میں ہراسا گیا صدر جلسہ نے پھول والا پنٹائی وقت گلوگیر جے میں ایک شعر پڑھا،

سب کہاں کچھ لالہ لالہ گل میں نمایاں ہو گئی

حاکم میں کیا صورتیں ہونگی کہ نہاں ہو گئیں

حاضرین میں سے ایک ٹینگ ٹرک قسم کا ادیب بے اختیار پکارا تھا: "ہائے! ظالم نے کتنا صحیح شعر کہتے غلط موقع پر پڑھا ہے۔"

میرے ایک انتہائی مداح دوست نے اسے گردن سے پکڑا اور کٹاں مٹھاں باہر جا کر بھینک آیا۔

اس کے بعد صدر جلسہ نے نام گسارا حباب کو تقریریں کرنے کی اجازت دی۔ اور ہر ایک نے ثابت کر دیا کہ صرف وہی فکر تو نسوی کو قریب سے جانتا تھا ایک ڈاکٹر صاحب



ایک ایکٹ کے اس ڈرامے میں کلائمکس اس وقت پیدا ہوا جب سیاہ سارا میں پلیس میری بیوہ بیوی کو مائیکروفون پر آسو بہانے کے لئے لایا گیا۔ اس نے سہاگ کی آخری چوڑی سیلج پر توڑی، ماتھے کا سیندر اور بندہ میٹائی آنکھوں کا کاجل پونچھا اور پھر ان میں آسو بھر لائی۔ اس ماتمی حالت میں میری بیوی مجھے نشانہ دل کش اور دل ربانگی۔ ہواؤں کی شخصیت میں بھی ایک عجیب سی سیستی، ہنسٹیل جاذبیت ہوتی ہے۔ میں نے جی ہی جی میں کہا: ”اے ظالم! تو میرے جیتے جی بیوہ کیوں نہیں بنی تھی؟“

اس کی مسلسل سبکیوں سے محفل کی تمام آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ میری آنکھوں میں آسو آگئے، مگر ریم کے نہیں، خوشی کے آسو تھے، کہ کم از کم میری موت کے بعد تو مجھے بیوی کی محبت ملی، ورنہ اس سے پہلے جب میں اس کی آنکھوں میں آسو آتے تھے، اپنی ماں کی یاد میں ہی آتے تھے۔

اور پھر میری بیوی کی خاموش ماتم گساری سے محفل پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ کسی کے منہ سے کوئی لفظ نکل نہیں سکتا تھا۔ ”اے کاہنہ راہ کا۔ چنانچہ محفل کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر سکریٹری نے جلسہ کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ اور ”فکر تو نسو می میو ریل کمیٹی“ کے پانچ معزز ممبران میری بیوی کی دلجوئی کے لئے قریبی ریٹو رانی میں چلے گئے۔ یہ ریٹو رانی کافی اور آلیٹ کے لئے بہت مشہور تھا۔ کاسٹ! میں ان سے اتنا کہہ سکتا: ”حضرات میرے نام کے چندے میں سے ایک کافی اور آلیٹ! اس بد نصیب کو بھی مل جائے۔“

ہال ماتم کرنے والوں سے خالی ہو گیا میں آخری آدمی تھا جو اپنی نشست پر بیٹھا رہا، بیٹھا رہا۔ نہ جانے کتنے سال بیٹھا رہا ہر جلسے کتنی صدیاں کہ اچانک کسی نے میرا کندھا جھنجھوڑا اور اکیچ کر خست سی آواز لائی: ”صاحب! اٹھئے“ مینگ ختم ہو گئی۔“



اور میری صدیوں کی نفی کھل گئی۔ میرے سامنے کمیونٹی ہال کا چتر اسی کھڑا تھا۔ میں نے ہر شے کو پوچھا "میں کہاں ہوں۔"

چتر اسی منہس دیا۔ "فکر صاحب! آپ کمیونٹی ہال میں ہیں۔ آپ ملک کے مشہور شاعر جناب گھانگل نامراد کی مائیں جلیے میں شرکت کے لئے آئے ہوئے تھے۔ جلسہ کو ختم ہو گیا۔ آپ گھر نہیں جائیں گے کیا؟

# میرا پتر ختم

اور پتروں ہوا کہ میرا پتر ختم ہو گیا۔ چاروں طرف نظر ڈالنے پر معلوم ہوا کہ میرے ساتھ میری بیوی نے پتر ختم نہیں لیا، معلوم ہوتا تھا، وہ مجھ سے بور ہو چکی تھی اور میرا بھی یہی خیال ہے کہ بیوی سے ایک ختم کی رفاقت ہی کافی ہوتی ہے بیوی ایک لطیفہ ہے جو دہرانے سے یاسی ہو جاتا ہے۔

میں دوبارہ ختم نہیں لیتا چاہتا تھا، کیونکہ میرا یہ پتر یقین تھا کہ اتنا ایک مرثیہ کی مانند ہے جو ہر ختم میں لکھڑوں کوں ہی کرتی ہے۔ اگر کبھی لکھڑوں کوں کی بجائے میاؤں میاؤں کرنے لگے تو دنیا جہنم لینے میں کوئی برائی نہیں۔ اس لئے میں چاہتا تھا، یا تو میری آتما پر م آتما میں مل جائے۔ اور اگر یہ ممکن نہ ہو۔ تو مجھے انسان کی بجائے اُتو بنا دے لیکن پر م آتما لئے اپنے اختیارِ ذاتِ خصوصی سے کام لے کر مجھے پھر انسانی چرلا دے دیا۔ کہ انسان کو اُتو بننا بھی تعصیب نہیں۔

جس گھر میں پیدا ہوا۔ وہ میرے سابقہ مکان سے تین گز کے فاصلے پر تھا حالانکہ خدا کی دھرتی اتنی وسیع تھی کہ وہ مجھے کہیں اور پیدا کر سکتا تھا۔ اگر میں اتنا ہی کیا گدرا تھا۔ یعنی ادیب تھا تو مجھے کائنات میں پیدا کر دیتا۔ جزیرہ سمندر میں پیدا کر دیتا۔ لندن میں کوئی برا نہیں تھا۔ اس سے ذرا دائیں دھرتی لیکن ہوا یہ کہ محلے کی ایک گلی سے میری لاش نکلی اور دوسری گلی سے میری آتما پھر داخل ہو گئی۔ بعض آتما میں اتنی

سست رفتار ہوتی تھی کہ صرف دو گھنٹوں کا فاصلہ دو جنموں میں طے کرتی تھی۔

میرے سال بچہ والد صاحب کا نام کشی واس تھا، موجودہ والد کا نام لیش واس۔ دونوں کسی ایک غزل کے دو تالیفے معلوم ہوتے تھے۔ دونوں پڑوسی تھے اور رواج کے مطابق عابی دشمنی تھے۔ اور پھر ابھی دونوں کا پتر جنم بھی نہیں ہوا تھا۔ انسانی رشتوں کی تاریخ میں شاید سب سے پہلی درگھٹنا حق کا ایک بیٹے کے دو والد تھے، دونوں جائز تھے اور دونوں ابھی زندہ تھے۔

چنانچہ میں چھ برس کا ہوا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں دو کشتیوں میں سوار ہوں مجھے ارد گرد کی ہر شے عابی پہچانی تھی۔ وہی درد دیوار، وہی گلی۔ وہی گلی کے سرے پر گدڑی نالی کے قریب کھانا ہوا بابا مکندا۔ وہی بیروہ رام دلارسی کے وصول مٹی میں لوٹتے ہوئے ننگے بچے۔ جنہیں میرے دو جنموں کے دوران بھی تھی ڈھانکنے کے کپڑے نہیں مل سکتے تھے۔ اور وہی میرا آوارہ عابی کالوجہ مستیہا کی ٹکٹیں بلیک میں بچا کرتا تھا اور مجھے کہا کرتا تھا۔ "یوشٹ اپ! بھگوان جسے بھی پیدا کرتا ہے اسے روزی ضرور دیتا ہے۔ چاہے کسی ڈھنگ سے دے"

شروع شروع میں تو مجھے تعجب ہوتا رہا اور میں خاموش رہا۔ لیکن آہستہ آہستہ گذشتہ جنم کی بہت سی یادیں میرے ذہن کے سمندر میں سے لاشوں کی طرح ابھرا بھر کر باہر آنے لگیں۔ اور میں بے چینی ہوا تھا۔ اور آخر ایک دن اپنے موجودہ والد صاحب سے کہا۔ "جناب معاف کیجئے، آپ میرے والد نہیں ہیں۔"

والد صاحب مسکرا دیے۔ ہر والد اپنے بچے کی معصوم شرارت پر مسکراتا ہے اور بلند آواز میں میری موجودہ والدہ کو پکارنے لگے۔ "ماتم نے! تمہارا بیٹا کیا فرما رہا ہے۔ ہا ہا ہا ہا!"

میں نے کہا۔ "مگر وہ بھی میری والدہ نہیں ہیں۔"

اس پر والد صاحب گنبد برخواستے۔ ایک ہلکا سا تپڑ عرصہ کرتے ہوئے بولے۔ "قارے ناسخار! تم کون ہو۔"

”میں فکر تو نسوی ہوں“

فکر تو نسوی - ؟ والد صاحب کہتے تھے کچھ باتوں سے معلوم ہوا۔ شاید وہ میری تحریروں کا مطالعہ کرتے رہے تھے بڑے یقین سے ہونے لگے۔ ”مگر وہ تو انتقال کر چکا ہے۔“

میں نے کہا: ”بچا فرمایا۔ مگر اس کا مستقل انتقال نہیں ہوا۔ دراصل اسے کسی نے قتل کر دیا تھا۔ اور...“

والد صاحب بولے: ”میں جانتا ہوں“

میں نے کہا: ”ہاں، اور اس کے بعد...“

وہ بولے اور اس کے بعد تم سیدھے ہمارے گھر میں آ گئے؟ اور پھر دو سکندر سوچنے کے بعد انھوں نے میرا مزید امتحان لینے کی خاطر پوچھا: ”اچھا، تمہارے پہلے والد صاحب کیا کام کرتے تھے۔“

میں نے کہا: ”بلدی میں ملاوٹ کرتے تھے۔“

رہنستے ہی ان کا چہرہ بلدی کی طرح پیلا پڑ گیا۔ اور مزید پیلا ہونے کے شوق میں کچھ اور سوال کئے جن کے میں نے سو فی صدی صحیح جواب دیئے مثلاً ”رام دھن بھاج کی میری برہم کاریوں کے ساتھ میاگ گئی تھی۔ علاقے کے اسکول کے پرنسپل صاحب گھڑیاں منگول کرنے کے جرم میں گرفتار ہو گئے تھے اور مندر کے پرنسپل درشنا نند ایک بھگتسی کو بھگوان کے ڈائریکٹ ور شی کرانے کے لئے اغوا کر کے لے گئے تھے۔“

اس پر والد صاحب کی حالت غیر ہو گئی۔ اور جب انھوں نے والدہ صاحبہ کو بتایا کہ ہمارے گھر میں جس لڑکے نے جنم لیا ہے۔ وہ کچھلے جنم میں شاعر اور ادیب تھا تو والدہ نے سر پیٹ لیا۔ کہ ہمارے بھگوان! ہم نے کوئی بڑے کرم کئے تھے۔ کہ ہمارے گھر میں شاعر پیدا ہو گیا مگر میں نے والدہ صاحبہ کو سمجھایا۔ کہ اب میں اس جنم میں شاعر اور ادیب نہیں بنوں گا۔ بلکہ ایک پورٹ اپورٹ کا بزنس کروں گا۔

مگر والدہ رکھتے ہوئے بولی متبادرا صورت جسم بدلا ہے روح تو وہی ہے۔ اور روح اپنا کردار منظور کرے بدلتا ہے۔

ہوتے ہوئے سارے شہر میں واویلا مچ گیا۔ کہ لشن داس کیلشن ایجنٹ کے گھر جس بچے درشن کمار نے جنم لیا ہے۔ وہ دراصل فکر تو نسومی ہے۔ یہ خبر میرے سابقہ والد صاحب کشن داس تک بھی پہنچی تو انھیں بہت رنج ہوا۔ اور ایک دوست سے کہنے لگے۔ ”دھکاڑ ہے ایسے بیٹے پر۔ جب اسے معلوم تھا۔ کہ لشن داس سے بہاری دیرینہ عداوت ہے۔ تو اس میں کیوں پیدا ہوا۔۔ وہ بالکل ناخلف ثابت ہوا۔ بعض بیٹے زندگی میں ناخلف ہوتے ہیں، مگر میرے بچے کے بعد ناخلف نکلا۔

اور میرے من کر مجھے بڑا افسوس ہوا کہ وہ آواگون کی تھیوری کے ہی خلاف ہو گئے ہیں۔ اور کہتے پھرتے ہیں، وہ میرا بیٹا ہی نہیں ہے، بجائے کون ہے، حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ پہلے آواگون کے زبردست حمایتی تھے اور کہا کرتے تھے، ”بیٹا! تمہاری ماں۔ کچھلے جنم میں بھینس تھی۔ ایک بار میں نے اس بھینس کو ڈنڈا مارا۔ تو اس نے دھمک دی تھی کہ میں اس کا بدلہ لوں گا۔ چنانچہ اب وہ میری بیوی بن کر کچھلے جنم کے ڈنڈے کا بدلہ لے رہی ہے۔“

میرے درشن کے لئے غول کے غول ہمارے گھر آئے۔ آئے والوں میں میری محبوبہ بھی تھی۔ جو پہلے میرے گھر میں روتی تھی اب دھال پر رہنے لگی۔ کیوں کہ اب نوجوہر عشق کی بجائے بچپن سوار تھا۔ اور میں بھی اپنے سابقہ والد صاحب کی بچا کر اپنی بیوی کو دیکھ آیا اور اس کی بیوی پر چڑھی پیچھے روزنامہ۔ کیونکہ یہ ایک عجیب سے ڈھنگی صورت، حالات تھی۔ کہ ایک عورت کا خاوند زندہ تھا۔ مگر سماج اسے بیوہ کے جا رہا تھا۔

اخباروں نے ایک مشرارت یہ کی کہ میرے سابقہ اور موجودہ جنم دونوں کے فوٹو ساتھ ساتھ شائع کیجئے اور اس طرح اپنے گاہکوں کو اتھقانہ مسرت عطا کی۔ دوسری طرف آواگون کے حمایتیوں اور مخالفوں میں خانہ جنگی کی خبریں آئے لگیں۔ اور ان

میں زخمی ہو کر ہسپتال میں بھی پہنچ گئے۔ میرے پچھلے جنم کے احباب مجھ سے ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ اور ٹھنڈی آہ بھر کر بولے۔ فکر تو نسوی! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟

میں نے کہا۔ ”مجھے ہز جنم ہو گیا ہے۔ خدا تم سب کو ہز جنم عطا کرے۔“

محلے کی رام دہی مجھے ملنے کے لئے آئی۔ مجھے دیر تا سجد کر جرن چھو نے ہوئے بولی۔ ”بٹیا تم بھگوان سے مل کر آئے ہو۔ اُدھر تم نے میرے بیٹے دولت رام کو تو نہیں دیکھا۔“

میں دولت رام کو جانتا تھا۔ اس کے نصیب میں دولت کم اور زخم زیادہ لگے تھے۔ وہ شاعر رواج کے مطابق بھوکا نہ گاتا تھا۔ وہ گھٹیا، سست، شراب پیتا تھا۔ اور پتے پتے بھگوان کو پیارا ہو گیا تھا۔ ”میں نے کہا“ لیکن ماں جی! زخمی صاحبہ..... تو ادھر کہیں دکھائی نہیں دیئے۔ ممکن ہے میری طرح ہز جنم لے چکے ہوں۔“

وہ بولی۔ ”لیکن کہاں — بٹیا! اس کی تو کوئی سدھ خبر ہی نہیں“ میں نے دانشوروں کی طرح جواب دیا۔ ”ہو سکتا ہے وہ اسی محلے میں پیدا ہو چکے ہوں، لیکن ماں جی! ہنا جنم تو کروں کے مطابق ملتا ہے۔“ وہ بولی۔ ”کرم تو اس کے اتنے اچھے تھے بٹیا! کہ وزیر ہی مکتا تھا۔“

”پھر وہ نہ کہیں گیا ہو گا ماں جی۔“ میں نے کہا۔

رام دہی مجھے گالیاں دینی ہوئی چل گئی۔

میرا موجودہ حال صاحبہ بجا فرامی تھیں۔ کہ میرا جسم بدلتا تھا۔ روح وہی تھی۔ وہ کھرا پن، وہی بے لاگ، لپٹ گفتگو، لیکن وہی راست بازار حماقتیں۔ اب لوگ میری باتیں سن کر خوش نہیں ہوتے تھے، نالاں ہو جاتے تھے۔ دھیرے دھیرے انہوں نے ہمارے گھر آنا جانا بند کر دیا۔ محلے کے معززین نے اپنے بچوں کو میرے ساتھ کھیلنے

مرد نے سے منع کر دیا۔ عورتوں نے میری ماں سے مردوں نے میرے باپ سے بول چال بند کر دی اور اب ماں باپ مجھے سانپ کا بچہ سمجھ کر پالنے لگے۔

امیدویاس کے ماحول میں میں بہت اچھا رہ گیا۔ راتوں کو تنہائی میں زار و قطار رو دیا کرتا کہ اے خالق کل! میری یادیں مجھ سے چھین لے۔ پچھلے جنم کا ہر طریقہ آپس لے لے۔ لیکن خالق کو شاید منظور نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ زندگی میرے لئے دوبارہ مورتی گئی۔ خالق نے مجھے نیا جنم ضرور دیا تھا، نئی عقل نہیں دی تھی۔ اس لئے دنیا حوا محو از مجھ سے خوف کھانے لگی، مجھ سے دور بھاگنے لگی۔ اور میں چوبیس برس کا ننھا سا لڑکا اتنی وسیع، عریض دنیا میں تنہا ہو گیا۔ اور اپنی زندگی صرف اپنے ساتھ گزارنے لگا۔

لیکن اچانک ایک دن تنہائی کا یہ مطلق ٹوٹ گیا۔

دراصل اخباروں میں برابر مطالبہ ہونے لگا کہ فکر تو نسوسی کو جس آدمی نے قتل کیا تھا ابھی تک گرفتار نہیں ہو سکا۔ اس لئے کیوں نہ اب فکر تو نسوسی سے ہی قاتل کا نام پوچھ لیا جائے۔ قانون اگر نالائق ہے تو پھر جنم سے کیوں نہ قاتل لٹا دیا جائے۔

اس مطالبے پر شہر بھر میں میرا مردہ بھر زندہ ہو گیا۔ ایک ہجوم نے غصے میں آکر تقارن کو آگ لگا دی۔ آخر تنگ آکر سرکار نے ایک پولیس افسر میرے پاس بھیج دیا اور وہ بولا: "صاحب!"

میں نے کہا وہ فوت ہو چکا ہے

وہ بولا "آہ! اس کی موت ہی تو ہماری مصیبت بن گئی ہے۔ آپ ہی ہیں اس مصیبت سے چٹسکار ادا کیے اور تھائیے کہ آپ کو کس نے قتل کیا؟"

میں نے کہا: "ایک سکورشڈ رائیوڈ نے"

"وجہ"

"بہت معمولی۔ اس نے منقرضہ کرائے سے بیس بیس زیادہ طلب کئے تھے

میں نے اسے مشر دلائی۔ جس پر اس کا پارہ چڑھ گیا۔ اور اس نے چہرہ نکال کر میرے پیٹ میں بھونک دیا۔

پولیس افسر بولا: "صرف میں پیسے کے لئے؟ اتنے بڑے ادیب کو صرف بس پیسے کی خاطر مار ڈالا۔"

"جداں! ان دنوں میں پیسے میں ایک سنگترہ آجاتا تھا۔ مگر ادیب لوگ پانچ پانچ پیسے میں مل جاتے تھے۔ ریٹ کا فرق تھا نا جی!"

پولیس افسر کو طیش آگیا۔ "بولا۔" ہم اچھے بھانسی پر شکاویں گے، آپ اس کا نام بتائیے۔ سکورٹنگ نمبر بتائیے۔

مجھے اس کا علیہ اور سکورٹنگ نمبر پوری طرح یاد تھا۔ لیکن... لیکن۔ کیا یہ اسے بھانسی دہا گئے؟ میرا انحصار جسم کا نپ اٹھا۔ یوں لگا، جیسے بھانسی کا پتھر آہستہ آہستہ سکورٹنگ ڈرائیو کی بجائے میری طرف بڑھ رہا ہے، نہیں نہیں، میں اس کا علیہ نہیں بتاؤں گا۔ مجھے یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔ اور میں بچ بچ بھاگ کھڑا ہوا، زور زور سے بھاگتا گیا۔ بھاگتا گیا، گلی ٹریک، بازار۔ اور پھر میں پھپھیا کرنے والوں کی نظر بچا کر ایک تنگ ذنار کی گلی میں گھس گیا۔ اور پھر یوں محسوس ہوا، جیسے اس اندھیرے میں ایک چہرہ ابھرا ہے، یہ چہرہ بھانک تھا۔ اس کے آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چمکیلا چڑا تھا۔ اور میں نے اسے پہچان لیا یہ وہی تھا، بالکل وہی وہی سکورٹنگ ڈرائیو۔

اور اس نے میرے پیٹ میں چہرہ اگھونپ کر ایک بار پھر مجھے قتل کر دیا۔



# زورِ خطابت

دیکھنا تقریب کی لذت کہ جو اس نے کہا  
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ کبھی میرے دل میں ہے

# مشاعرے میں صدارتی خطبہ

معزز حاضرین اور ان کے اطفال کرام !

آپ نے مجھے اس مشاعرے کی صدارت کا اعزاز عطا کر کے عجمیت کا ثبوت دیا ہے یا فہمیت کا۔ میں نہیں جانتا۔ لیکن گزشتہ کئی دنوں سے مجھے شک ہو رہا تھا کہ مجھ سے کوئی نہ کوئی نازیبا حرکت سرزد ہونے والی ہے۔ ایک خوف یہ بھی تھا کہ شاید مجھ کو کسی قبر کا محاورہ بنا دیا جائے گا یا کسی اجتماع کی صدارت سونپ دی جائے گی۔ جیسے گائے یا بچہ ہو جائے تو اسے نگوشت خانہ میں دان دے دیتے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شاعر، شاعری ننگ کر دے تو اسے کان سے پکڑ کر مشاعرے کی صدارت کر سنا تک پہنچا دیتے ہیں۔

صبا یئر! اس گھور رکشا "پر میرے ساتھ ہمہردی کیجئے۔"

پرسوں کی بات ہے۔ یہی سکریٹری صاحب جو مرغابی کی طرح گردن پھیلائے خوش خوش نظر آ رہے ہیں میرے پاس ماتحتی چہرہ لئے ہوئے قشریعت لائے اور بولے۔ "نگر صاحب! براہ کرم آپ ہمارے مشاعرے کی صدارت قبول فرمائیے۔" میں نے کہا۔ "مگر آپ نے توجناب بقل بطورا صاحب کو صدر بنانے کا اعلان کر رکھا ہے۔"

وہ بولے۔ "افسوس! کہ کل وہ اچانک انتقال فرما گئے۔"

سامعین حضرات! میں نے بہت مشکل سے آنسوؤں کو روک کر اسٹیج  
 شکر ٹیری سے کہا، آپ مجھے جس راستے پر ڈال رہے ہیں وہ سیدھا لقلیہ بطور راکی طرف  
 جاتا ہے۔ لیکن شکر وادب کی خدمت کے لئے میں جہنم یا جنت دونوں جگہ جانے  
 کے لئے تیار ہوں۔ بھائیو! آپ نہیں جانتے کہ میرے جہنم جانے کی پیش کش پر اسٹیج  
 سکریٹری صاحب کس قدر مسرور ہوئے۔ جو لوگ دوسروں کی خوشی کے لئے مہر جاتا  
 ہیں۔ مثلاً ان کا جنازہ مشاعرہ گاہ سے سیدھا قبرستان تک پہنچ جاتا ہے!  
 اور سامعین حضرات! جب مجھے ایک آرامتہ کار میں بٹھا کر اس مشاعرہ گاہ تک  
 لایا جا رہا تھا تو مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ایک بکرا ہوں اور مجھے قربانی  
 کے لئے قضا کی گئی ہے پاس لے جایا جا رہا ہے۔ ابھی ابھی ایک صاحب نے میرے  
 صدر ربڑے کی تائید فرمائی تھی، آپ کو ان کی تائید سے گمراہ نہ ہونا چاہئے۔ ریاضہ و  
 سہیل کو تائید انھوں نے دل کی گہرائیوں سے کی ہو۔ نہیں جناب تائید کرنا ایک  
 عادت ہے۔ جیسے سکرٹسٹ پینے کی عادت، جھوٹ بولنے کی عادت، گالی دینے  
 کی عادت۔ صرف عادت پر ادب عالیہ کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔ آپ یہ نہ سوچتے  
 کہ انہیں میرا صدر بننا پسند تھا۔ بلکہ ان کی ٹریڈڈی یہ ہے کہ وہ منہ بھٹ نہیں ہیں۔  
 جبکہ اسٹیج سکریٹری نے میری گردن میں پھولوں کے ہار ڈالے ہیں۔ میں اپنے  
 آپ کو آپ لوگوں سے الگ نعلنگ محسوس کر رہا ہوں۔ جیسے میں آپ سے زیادہ معزز  
 شخص ہوں۔ اندازہ لگائیے، صرف پچیس پیسے کے ہار سے انسان معزز بن جاتا ہے  
 پھر بھی سماج میں اس کی عزت ہمیشہ خطرے میں رہتی ہے۔ کیونکہ پھولوں کا ہار ہنا سہیت  
 کمزور بنیاد ہے۔ کل۔۔۔ کوئی بھی شخص پچیس پیسے کا ہار خرید کر اپنی گردن میں ڈال  
 لے گا اور کہے گا۔ ”میں صاحب صدر ہوں۔“ اس کا مطلب ہے حضرت!  
 کہ نہ میں معزز ہوں نہ آپ ہیں۔ معزز یہ ہار ہے! اگر ابھی ابھی ایک صاحب پچاس  
 پیسے کے دو ہار پہن کر اسٹیج پر آجائیں اور کہیں کہ میں آپ سے ذیل معزز ہوں! تو  
 میں صدارت کا بائیکاٹ کر دوں گا۔ کیونکہ یہ اصول کا سران ہے۔ آپ جانتے

ہیں اصول کے لئے لوگ آئم واہ تنک کر لیتے ہیں عزت یا تواصول میں ہوتی ہے یا ہاروں میں۔ صدارت میں کبھی نہیں ہوتی۔

جناب! اگر یہ ہاروں والی صدارت کا قصد آپ کو پسند نہ آیا ہو تو ایک اور صدر کا قصہ سن لیجئے۔ جس نے صدارت خریدی مگر اس نے مشاعرے کے منتظین کو ایک سو ایک روپیہ چندہ غنائیت فرمایا۔ جب وہ صدارت سکے لئے اسٹیج پر تشریف لائے تو صدارتی گھر سی پر کوئی دوسرے صاحب تشریف فرما تھے۔ انھوں نے منتظین کو ایک سو ایک بار چھاڑنے کے بعد پوچھا۔ یہ کیا ناں نہیں ہے؟ اسٹیج سکرٹری نے معذرت طلب کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا کوئی قصہ نہیں۔ ان صاحب نے ایک سو ایک روپے کی پیش کش کر دی مگر اس نے اس سے ہم انھیں صدر بنانے پر مجبور ہو گئے۔

دوستو! میں ان دردناک حادثوں کا ذکر اس لئے کر رہا ہوں تاکہ آپ کو یقین دلا سکوں کہ میں آپ سے زیادہ معزز نہیں ہوں۔ موجودہ صدارت کے دوران مجھے برابر یہ کھٹکا لگا رہا ہے گا کہ آپ میں سے کوئی بھی خوددار شخص اٹھ کر اسٹیج پر آجائے گا اور کہے گا: "فکر صاحب! کرسی صدارت خالی کیجئے اس پر میں بیٹھوں گا! کیونکہ میرا بنگہ نہیں اس کے باوجود جناب! مجھے نہ جانے کیوں یہ امید ہے کہ آپ یہی اور بھی حرکت نہ کریں گے کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں میری باتیں سن کر آپ کے چہرے زرد پڑ گئے ہیں اور زرد چہرے کبھی خوددار نہیں ہوتے۔

اور شاید اب آپ انتظار کر رہے ہوں گے کہ میں کوئی صدارتی فرض ادا کروں گا۔ نہیں صاحب کرسی صدارت پر بیٹھنے کے بعد صدر اپنے خطری انجام تک تک جا پہنچتا ہے اور اب میری حالت زیادہ سے زیادہ اس قیدی کی سی ہے جس کی آزادی کا کھانا گھونٹ دیا گیا ہو۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ صدر کی کرسی چار گھنٹے مسلسل کرسی پر معزز بن کر بیٹھ رہنا کتنا ذہنی حذاب ہے! اب میرے پاس



مفہوم نہ سمجھ سکا۔ اس نے پڑا تھا۔ میری شعریت بھی دوسروں کی سمجھ کی غلام کہنی۔  
اس نے حکام ہو گئی کبیر تک میں بھٹک رہی کی بات کرتا تھا تو لوگ اسے مجبورہ کی قاضی  
سمجھتے تھے۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے کہ میں شاعری بجائے صدر بنا بیٹھا ہوں!

میں نے شاعری ترک کر دی۔ لیکن ترک شاعری کے باوجود میں نے دیکھا کہ  
شاعری کی عظمت کم نہ ہوئی، مصیبت یہ ہے کہ ہر دور میں کئی شاعر ایسے ضرور پیدا  
ہوتے ہیں جو شہر مچاتے ہیں کہ شاعری کا زوال قریب ہے اسے پھر بلندی عطا کرنی چاہیے  
یہ اول درجے کے شعرا دکھانے لگتے ہیں۔ یہ دیکھ کر دوسرے اور تیسرے درجے شعرا  
پریشان ہو جاتے ہیں کہ اعلیٰ شاعری کو رہا کر کے ان کا مشن ختم ہو رہا ہے۔  
ان میں سے کئی دریا میں چھلانگ لگا کر مر جاتے ہیں اور مرنے سے پہلے دریا کے کنارے  
پر کاغذ کا ایک پرزہ چھوڑ جاتے ہیں کہ یہ جاہل دنیا اس کی عظمت کو سمجھ ہی نہ سکی۔ لیکن  
کچھ شعراء جو دریا کے ٹھنڈے پانی سے ڈرتے ہیں خود کشتی نہیں کرتے تنقید نگار بن جاتے  
ہیں۔ ایسے ہی ایک شاعر نے انتقام لینے کی غرض سے ایک پورٹ امپورٹ کا دھندا  
شروع کر دیا اور خوب نام اور دام کمائے۔ اس طرح ایک اور شاعر نے شاعری سے  
بدل لینے کے لئے "نا شاعری" شروع کر دی جس کے یہ چند مصرعے عجیب بھی نہ ہیں بھولے۔

میں اپنے والد کی کھلی کا ایک مسہ ہوں

جی میں آتا ہے کہ

اپنے والد کی قبر پر گروں

اور کہوں

تمہ سے اپنی یہ جائیداد واپس لے لو۔

میرے اندر کا جو جو مل ہے، لہذا میرا ہی تھلا۔

اور پھر قبر پر تدر سے فے کروں۔

تے نہیں جائیداد لٹا دوں!

لیکن سامعینِ کرام! شاعر چاہے خود کش کر لے، چاہے کھلی کا مسہ بن جائے۔

لیکن صرف ایسے ہی شاعروں کی بدولت مشاعروں اور میگزینوں کی رونق قائم رہتی ہے۔ یہ اتنا بڑا سماج جو مزدوروں سے لے کر ستم خانوں سے ہونا ہمارا راج محلوں تک پھیلا ہوا ہے۔ صرف دو چار عظیم شاعروں کے بغیر سے پر نہیں چل سکتا۔ غالب نیگور۔ اور اقبال سے اس سماج کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر غالب اور اقبال کے پیچھے کئی ڈوئین شاعر ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک آدھ ڈوئین اس شاعرے میں بھی موجود ہے۔ اگر اس شاعرے میں صرف نیگور ہوتا تو مشاعرہ مندرہ میں منٹ میں ختم ہو جاتا۔ لیکن اب اللہ کے فضل سے یہ مشاعرہ رات کے تین بجے تک چلے گا۔ بڑے شاعر صرف بڑی باتیں کرتے ہیں۔ لیکن سماج کو چھوٹی باتوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ چند دن ہوئے کافی ہاؤس میں دو شاعروں نے ایک دوسرے کے منہ پر کانچ کے گلاس پھینک کر ایک دوسرے کو لہو لہان کر دیا۔ کیونکہ دونوں ایک دوسرے کو گھٹیا شاعر کہہ رہے تھے حالانکہ دونوں اس بات پر متفق ہو چکے تھے کہ نیگور گھٹیا شاعر تھا۔

حضرات! میں دیکھ رہا ہوں کہ شعراء حضرات میرے خطبے سے بور ہو رہے ہیں اور اس سے پہلے کہ وہ مجھے ہوٹ کرنا شروع کر دیں میں اسٹیج سکریٹری سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ شاعرے کا آغاز کر دیں اور شاعرے کی حسین روایت کے مطابق پہلے گھٹیا شاعروں اور پھر ان سے کم گھٹیا شاعروں کو!!

# محلہ سدھار کیٹی

بھائیو، بہنو! تقویٰ سسی والدہ اور بہت سے بچو! آپ نے یہ اچھا نہیں کیا کہ مجھے محلہ سدھار کیٹی کی اس سالانہ ٹینگس کا مہمان خصوصی بنا دیا۔ میں مہمان خصوصی بننے سے ہمیشہ بدکوتا ہوں۔ کیونکہ یہ ایک ایسی عزت ہے جو انسان کو غیر فطری بنا دیتی ہے۔ اور اس سے راست گفتاری چھپی لیتی ہے۔ مثلاً آپ میں اتنا بھی نہیں کہہ سکتا کہ جس کرسی پر بیٹھا ہوں اس کی ایک ٹانگ لڑٹھنے کے قریب ہے اور میں پورے وقت ایک پہلو بیٹھ کر اپنے آپ کو سنبھالتے رہا ہوں۔

حضرات! کہیں کہیں مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ پورا محلہ ایک کرسی ہے۔ جس کی ایک ٹانگ ہمیشہ لڑٹھنے کے قریب رہتی ہے اور ہم سب ایک پہلو بیٹھے اپنے آپ کو سنبھالتے رہتے ہیں۔ اس سنبھالتے پر ہمارا کافی وقت صرف ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے وقت کا یہ انتہائی بھونڈا استعمال ہے لیکن ہمیں اپنے محلے سے چونکہ بے حد محبت ہے۔ اس لئے محبت کی خاطر ہمیں یہ بھونڈا پن کرنا ہی پڑتا ہے۔ جناب والا! محبت انسان کی سب سے بڑی بد نصیبی ہے۔ یہ تو ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم نے اس بد نصیبی کو قربانی کا دغریب نام دے کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیا ہے۔ ورنہ خدا نے تو ہمیں جذبہ محبت عطا کر کے ہمارے سامنے کافی بڑا



کیا تھا ۔

میں نے ابھی ابھی آپ سب صحابیوں بلکہ ”صحابہ“ کی تقریریں سنیں جو محلہ سدھار کے عظیم مقصد سے کی گئی ہیں۔ ان تقریروں سے ہی مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ ہمارا محلہ جگڑے ہوئے انسانوں کا ایک مجموعہ ہے۔ اس لئے ہمارا سدھار پرونا چاہئے۔ آہ ! یہ کتنی شرمناک بات ہے کہ خود ہی اپنے آپ کو ذلیل انسان کہہ کر ذلیل کر رہے ہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اپنے آپ کو ذلیل تسلیم کر لینا بہادرى ہے۔ اور ہم بہادر لوگ ہیں۔ صحابیان ! اگر ایسا ہے تو میں حیران ہوں کہ آپ بہادر انسانوں کا سدھار کیوں کرنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ وقت کا بھونڈا استعمال نہیں ہے کہ آپ پیغمبروں کو نصیحت کریں کہ آپ کے کپڑے میلے ہیں، انھیں دھویا کیجئے، حالانکہ پیغمبر اگر کپڑے نہیں دھواتے اس کی کوئی گہری اور فلسفیانہ وجہ ہوگی۔ جو اسے خود اچھی طرح معلوم ہوگی۔

اس لئے جناب زمری مانے، تو اس محلہ کا سدھار رحمت کیجئے، اگر آپ کے کپڑے میلے ہیں تو صابن سے دھو لیجئے، صرف صابن نہ کہ برا پگنڈہ کی خاطر لیجئے، زیادہ لوگوں کو ایک شینگ میں اکٹھا کرنے کی کیا ضرورت ہے ! — چند دن ہو کہ اس محلہ کے ایک بزرگ ابدیدہ ہو کر کہنے لگے : ”فکر صاحب ! اس محلہ میں چوبیسوں کی تعداد ہیئت بڑھ گئی ہے۔ مگر کوئی ان کا تدارک کرنے والا نہیں ہے۔“ میرا خیال ہے کہ وہ چوبیسوں کی سینہ ندی پر ابدیدہ نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کی آنکھوں میں لکڑے تھے۔ ورنہ جو بے توجہ ہے دان کے دریچے بھی آسانی سے پکڑے جاسکتے ہیں۔ اگر ہم چوبیسوں دان اور صابن کا استعمال نہیں جانتے تو جناب بھیا خدا سے دعا کرنی چاہئے کہ ہمیں اگلے جنم میں انسان بنائے بلکہ جو سے بناوے۔ جو کپڑے نہیں پہنتے اور جنھیں صابن کے استعمال کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کیا آپ نے تمبھیں دیکھا کہ چوبیسوں نے کبھی چولہا سدھار کیشتی بنائی ہو۔ اور لکڑوں کی آڑ میں آستر بہائے ہوں۔ عیاں اور سنو ! برائے مانے تو میں کہوں گا کہ جو ہے ہم سے زیادہ فطری زندگی گزارتا

آپ شاید مجھ پر شک کر رہے ہوں گے کہ میں محلہ کا سدھار نہیں چاہتا۔ ایسا ہی شبہ مجھ پر اس محلہ میں بھی کیا گیا تھا جہاں میں دو سال پہلے رہتا تھا۔ یہ عجیب بات ہے بھائیو کہ دنیا کے ہر محلہ میں رات کو بے گناہانہ بھونکتے ہیں جس سے اہل محلہ پریشان رہتے ہیں۔ ہر محلہ میں ایک جھگڑا لڑو عورت رہتی ہے جو غلط امن کا باعث بنتی رہتی ہے۔ ہر محلہ میں دو چار آوارہ گرد نوجوان لڑکے پیدا ہو جاتے ہیں جن سے محلہ کا اخلاق تلوار کی لہجہ پر رہتا ہے اور ہر محلہ میں پانچ دس ریشاڑو بوڑھے بھی ضرور رہتے ہیں جو نصیحتوں کے چرانغ اپنے سرانے جلا کر بیٹھتے رہتے ہیں۔

اور دوستو! یہ سب عداوتیں ہیں۔ ان سے ہم بچ نہیں سکتے۔ ان سے کسی بھی محلہ کو ان نفوس سے محروم کر دیا جائے تو وہ محلہ نہیں رہتا بلکہ جنت بن جاتا ہے اور معاف کیجئے جنت ایک انتہائی آسائش والی چیز ہے، جنت شوقیہ میں اتنا دھڑلا شک کی ایک چیز ہے جس کے لب اگرچہ لعلیں ہیں مگر ان پر کسی کا بوسہ ثبت نہیں ہوا، کیونکہ اس بوسے میں نہ خلوت ہوتی ہے نہ حرارت۔ سچ بتائیے کیا آپ پلاٹنگ کی اس حسینہ کو کوئی محبت نامہ بھیج سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر آپ اس جہنم کے خلاف کیوں شور مچاتے ہیں۔ میں تو جب محلہ کی کسی جھگڑا لڑو عورت یا آوارہ گرد لڑکوں کو دیکھتا ہوں تو خدا کا شکرا ادا کرتا ہوں جس نے جنت کے ساتھ جہنم بھی پیدا کر دیا اور ہمارے محلہ کو پلاٹنگ کی حسینہ بننے سے بچا لیا۔ جانا والا! خدا پر اعتبار کیجئے وہ ہم سے زیادہ ذہین اور دور اندیش ہے۔ جس نے ہمیں زندگی کی خلوت اور لذت بخشنے کے لئے انکو رہی عطا نہیں کئے۔ بلکہ ریشاڑو بورج بھی عطا کر دیئے جو لوٹری کارول ادا کرتے ہیں۔

آج کی منگ میں ایک معزز مقربے اشارتاً ذکر کیا ہے کہ ہمارے محلہ میں ایک شاعر رہتا ہے جو رات کو شراب میں دھرت ہو کر آتا ہے اور ادھم مچاتا ہے۔



استغفار نہیں کیا۔ دراصل لالہ کانشی رام سے زیادہ بھی پولیس میں روحانی حیدریت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ کیرتن کے تقدس کو اس طرح ہتھکڑیاں پہنائی جانی رہیں گی۔

جب میں نے جیل میں لالہ کانشی رام سے ملاقات کی اور پوچھا کہ کیرتن کا یہ غلط نتیجہ کیوں نکلا تو انہوں نے قلماسفروں کی طرح جواب دیا۔ "لوہے کی پلک ایک انفرادی مسئلہ ہے۔ آپ اسے کیرتن کے جماعتی نتیجے سے کیوں ملاتے ہیں بدھکھ لیلے بھگے کیرتن کا پھل الگ ملے گا۔ اور میں جھوٹ جاؤں گا۔"

"کیسے؟ میں نے نشر کیا پوچھا۔

وہ مسکرائے اور بولے۔ "بھگوان نے میری عبادت سے متاثر ہو کر پولیس کی بدھی بھرشت کر دی ہے اور وہ میرے ساتھ رسووت کی بات چیت چلا رہی ہے کیرتن کا پھل رائیگاں نہیں جاتا فکر صاحب آپ کی عبادت میں سچی عقیدت اور خلوص ہونا چاہئے۔ میں پوچھتا ہوں ذرا بتائیے، پولیس کی بدھی بھرشت کرنے میں کسی کا ہاتھ ہے؟"

بھائیو۔ سنو۔ لالہ کانشی رام کی یہ تشریح اگرچہ اذکمئی اور قابل فہم تھی لیکن اگر وہ واقعی رہا ہو گئے تو کیا ہم میں سے کسی کی جرات ہے کہ کیرتن کے روحانی اثرات سے انکار کریں۔ البتہ صرف ایک شبہ میرے دل میں ابھی تک رہا ہے کہ اس کیرتن کے بعد محلے کے بھگوان داس چراسی کا سامان جب اس کے مالک مشری تارن سنگ داس نے باہر بیٹیک دیا تو کیرتن کا پھل بھگوان داس چراسی کو کمیوں نہیں ملا۔ حالانکہ کیرتن میں اس نے سب سے زیادہ شرتی اور عقیدت اور خلوص کے ساتھ ڈھول بجا یا تھا اور رات بھر عکیا اور گانا رہا تھا۔ کیا کوئی ایسا استہمام نہیں ہو سکتا کہ خدا بھی اپنی بدھی بھرشت کر لے۔ یہ محض سدھاکرشی کا فرض ہے کہ وہ رسووت کا نتیجہ کرے اور بھگوان داس چراسی کو دوبارہ مکان ولادے ورنہ خطرہ ہے کہ محلے میں کیرتن کی روایت غلط شکل اختیار کر جائے گی۔ اعلیٰ کیرتن کے روحانی اثرات میں نقصا و پیدا

ہو جائے گا۔ کم از کم عبادت کی سطح پر تو چراسی اور آٹھن مرحلے میں فرق مٹ جانا چاہئے۔ ورنہ ہمارے محلے کے لوگ کیزن کے لئے چندہ دینے سے ہچکچاتا شروع کر دیں گے۔ ذرا سوچئے اگر چندہ جمع کرنے میں رکاوٹ پیدا ہوگئی تو کیا کیزن منڈلی والے کم اجرت پر کیزن کرنے سے انکار نہیں کر دیں گے

محلے کی ایک تعلیم یافتہ خاتون مسز و ملا نے اپنی تقریر میں دھمکی دی ہے کہ اگر محلے کے بچوں میں گندی گالیاں دینے کی قبیح عادت ختم نہ کی گئی تو میں محلہ چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ حضرات مجھے یقین ہے کہ وہ محلہ نہیں چھوڑی گی۔ کیونکہ ان میں لیڈرانہ صفات پائی جاتی ہیں اور وہ محلے کی عورتوں کی لیڈر بننا چاہتی ہیں اگر محلہ کے تمام بچے آج قید کر لیں کہ وہ گندی گالیاں نہیں دیں گے تو مسز و ملا کے لئے یہ انتہائی رنجیدہ فیصلہ ہوگا۔ کوئی لیڈر یہ نہیں چاہتا کہ گندی اور بری چیزیں ختم ہو جائیں۔ ہماری کمزوریاں، گندگیاں اور برائیاں ہی مسز و ملا کا من بھاتا کھا جائیں۔ ان کا خاتمہ مسز و ملا کا خاتمہ ہوگا۔ ایک تیر انداز سے اگر یہ کہا جائے کہ تم بغیر نشانہ کے تیر چلاؤ تو اسے اپنے آرٹ کی توہین سمجھے گا۔ اسے آپ پر غصہ آئے گا۔ اور ممکن ہے، غصہ میں محلہ چھوڑ کر چلا جائے۔ اگر مسز و ملا ابھی تک محلہ چھوڑ کر نہیں گئیں تو صرف اس لئے کیونکہ یہاں کے بچے برابر گندی گالیاں دیے جا رہے ہیں اور مسز و ملا ان کی ماؤں کو برابر پھوٹرا، بدتمیز اور بد نصیب کہے جا رہی ہیں۔ جناب عالی — ایک تعلیم یافتہ عورت کے ذریعے غیر تقسیم یافتہ عورتوں میں احساس کمر بھاگ اٹھا ہے اور جب لوگوں میں احساس کمتری پیدا ہو جائے تو وہاں ایک نہ ایک لیڈر ضرور پیدا ہوتا ہے جو اس احساس کمتری کی ستار پر اپنا نشانہ لگاتا ہے۔

اس لئے حضرات! مسز و ملا کی دھمکی کو بھی ایک قسم کا نغمہ سمجھئے۔ خدا نہ کرے کہ ہمارے محلے کی عورتیں پھوٹرا اور بدتمیز نہ رہیں اور یہ نغمہ بند ہو جائے جسے سن سنا کر ہمارے محلے کی عورتیں مست ہو رہی ہیں — یہ صحیح ہے کہ گندی، نالی، تہذیب کے زوال کی علامت ہے۔ اور مسز و ملا نہیں چاہتیں کہ اس کے اپنے بچے بھی گندی گالیاں

سیکھ جائیں، لیکن میں آپ کو یقین دلانا ہوں کہ مسز ویلار یہ بھی نہیں جانتی تھیں کہ ایسے قیمتی محلے کو جہاں بدتمیزی زدوروں پر ہے، چھوڑ کر علی حیا میں۔ دراصل مسز ویلار اس محلہ کی عورتوں اور بچوں میں تہذیب کی دانخ بیل ڈالنا چاہتی ہیں۔ چاہے اس کے لئے انھیں کتنی قربانی دینی پڑے۔ چاہے اس کے اپنے بچے گندی گالیاں سیکھ جائیں۔ جناب! بیڈروں میں قربانی کا زبردست جذبہ پایا جاتا ہے۔ اس لئے مسز ویلار کو قربانی کا موقع دیجئے۔ در زمان کی افسردگی اور بڑھ چائے کی اور آنکھوں کے سیاہ چلنے اور گھرے ہو جائیں گے جو محلہ کی بدتمیزی پر کڑھتے رہنے کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں۔

مبائی اور ممبڑا! — اپنی تعزیر ختم کرنے سے پہلے میں ابھی گڈارشی کروں گا کہ اس محلے کے سدھار کے نام کو اتنا گہرا مدد بنائیے۔ یا ارشہ آپ اس میں چند مسلم تبدیلیاں لے آئیے۔ مگر کوئی بنیادی تبدیلی لانے کی ضرورت کو سنیں نہ سمجھیں۔ آپ چاہیں کہ محلہ بدر کرنے کے لئے بلیاں پانے کا پلان بنائیے ان کے ساتھ کچھ بکے بھی لے آئیے گا تا کہ بیروں کی زندگی "ڈل" نہ ہو جائے، محلے کی صفائی ستھرائی کے لئے کوئی مشترکہ فنڈ قائم کر لیجئے اور فنڈ اتنا کم نہ ہو کہ اس میں قبیل کی گنجائش نہ رہے۔ چوروں کو ڈرانے کے لئے ایک بانٹواہ پیرے دار بھی رکھئے وہ پیرے دار سوائے صدقہ جفاکش اور احمق ہوتا کہ چوروں سے نہ مل جائے، محلہ میں کسی کا انتقال ہو جائے کسی کا جنم ہو جائے کسی کی شادی ہو جائے یا کسی کا لڑکا لڑکی بھاگ جائے تو بچا سب مل کر اسنو بھائیے یا قہقہے لگائیے (اور یہ سب کچھ اس لئے کیجئے کہ آپ سب ساتھ بھی رہ سکتے ہو)۔

غرض یہ سب کچھ کیجئے۔ جس کا آپ کے دل سے کوئی گہرا تعلق نہ ہو۔ جناب! میں یہ غور ڈمی سہی کڑوی بات اس لئے کہہ رہا ہوں کیونکہ ہم اس سے زائد کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ وہ ہمیں سے کوئی فرد محلہ سدھار نہیں کرے یہ اجازت دے گا کہ اس کے دل

اور صبح کی سلطنت پر حملہ کر دے۔ کیا آپ محلہ سدھارکیشی کو یہ اجازت دیں گے کہ وہ آپ کو انڈا کھانے کا حکم دے جبکہ آپ ٹائٹل کٹ کر کھارہے ہوں۔ ایک بار میں نے محلے کے ایک شخص سے کہا: "جناب! آپ کے چہرے پر جو ڈاڑھی ہے وہ انتہائی بد نما لگتی ہے۔ آپ روزانہ شیو کیا کیجئے۔" تو وہ مجھ سے اتنا ناراض ہوا کہ میں اب اس سے ڈر کے مارے وہ دس روپے بھی نہیں مانگتا تھا اس نے مجھ سے قرعہ لے لئے تھے۔ اسی طرح ایک بار محلہ کے ایک معزز آدمی نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ آپ پان مدت کھایا کیجئے۔ اس سے آپ کے دانت جھڑ جائیں گے۔ میں حیران ہوا کہ میرے دانت جھڑنے سے اس آدمی کو کیا دلچسپی ہے؟۔ کیا صرف اس لئے میں اس کی بات مان لوں کہ میں کبھی کبھار اس سے اخبار پڑھنے کے لئے مانگ لانا ہوں؟ اس نے جناب! ہم ایک محلے میں رہنے کے باوجود الگ الگ انسان ہیں محلہ سدھارکیشی اگر ہم الگ الگ انسانوں کو ایک دماغی سے ہٹکا چاہتی ہے تو یہ اس کی سنگدلی ہے بلکہ ایک غیر فطری حرکت ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے آپ نے مجھے خصوصی مہمان کی عزت دے کر غیر فطری باتیں کہنے پر پابند کر دیا۔ آپ کے مانگنے پر اس وقت جو شکن پڑ رہے ہیں وہ تباہ کر دیتے ہیں کہ میں نے اس پابندی کو کیوں توڑ دیا ہے اور اس کرسی کے ٹوٹنے والے پاؤں کا ذکر کیوں کر دیا جو شاید لالہ کاشفی رام کے گھر سے لائی گئی ہے اور جو آج کل بلیک کے جرم میں جیل میں بند ہیں۔

# لیڈروں کی محفل میں

معزز رہنما یان قوم !

آپ نے مجھے اپنی محفل میں مدعو کر کے جس عظیم روایت کو ٹوڑا ہے۔ اس کے لئے میں ممنون بھی ہوں اور حیرت زدہ بھی۔ روایت یہ ہے کہ لیڈر بولتا ہے اور عوام سہکتے ہیں۔ لیکن آج عوام بولے گا اور لیڈر سستیں گے۔ یعنی آج ہم دونوں غلط نشستوں پر بیٹھے ہیں۔ روایت سے اس بقا و بہت کے کارن میری پوزیشن مفہوم خیز ہوئی ہے یا آپ کی، میں نہیں جانتا۔ لیکن ایک بات صاف ہے کہ آپ کے سامنے تعزیر کرتا یا لکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی افسر لوگ، بڑی بوڑھوں کو نصیحت کرنے بیٹھ جائے کہ دھوپ میں بال سفید کرنے کے کیا کرتے ہیں۔

حضرت! یہ آخری فقرہ میں بڑی محنت سے تیار کر کے لایا تھا، تاکہ آپ کے تاجدار ہو کر اس پرتالی بجا سکیں۔ لیکن آپ تو گم سم بیٹھے ہیں، اس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا۔ کہ ایک اچھے سامع اور نالائق سامع میں کتنا فرق ہوتا ہے اور تاریخ میں جتنے لیڈر ذلیل و خوار ہوئے ہیں، صرف نالائق سامع کی وجہ سے ہوئے ہیں۔

لیڈر صاحبان! اس محفل کے معزز میزبان نے جسے اپنا لیڈر کی عروج میں پھانسی کی سزا ہوئی تھی مگر ایک تکنیکل وجہ سے کہ سزا کے حکم میں ان کے والد صاحب کا نام غلط لکھا گیا تھا، پھانسی نہیں مل سکی تھی۔ وہ آج کل سکھ



اور کریم کی ایک بہت بڑی فیکٹری چلاتے ہیں۔ انھوں نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں لیڈر اور سیاست کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کروں مگر یہ مشورہ ناقابل عمل ہے کیونکہ نہ تو میں بہادر ہوں کہ سچ بول سکوں اور نہ سیاست والوں ہوں کہ مجھ کو بول سکوں اور ایک اچھی تقریر کے لئے یہ دونوں گن لازم ہیں۔

لہذا اس پیچیدہ صورت حال سے بچنے کے لئے میں آپ کو اپنے پڑوسی شفا سنگھ کی بات سناتا ہوں۔ شفا سنگھ بڑھی ہے۔ وہ نہایت نفیس اور خوبصورت کرسیاں بناتا ہے۔ لکڑی یعنی "جینوئن" استعمال کرتا ہے اور یہ اس کی خاندانی روایت ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ شیر کے متعلق اس کی معلومات نہایت محدود ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے سیاست کے متعلق میری معلومات ناقص ہیں۔ یعنی یہ ضروری نہیں کہ جو آدمی "جینوئن" کرسی بنالیتا ہو وہ شیر کے شکار کو بھی جایا کرے۔ ایک بار کچھ لیڈروں نے میرے "جینوئن" خیالات کی بنا پر مجھے سیاست میں گھیر کے سازش کی تھی۔ بلکہ ایک سیاسی پارٹی کا لیڈر تک بنا دینے پر تل گئی تھی۔ لیکن کچھ مدت بعد مجھے دیانت داری سے خیال ہوئے لگا کہ جینوئن خیالات سب سے بڑی حماقت ہیں یہ کتنا صمیم مگر کتنا کرب انگیز خیال ہے کہ آپ ایک جینوئن کرسی بنا سکتے ہیں مگر بنانا نہیں چاہتے۔ یا بنانا چاہتے ہیں مگر بنا نہیں سکتے۔

رہنمایان ملکت! میرے محلے اور میرے شہر میں ان گنت شفا سنگھ رہتے ہیں جنہیں اپنی اس کم نصیبی پر ناز ہے کہ وہ شیر کا شکار کرتا نہیں جانتے۔ صرف کہیں کھجور بال بچوں کو چڑیا گھر لے جاتے ہیں۔ اور شیر کو دیکھ آتے ہیں! بالکل ایسے جیسے وہ کہیں کھجور آپ کی تقریر سننے آ جاتے ہیں۔ جناب والا! جب تک دنیا میں شفا سنگھ بڑھی موجود ہے۔ شیر اور لیڈر کی عظمت کا خوف بھی موجود رہے گا۔ شفا سنگھ کی کم نصیبی اور جینوئن کرسی بنانے کی حماقت جب تک زندہ ہے اس وقت تک شیر کی طرح چڑیا گھر کے پتھرے میں بند ہے گی اور آپ کی لیڈری محفوظ رہے گی دہائیاں بجا لے گا ایک (درناور موقع)

صحابان! میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کے ماتھے پر کچھ بل آئے ہیں، کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میڈر جینیوئن بھی ہوتا ہے آپ تعجب کر سینگے کہ میں بھی اسے تسلیم کرتا ہوں۔ کیونکہ حضرات! جینیوئن ہونا — ایک تخیلی چیز ہوتا ہے۔ تخیل جانے والی بالغ حقیقت مثلاً ہٹلر اور شالین دونوں اپنے اپنے نقطہ نگاہ سے جینیوئن تھے، لیکن دونوں میں بعد المشرقین بھی تھا۔ لہذا ہر یہ بات بڑی احمقانہ لگتی ہے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ جینیوئن انس بعد المشرقین اور قرب الطرفین دونوں سانچوں میں بڑی آسانی سے ڈھل جاتی ہے۔

مگر قومی رہنماؤں مثلاً سنگھ بڑھئی کے لئے یہ بات بڑی پریشان کن ہے کہ وہ کسے جینیوئن مانے۔ کیونکہ وہ سیدھا سارا آدمی ہے۔ اسے حب بتایا جاتا ہے کہ اب ہٹلر جینیوئن نہیں رہا اور اب شالین بھی جینیوئن نہیں رہا۔ تو وہ اور اس ہو جاتا ہے۔ اور کئی کئی دن تک اپنی پیاری بیوی کا بوسہ تک نہیں لے سکتا۔ جناب عالی کہیں ایسا تو نہیں کہ دنیا میں طلاق کے جتنے واقعات ہوئے ہیں۔ وہ آپ کی دھم سے ہوئے ہیں۔ اور دنیا میں جو بڑی بڑی قومیں اور تہذیبیں فنا ہو گئیں وہ آپ کے جینیوئن ہونے کی وجہ سے فنا ہوئیں، خدا کے لئے حضرات! مثلاً سنگھ کی پریشانی ددر گنجپور اور اس کے لئے جینیوئن نس کو پرکھنے کا کوئی پیمانہ دریافت کر ڈالئے۔

کبھی کبھی مجھے شک ہوتا ہے کہ آپ جینیوئن نہیں ہیں۔ یعنی اس طرح آپ کا اور بڑھئی کا علم ایک ہی سطح پر آ جانا ہے۔ کیا آپ میں ایسے میڈر موجود نہیں ہیں جو جینیوئن کر سیاں بناتے بناتے میڈر بن گئے اور کئی اپنی جینیوئن نس کا شکار ہو کر چڑیا گھر کے بنجرے میں قید کر ڈالے گئے۔ اور اس بے بس شیر کو دیکھنے کے لئے کئی لوگ آئے لگے۔ حضرات! کیا یہ جینیوئن نس ہے کہ چڑیا گھر کے مسئلہ، بنجرے میں بند شیر کو دکھانے کے لئے دس دس پیسے ٹکٹ لگا دیں اور اس واقعے کو تاریخ کی کتابوں میں شامل کر کے اسکولوں میں پڑھا جائے۔

ملک و ملت کے پروان!

کہتے ہیں لیڈر پیدا کُنشی ہوتا ہے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ میں نے ایک ڈپٹی کمشنر دیکھا جو سا دھو سن گیا۔ مجھے شک ہوا کہ ڈپٹی کمشنر دراصل پیدا کُنشی سا دھو تھا۔ چنانچہ اس کے بعد میں نے کئی پیدا کُنشی ڈراما یور دیکھے، پیدا کُنشی پہلوان، پیدا کُنشی مہاجن۔ اس لئے مجھے یقین ہو گیا کہ دنیا کی سرچیز پیدا کُنشی ہوتی ہے۔ ہذا لیڈر بھی ضرور پیدا کُنشی ہوتا ہو گا۔ یعنی اس کا پیدا کُنشی ہونا کوئی سماجی حادثہ نہیں ہے چند دن ہو گئے میں نے اخبار میں ایک مضمون پڑھا جو ایک لیڈر کے متعلق تھا کہ وہ بھین میں اپنی چھوٹی بیٹی کو خوب چٹا کرنا تھا۔ حتیٰ کہ مضمون میں اس چھوٹی بیٹی کا ذاتی بیان بھی درج کر دیا گیا تھا۔ افسوس کہ میں مضمون پڑھ کر متاثر نہیں ہو سکا، کیونکہ میرا خیال ہے کہ قاتلوں نے فی صدی لڑکے چاہے بڑے ہو کر کلرک کیوں نہ بن جائیں اپنی چھوٹی بیٹیوں کو ضرور چٹا کرتے ہیں۔

اس لئے حضرات! آپ یقینی کیجئے کہ آپ پیدا کُنشی لیڈر ہیں اور اگر آپ میں سے کوئی اب بیکٹ فیکٹری کا بیکر بننا چاہے تو نہیں بن سکتا۔ کیونکہ قدرت نے بیکریوں کے لئے کچھ اور انسان اور سال کر رکھے ہیں۔ اس لئے اگر آپ بیکر کی جائے لیڈر بن گئے ہیں تو صرف اس لئے کہ بیکری کی صنعت کو بریادی سے بچانا مقصود تھا جناب والا! آپ فطرت کی ادھ پٹانگ طاقتوں کا شکار ہیں یہاں تک

لیڈر بننے کے لئے چنگ چڑھنا چاہئے جو سندھوستان کی قوم کا لیڈر ہے۔ اگر فلسطین میں لیڈر بننا تو بھاری فیم فلسطینی قوم کے لیڈر کو اپنا مائے ناز سمجھتے کیسے مانتے جو سندھوستان کی بجائے فلسطین میں پیدا ہوا۔ دراصل حضرات! آپ سب بے ہنگم چند ہیں۔ اور معاف کیجئے آپ کی مٹی یوں پلید ہے کہ آپ کبھی سندھوستان کے لیڈر بنائے جاتے ہیں۔ کبھی سپی کے کبھی اٹلی کے اور کبھی فرانس کے، ہر جگہ آپ کا نام بدل جاتا ہے، کام وہی رہتا ہے۔ یعنی اپنی قوم کو اٹھانا اور دوسری قوم کو گرانے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اس دنیا پر صرف درجن دو درجن بے ہنگم چند مصلط میں جو ایک دوسرے کو گرانے میں مصروف

رجتے ہیں۔

ایک مرتبہ کاؤکرے کو جرمنی کا بے ہنگم چند فرانس کے بے ہنگم چند کے ساتھ ایک میز پر ڈنر کھانے دیکھا گیا۔ ڈنر کے بعد دونوں نے مل کر فلو کھینچا یا، مل کر ایک ناچ دیکھا۔ ملکر تقریریں کیں۔ دونوں ملکوں کے قومی نژاتے بھلے گئے۔ دونوں قوموں نے باہمی کھوسیں بہپ بہپ ہرے کہا اور پھر ہاتھوں اور بہپ بہپ ہروں کی ایک فلم تیار کی گئی جو کئی مہینے چلتی رہی۔

لیکن چند سال بعد دنیا نے دیکھا کہ دونوں بے ہنگم لیڈروں نے ایک دوسرے کو دارلنگ دیدی، حملہ کر دیا۔ دونوں قومیں ایک دوسرے کا خون ٹھیٹھ کرنے لگیں حملے کی بنیاد پر بنائی گئی کہ جرمنی کے بے ہنگم چند کی بیوی کو فرانس کے ایک دکاندار نے جرابیں پہننے سے انکار کر دیا تھا۔ جس پر جرمن قوم کی سوتی ہوئی خوار میں پیدا ہو گئی اور وہ غیرت قومی کی خاطر اس غیرت قومی کی خاطر جو جرابوں کی وجہ سے نشوونما پا کر صحت مند ہو رہی تھی، جرمنی کا بے ہنگم چند حملہ کرتا۔ تو اس قوم کی بے ہنگم چند کی جرابیں انکار کر تارتا کر دیتی اور خود اسے خنجر مار مار کر ہلاک کر دیتی۔

لیڈر دوستو! کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ میں سے ہر ایک کا اعظام خنجر سے ہلاک ہونا ہے یا خود کشی ہے جو قوم آپ کی لاش کو نزدیک ماحضام سے اٹھاتی ہے وہی قوم آپ کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا کرتی ہے۔ آپ میں سے کتنے افراد ہیں جو سمندر میں پھینکے جانے کے لئے تیار ہیں۔ یہی صرف اس لئے پوچھ رہا ہوں تاکہ میں آپ کی انفرادی آزادی کی حدود معلوم کر سکوں۔

انفرادی آزادی؟ — آہ حضرات، وہ آزادی جو آپ دوسروں کو دھونسا جاتا ہے۔ خود اس سے محروم ہیں۔ ختم! آپ دہلی کے چاندنی چوک میں کھڑے ہو کر گول گئے نہیں کھا سکتے دنیا آپ کو کھانے دیکھ کر منہ میں انگلیاں دبائے گی وہ آپ کے ارد گرد کھڑی ہر جاندار کے گے گی۔

”بے ہنگم چند جی زندہ باد!“

”انقلاب زندہ باد“

بجارت مائا کی ہے۔“

اور پھر نوٹو گراؤ کر کلک کلک کرتے آگے بڑھیں گے۔ اور گول گپے کے ساتھ آپ کا نوٹو کھینچ لیں گے۔ اور ممکن ہے، اقوام آپ سے نفرت کا مطالبہ بھی کرے۔ اور آپ گول گپوں کی نیشنل انڈسٹری کے مستقبل پر لکچر دے ٹالیں۔

پیارے میڈر صاحبان! آپ آزادوں کے ایک گول گپا بھی نہیں کھا سکتے جہاں تک گول گپا کھانا ایک عام سا معمولی فعل ہے۔ بالکل ایسا فعل جیسے درزی سے کوٹ سلانا پبلک پارک میں بیٹھ کر سونگ بھلی کھانا۔ چوڑی سے پان خریدنا۔ مگر آہ آپ ان میں سے ایک معمولی کام بھی آزادی سے نہیں کر سکتے۔

مجھے ہمیشہ ریٹنولیشن رہی ہے کہ لیڈروں نے اپنی انفرادی آزادی سے محروم ہونا کیوں پسند کر لیا۔ ممکن ہے، یہ بات آپ کے لئے تسکین دہ ہو کہ انفرادی آزادی کی قربانی رائیگاں نہیں جاتی (جیسا کہ ہر قربانی کی خصلت ہے) اور اس قربانی کے عوض قوم آپ کو بہت کچھ دیتی ہے۔ مثلاً اگر آپ کو دکام ہو جائے تو روزانہ آپ کی صحت کے بیٹن شائع کرتی ہے۔ آپ کی موٹر کے راستے میں جھنڈیاں لگاتی ہے۔ تقریر کے وقت آپ کی میز پر پانی کا گلاس رکھ دیتی ہے۔ آپ کے قد آدم نوٹو اپنے گھروں میں لٹکاتی ہے جس سے آرٹسٹوں اور فریم میکرز کا بزنس ترقی کرتا ہے۔

کبھی آپ نے سوچا کہ قوم یہ سب کچھ کیوں کرتی ہے۔ کیوں کہ اس سے ان کا میڈر اپنے اصول پر ڈٹا رہتا ہے۔ جناب میڈر صاحبان! کسی دن آپ اپنے اصول کی خاطر بری قوم کی قوم کو بحرِ سندھ میں غرقاب کر سکتے ہیں۔ قوم سبھی خوشی غرقاب ہو جائے گی۔ لیکن اگر آپ نے پیپر کو رٹ کر کہہ دیا۔ تو آپ کو گولی مار دے گی۔ جناب عالی! قوم صرف آپ کی مصنوعی اور جھوٹی زندگی کو پسند کرتی ہے۔

مجھے ایک ایسے لیڈر کے متعلق معلوم ہے۔ جس نے مرنے سے چند برس پہلے مصنوعی زندگی ترک کر دی تھی۔ چنانچہ اس کی اگلی کے ساتھ صرف تین افراد

تھے۔ ایک اس کی بیوہ اور دو ارمنی اٹھانے والے اور وہ بھی کرایہ کے مزدور۔  
 اور چونکہ قادی روح اس کا گھر لے کر آئے تھے۔ جو صرف اپنی حیرت دور کرنے کے لئے ساتھ  
 ہر لیا تھا۔ اس لئے لیڈر حضرات آپ اس "حادثہ" سے فائدہ اٹھائیے اور آخری  
 سائنس تک اپنے اصول سے نہ ہٹئے۔ تاکہ کم از کم ارمنی قوجاہ و جلال کے ساتھ اٹھے  
 آپ کی موت اور جاہ و جلال کی موت ایک ساتھ نہیں ہوئی چاہیے۔ ورنہ جناب  
 ارمنی اٹھانے کے لئے کرائے کے مزدور تو ہر ایک کو مل جاتے ہیں۔

اور رہنمایان قوم! آخر میں ایک بات کہہ کر اپنی فقر ختم کرنا چاہتا ہوں۔ کہ  
 آپ اپنی پہچان کے لئے کوئی نہ کوئی سمبل ضرور بنائیجئے۔ سمبل کوئی سا بھی ہو۔ آپ  
 سے وابستہ ہو کر وہ قومی حیثیت اختیار کر جائے گا۔ مثلاً گویں نہ آپ ہمیشہ اپنے  
 ہاتھ میں ایک طوطا رکھیں۔ کہ جب بھی طوطے کا ذکر کیا جائے لوگ سر جھکا دیں  
 طوطے کی بجائے آپ حقہ رکھ سکتے ہیں۔ بانس کا ڈنڈا رکھ سکتے ہیں۔ کسی لیڈر گھٹے  
 ہوئے سر کو ہی سمبل بنا لیتے ہیں۔ ایک اور لیڈر نے شمنوں تک کوٹ پہنا شروع کر دیا  
 تھا۔ تو ٹیلر ماشروں کو لمبے کوڑوں کے لاکھوں آرڈر ملنا شروع ہو گئے تھے۔ ایک لیڈر  
 نے سیاہ قمیص کو اپنا سمبل بنا لیا تھا۔ جسے وہ مرتے دم تک نہیں اتار سکا کیونکہ قوم اسے  
 کسی اور رنگ کی قمیص پہننے ہی نہیں دیتی تھی۔

بہر کیف صاحبان! سمبل آپ کی بہتری کی بنیاد بنا سکتا ہے۔ اسے سمبل موت  
 برائے۔ اپنے اصول کی طرح۔ کیونکہ لیڈر کا اصول بھی ایک قسم کا طوطا ہوتا ہے۔ گھٹا  
 ہوا سر، بانس کا ڈنڈا، سیاہ قمیص، لمبا کوٹ — یہ سب چیزیں اگرچہ مضحکہ خیز لگتی ہیں  
 لیکن کیا کیا جائے کہ قوموں کے نصیب میں صرف لیڈر ہی نہیں بلکہ ان کی مضحکہ  
 خیزیاں بھی لکھی ہیں۔

# بیالیسواں جہنم دن

پچھلے دنوں احباب نے سازش کر کے میرا جہنم دن مٹا ڈالا۔ اس غیر ضروری تقریر پر مجھے بھی تقریر کرنے کے لئے کہا گیا۔ یہ میری زندگی پہلی تقریر یعنی جو پسند کی گئی اور اس نے پسند کی گئی کہ یہ تحریر میری تقریر یعنی۔  
تقریر یوں تھی۔

جناب صدر اور باقی ماندہ حضرات! آپ لوگ جو میرا جہنم دن مٹانے کے لئے جمع ہوئے ہیں ظاہر ہے کہ بہت عظیم لوگ ہیں۔ یہ بات میں یقین ہے کہہ رہا ہوں کیونکہ جو لوگ عظیم نہیں ہوتے وہ کبھی کسی کا جہنم دن نہیں مٹاتے جتنی کہ اپنا بھی نہیں مٹاتے۔ ایسے لوگوں میں ایک صاحب نختودصولی تھے جو پچھلے دنوں راہی ملک عدم ہو گئے۔ انھوں نے مرتے دم تک اپنا جہنم دن نہیں مٹایا کیونکہ انھیں عمر بھر سچ ہی نہ چلا کہ وہ جہنم لے چکے ہیں۔

ابھی ابھی جو صاحب تقریر کر کے گئے ہیں، آپ ان کی باتوں پر قطعی اعتبار نہ کیجئے۔ وہ میرے گہرے دوست ہیں اور گہرے دوستوں کی یہی ٹریڈ پی ہے کہ وہ صرف تقریر دیکھیں ہی کر سکتے ہیں۔ پچھلے دنوں ایک گہرے دوست سے میں نے کہہ دیا کہ تمھاری جرابوں سے سخت بدبو آ رہی ہے تو انھوں نے میرے خلاف تھاؤ میں رپورٹ لکھوا دی۔ حالانکہ بطور گہرے دوست کے میرا فرض تھا کہ ان کی جرابوں

کی تعریف کرتا۔ صاحب! بچائی اور دوستی میں اتنا بڑا فرق ہے کہ اسے مٹانا بنی آدم کے بس کا روگ نہیں۔

مجھے بتایا گیا ہے کہ میرا بیالسیواں جہنم دن ہے۔ بظاہر بیالسیواں کا ہندسہ ایک معمولی ہندسہ ہے۔ لیکن یہ ہندسہ مجھے نہایت تشویشناک محسوس ہو رہا ہے کیونکہ اس ہندسہ کا مطلب یہ ہے کہ میں اب بچ نہیں رہا۔ جو ان بھی نہیں رہا اور بڑھا چکا ابھی بہت دیر ہے۔ عمر کی عجیب منزل ہے کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ نہ مصوم نہ المظن نہ بزرگ۔ یہ عجیب بے بسی کی عمر ہے۔ مذہبی اصطلاح میں اسے عالم برزخ کہا جاتا ہے۔ جب خدا کسی روح کو نظروں سے گرا دیتا ہے تو اسے بیالسیواں میں پہنچا دیتا ہے۔

ذرا اندازہ فرمائیے کہ اب میں شیرونیوں پر پاؤں جما جا کر رکھا کروں گا ڈاکٹر محمد سے کہا کریں گے کہ آلودہ کھایا کرو بغیر کسی قیامی پینوں گا مگر شرماتا بھی رہوں گا۔ اور نیم سنجیدہ باتوں کے بارے میں سوچا کروں گا۔ مثلاً یہ کہ میں کیا ہوں اور کہاں سے آیا ہوں؟ کہاں جاؤں گا اور کب جاؤں گا؟ اور جا کر جب روٹ آؤں گا تو چیونٹی بن کر یا مہلق بن کر؟ دراصل صاحبان! آپ چیونٹی بن جائیں یا مہلق، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ انسان کا سب سے بڑا غم موت ہے اور موت ہم میں سے کوئی بھی نہیں چاہتا۔ ہم سب کسی نہ کسی شکل میں زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ چاہے شکل چیونٹی کی ہو یا مہلق کی۔ اور چونکہ ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں اس لئے ہم نے روح ایجاد کر ڈالی ہے اور اعلان کر دیا ہے کہ روح ایک لامتناہی چیز ہے۔ کہیں نہیں مرنے والی۔ اور یہ اتنی چمکیلی ہے کہ ایک چیونٹی کے اندر بھی سما جاتی ہے اور مہلق کے اندر بھی۔ صاحب صدد! روح کی ایجاد ہم انسانوں کا ایک لامتناہی کارنامہ ہے۔ جس پر خود خدا بھی سبقت حیران ہو گا!

مجھے خطرہ کہ میرا بیالسیواں جہنم دن میرے ماضی کو فنا کے گھاٹ اتار رہا ہے اور اس کی بجائے میرے مستقبل کو جہنم دے رہا ہے۔ اب میں ماضی کی قبر پر بیٹھ کر



مستقبل کی مجاہدہ میں کیا کروں گا۔ یہ ایک بڑی بے سنگم بات ہے کہ میں صرف مستقبل کا ہو کر رہ جاؤں۔ اپنی روح کا مستقبل، اپنے بچوں کا مستقبل، اپنی صحت کا مستقبل، نوع انسان کا مستقبل، مذہب، اخلاق اور راستی وغیرہ کا مستقبل صاحبان! سچ بتائیے آپ میرے ساتھ یہ کیا سلوک کرنے والے ہیں۔ ایک پریشان انسان کو کہیں مجبور کر رہے ہیں کہ وہ صبح چار بجے اٹھ کر سیر کر جایا کرے۔ پرسوں کی بات ہے لاہور کو پی ٹی وی نے رپورٹ کیا کہ ایک شخص نے ایک آدمی کے ساتھ ٹھنڈا سانس بھرا اور کہنے لگے۔

”فکر صاحب! میں حیران ہوں کہ خدا جب ایک ہے تو یہ مختلف مذہبوں والے ایک کیوں نہیں ہو جاتے؟“

تو حضرات مجھے اسی وقت شبہ ہو گیا تھا کہ لوگ مجھے سنجیدہ سمجھنے لگے ہیں چنانچہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ کس درود و کرب کے ساتھ میں نے رپورٹ کیا، ایڈووکیٹ کے سامنے تسلیم کیا کہ ”میں آپ کے ساتھ اتفاق کرتا ہوں۔“

ایڈووکیٹ صاحب کے جانے کے بعد میں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ کیا میرے جہنم کا مقصد یہ تھا کہ میں خدا کو ایک ثابت کروں؟ بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ کیا دانتی میرے جہنم کا کوئی مقصد تھا بھی؟ غالب شبہ یہ ہے کہ مقصد ضرور ہو گا۔ ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ مجھے پیدا کیا جانا!

یہاں پر خیال خواہ مخواہ ”کرم فلاسفی“ کی طرف چلا جاتا ہے۔ نہ جانے یہ فیصلہ کیوں کیا گیا کہ مجھے سہ ہندوستان میں جہنم لینا چاہئے، ممکن ہے یہ فیصلہ میرے سابقہ کرموں نے کیا ہو۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے سابقہ کرم کیا تھے۔ کیونکہ میرا حافظہ اتنا نہیں کہ پچھلے کرموں کو یاد رکھ سکوں۔ لیکن ایک عام اندازے کے مطابق وہ اچھے کرم ہوں گے کیونکہ میں نے کچھ کرموں سے ہی انسانی چلا ملتا ہے۔ مجھے اپنے گھر کے مرنے پر اکثر ترس آتا ہے کہ بے چارے کو بڑے کرموں نے مرنا بنا دیا، اگرچہ کئی بار خیال بھی آتا ہے کہ مرنا مجھ سے بہتر زندگی گزار رہا ہے۔ کیونکہ جب کسی بے گناہ کو پھانسی

کی سرِ ملحق ہے نرمی ادا اس ہر جاتا ہوں۔ لیکن مرغے پر اس پچاسی کا کوئی اثر نہیں پڑتا وہ بدستور مرغی کے ساتھ روانہ نکلا گیا بولتا رہتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ قانون مرغے نے نہیں بنائے۔ جو قانون بنائے گا وہی ادا اس ہوگا۔

میں امید کرتا ہوں کہ مرغے موجودہ جنم میں ضرور اچھے کرم کرے گا۔ تاکہ اگلے جنم میں وہ انسان بنے اور کسی بے گناہ کو پچاسی دے اور پھر ادا اس ہو جائے۔  
میرے پچھلے اچھے کرم کون سے ہوں گے؟ ممکن ہے جناب! میں نے پچھلے جنم میں کسی اندھے کو اپنی ایک آنکھ نکال کر دے دی ہو۔ کسی کی قبر پر جا کر ٹویا چلایا ہو۔ کسی دوسرے کے فائدے کی خاطر جیل کاٹی ہو۔ لیکن اس بار پوزیشن قطعی مختلف ہے اس جنم میں مجھے عینک لگوانی پڑی تھی یا رنگا بہت کے باعث بے ہوش بھی ہوا تھنے کے لئے کوئی تعین نہیں کیا تھا۔ حالانکہ ایک صاحب جو مشکل سے دستخط کر سکتے ہیں ہمیشہ پار کر بھی لگائے رہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ان میں والے صاحب نے پچھلے جنم میں اپنی ایک بھی آنکھ کسی کو نہ دی ہوگی اور اندھے کو اندھا رہنے دیا ہوگا۔ اس لئے اسے اس جنم میں پار کر بھی مل گیا۔ یہ اس لئے دورِ اندیشی کی بات کی۔ اگر کسی کو انسانیت جنم دیا جائے تو ساتھ ہی دورِ اندیشی بھی دی جائے۔ صرف اچھے کرموں ہی سے پار کر چیا نہیں ملتا۔ ممکن ہے میں نے پچھلے جنم میں کسی بدتماش امیر کی تعزیت میں کوئی قصیدہ رقم کیا ہو۔ بدتماش کی تعزیت کوئی احمق کرم نہیں ہے۔ بدتماش ہوتی ہے کہ عیب میرے کرم اچھے نہ تھے تو مجھے اتنی چولا کس بنا پر دیا گیا۔ حضرات! میں سڑ کی کرم تقیور کی کو چیلنج نہیں کر رہا۔ بلکہ صرف تقدیر کے کج کوا گاہ کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے موجودہ جنم میں کسی زحمتی چڑیا کو پانی نہیں پلایا۔ لہذا اگلے جنم میں اس کے بدلے مجھے صرف دستخط کرتا ہی سکھایا جائے اور سابقہ غلطی کو دہرایا جائے۔

میں نے بیالیس سال میں قاضی تجربات کئے ہیں۔ لیکن سب سے مشکل اور سب سے ناگوار تجربہ یہ تھا کہ انسان کو تنہائی نصیب نہیں۔ پیدا ہوتے ہی اس کی تنہائی چھین لی جاتی ہے۔ اس کی وجہ خدا ہے۔ یہ خدا کی مجبور دی ہے یا جانے کیا ہے کہ اس

نے بیک وقت بہت سی چیزیں پیدا کر دی ہیں۔ مثلاً اُس نے جھنجھنا پیدا کر دیا۔ جو آپ کے پیدا ہوتے ہی بجھنے لگتا ہے۔ آپ جھنجھنے سے الگ ہو گئے تو اچانک ایک بجلی کی آواز آئی۔ ”میاؤں!“ آپ میاؤں سے گمروئے لگتے ہیں تو ایک رومال آگے بڑھتا ہے جو آپ کے منہ پر پونچھتے لگتا ہے۔ ایک بار مجھے یاد ہے کہ نانی اچھو ہوا اور بولا۔ ”بھئی! بال کتر والو۔ ایک بار ایک کو آٹھونگ مار کر مجھے زخمی کر گیا پھر ایک بار میں تیم ہو گیا تو میری خالہ آدمکی ادبولی۔“ اب تو میرا بیٹا ہے۔ میں تجھے بن مان کے ایک دن نہیں دیکھ سکتی۔“ غرض پورے بیاسیس برس میں مجھے ایک پل بھی تنہائی نصیب نہیں ہوئی۔ جی کہ سوتے وقت جب میں قطعی تنہا ہوتا ہوں تو غصہ میں کوئی دیوا جاتا ہے اور میری گردن مروڑنے لگتا ہے۔ کوئی پرہی آجاتی ہے جو مجھے اعضا کا سامان کی طرف سے جانتی ہے۔ یہ ساری صورتِ حالات نہایت ناگوار ہے۔ نہ جانے لوگوں کو یہ کیوں معلوم ہو جاتا ہے کہ میں پیدا ہو چکا ہوں۔ ایک سائنسدان نے مجھے بتایا کہ دراصل یہ ایٹم کی فطرت ہے کہ جنہی ایک ایٹم پیدا ہوا، دوسرا ایٹم اس کا نقاب کرتے لگتا ہے۔ آپ انسان سمجھتے ہیں تو سمجھتے نہیں رہ سکتے لہذا پکڑا آپ کا نقاب کرتا ہے۔ پکڑے کا نقاب درزی کرتا ہے اور درزی کا نقاب اس کی بیوی کرتی ہے۔ بیوی کا نقاب اس کے بھوکے ننگے بچے کرتے ہیں۔ غرض ہر ایٹم دوسرے ایٹم کے نقاب میں ہے۔ صاحبان! میں آپ کو ساکسن کا سبق نہیں دے رہا بلکہ صرف اپنے ذاتی ایٹم کا دکھ بیان کر رہا ہوں کہ جتنی کسی ایٹم کو نہیں ملتی۔ مجھے درزی کا بل دینے پر ہرگز اعزاز نہیں ہے۔ لیکن وہ درزی مجھے شرمی مانتا ہے جو ناشائستہ حرکت ہے۔ اگر درزی کے بچے کے پاس نیکر نہیں ہے تو یہ ٹیکسٹائل ملوں کا فرض ہے کہ اسے نیکر جیسا کرے۔ آخر بے نیکر بچے مجھے کیوں مجبور کرتے ہیں کہ ہمارے تن کی عریانی پر مضمون لکھوں۔

میں کسی کبھی سوچتا ہوں اگر ایک ایٹم دوسرے ایٹم سے جدا ہو جائے تو کیا ہر ہر ایٹم اپنی الگ زندگی گزارنے لگے۔ جیسے قبر میں ہر مردہ الگ الگ پڑا رہتا ہے

بے نیکنہی کی الگ قبر ہو۔ میری مضمون نگاری کی الگ قبر ہو۔ اور ایک قبر دوسری قبر سے واسطہ نہ رکھے تو؟ مگر آہ ایسا کبھی ہوتا نہیں اور تنہائی کبھی ملتی نہیں۔ میں نے کئی بار مالیہ پرست پر جا کر قیسوی بننے کا بھی ارادہ کیا لیکن شک ہے کہ وہاں خدا موجود ہوگا۔ اور تنہائی وہاں بھی نصیب نہیں ہوگی۔

اور زندگی میں دوسرا نسخہ تجزیہ مجھے یہ ہوا کہ موت آسان نہیں۔ حالانکہ بیاضی سال کے فوراً بعد موت کو آجاتا چاہیے۔

یہ ایک بے لوث نکل بات ہے کہ ہر انسان کی موت کا وقت مقرر ہے۔ منطق اعتبار سے یہ غلط سسٹم ہے۔ مثلاً ماہرین عمر کی رائے ہے کہ پچاسی برس سے پہلے مجھے موت نہیں آئے گی۔ میری ماں دعا مانگا کرتی تھی کہ تم سو سال تک جیو۔ ایک صاحب کھیلے دس برسوں سے مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ اگر تم سگرٹ پیٹ اور پان کا استعمال ترک کر دو تو تمہاری عمر لمبی ہو سکتی ہے مجھے یہ سب کچھ ایک بے لطف لالچ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ بیالیس برس زندہ رہ کر میں نے جو کچھ دیکھ لیا ہے وہ کاتی ہے اب میری بیالیس سال زندہ رہنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ کیونکہ اگر میں زندہ رہا تو آئندہ بھی وہی دیکھوں گا۔ جو کچھ چکا ہوں۔ اگر کوئی آدمی مجھ سے وعدہ کرے کہ وہ باقی عمر میں مجھے ایک ایسا مرغاد دکھائے گا جو بانگ نہ دیتا ہو تو میں مزید بیالیس سال زندہ رہنے کے لئے تیار ہوں وہ بیالیس عمر اس وقت لے سگرٹ کی طرح ہے جسے چیتے چیتے جڑے تک جاتے ہیں۔ دراصل لمبی عمر کی خواہش نے انسان کو بری طرح بھکا دیا ہے اور وہ غیر فطری حرکتیں کرتے کرتے زندگی کی خاموش لذت سے محروم ہو گیا ہے۔ مثلاً ایک صاحب لمبی عمر پانے کے لئے ہر روز صبح اڑھائی گھنٹے سیر کرتے ہیں۔ یعنی عمر کا خاصا حصہ سیر میں ضائع کئے جا رہے ہیں اور ایک اور صاحب عمر بھر پیدل چلتے رہے حالانکہ اگر وہ گھوڑے موٹر یا ریل پر سوار ہو کرتے تو زیادہ لذت اٹھاتے۔ ایک بڑے بوڑھے سے ملاقات ہوئی۔ فخر سے کہنے لگے۔ میں اب بھی داغوں سے کاٹھا ہوں توڑ سکتا ہوں۔ یعنی وہ صرف با دام کھانے کے لئے سو سال تک زندہ رہنا چاہتے ہیں

حالانکہ بادام اگر پتھر سے تڑے جائیں تو بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔ ایک اور حساب  
ہیں وہ خدمتِ خلق کے لئے زیادہ دیر تک زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ  
اگر چار پانچ سال خدمتِ خلق کر لی جائے تو اس میں زیادہ لذت ہے تاکہ اس  
کے بعد کسی اور آدمی کو خدمتِ خلق کا موقع دیا جائے۔

میرا خیال ہے یہ سب زندہ رہنے کی چالبازیاں ہیں اور انہیں چالبازوں  
کا نتیجہ ہے کہ موت آسان نہیں رہی۔ لوگ یا تو مرنے میں نہیں آتے یا جب مرنے  
پر آتے ہیں تو اٹھ سو سال کا معصوم تجھ بھی مر جانا ہے جسے اتنا بھی علم نہیں ہوتا  
کہ حسینہ کے ہر منٹوں میں کشش کیوں ہوتی ہے اور میلی بجنوں کی ٹریچڈری کیوں وجہ  
میں آتی تھی۔

اسی لئے حضرات! میری غرض یہ ہے کہ حسینہ کے لبوں کا اندازہ لگائے  
کے بعد انسان کو مر جانا چاہئے، لیکن اس بچہ کو نہیں مرننا چاہیے۔ جو ابھی اپنا نام لکھنے  
کی لذت سے بھی آگاہ نہیں اس کے علاوہ عمر کو لمبا کرنے کے جتنے طریقے ہیں انہیں  
بند کر دینا چاہئے تاکہ زندگی بھی آسان ہو جائے اور موت بھی حادثہ نہ رہے۔ لیکن  
جب مجھے خیال آتا ہے کہ مجھے مزید تین یا بیس برس زندہ رہنا ہے تو جی چاہتا ہے کہ طب  
مینا رہ جا کر چھلانگ لگا دوں۔ لیکن اب تو دماغ بھی لوہے کا جنگلا لگا دیا ہے  
لہذا میرا مرننا مشکل ہے، کیونکہ مسئلہ جس کو راکھے سائیاں مار سکے نہ کہ سکے۔

جناب صدر! وہاں حاضرین! اب میں اپنی تقریر ختم کرنے لگا ہوں۔ کیونکہ  
مبنی باتیں میری پاس تھیں وہ سب ختم ہو چکیں۔ یہ باتیں بیالیس سال کی زندگی  
کا پتھر ہیں۔ آپ شاید چاہیں گے کہ میں کچھ اور فروغی باتیں بھی کروں جن سے دنیا کو فائدہ  
ہو۔ لیکن میرا خیال ہے کہ بھیلی گئی نسلوں سے فروغی  
باتیں ابھی جا رہی ہیں۔ لیکن دنیا کو ان سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ چونکہ رفاہ عام کی  
عادت ہم انہوں میں عام ہے۔ اس لئے آخر میں چند چیزوں کے بارے میں صریح عرض  
کروں گا کہ میرا کیا دماغ ہے۔

مثال کے طور پر میں نے ان بیالیس برسوں میں محسوس کیا ہے کہ کوئے کا میں کامیں کرتے ہیں۔ گندھے اتنے بیوقوف نہیں ہوتے جتنے سمجھے جاتے ہیں۔ اسی کسی کے باپ کی میراث نہیں۔ پتنگے روشنی پر مرتے ہیں۔ لیکن انسان کن جان کھا جاتے ہیں۔ گیند کو معلوم ہے کہ شہر میں اس کے کھانے اور رہنے کا کوئی بندوبست نہیں۔ اور گائے اگر شہر کا یا کھانا کر کے جنگلوں میں سکونت اختیار کرے تو وہ بھی اتنی ہی خوفناک ہو سکتی ہے جتنا شیر اور بھڑیا۔

صاحبان! ان بیالیس برسوں میں مجھے صرف ایک بات کی سمجھ نہیں آئی، بعض جانور انسان کے اتنے قریب کیوں آگئے ہیں۔ اور بعض جانور انسان سے اتنی دور کیوں چلے گئے ہیں۔ کیا ان میں اب بھی مفاہمت کی کوئی صورت نکل سکتی ہے یا دائمی بھڑ ہے؟

# کچھ اپنی کچھ پرانی

اپنے پر کر رہا ہوں گماں اہل دہر کا  
سمجھا ہوں دلپذیر متاع مہنر کوہیں

# گمشدہ کی تلاش

یہ اشتہار میں اپنے گم شدہ بھائی اچنتا منی کے متعلق دے رہا ہوں موصوف ایک مرتبہ پہلے بھی گم ہو گئے تھے، لیکن اس وقت میں نے اشتہار نہیں دیا تھا۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ موصوف خود وارا آدمی ہے۔ اس لئے اس نے حنر درگمزمی میں جھپلائی گکا دی ہوگی، لیکن جھپٹے دن وہ میلی چمکٹ پتلون کے ساتھ گھروٹ آیا اور نقیوں ہمار چپکے "آخر تر ہمارا ہی خون تھا کیوں نہ لوٹا خون نے جوش مارا ہوگا۔"

میشہ اجلی پتلون پہننے والا کب تک گھر سے باہر نہ سکتا تھا، خودی چاہے کتنی ہی بلند ہو جائے پتلون کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

مگر اس بار مجھے یقین ہے کہ موصوف لوٹ کر نہیں آئے گا۔ کیونکہ وہ گھر سے دوسو روپے اٹھا کرے گیا ہے۔ اس لئے اب اس کی رگوں میں ہمارا خون جو شش نہیں مارے گا۔ اشتہار دینے کی ایک اور وجہ والدہ محترمہ میں جو موصوف کو ابھی تک نادان لڑکا "گروان رہی ہیں، میں نے لاکھ کہا کہ مادر مہریان اچنتا منی اس میں برس کا ہو چکا ہے نادان نہیں رہا۔ وہ چہرے مہرے سے ہی گدھا دکھائی دیتا ہے مگر اندر سے کافی کاسیاں ہو چکا ہے۔"

مگر والدہ محترمہ جس نے اس گدھے کو جنم دیا اپنی تخلیق پر زیادہ مستند رہے کتنی ہیں۔ اس نے مجھے طعنہ دیا۔



”در اصل تم چھوٹے سبائی کی غیر حاضری میں ساری آبائی جائیداد کو تنہا ہٹا کر پکڑنا چاہتے ہو۔“

ہماری آبائی جائیداد دو کمروں والا ایک مکان ہے جو ہم نے گھرانے پر لے رکھا ہے یا پھر والد محترم کے قبضہ میں ایک ہی کھاتا ہے جس میں درج ہے کہ ہمارے خاندان کے پاس ٹریڈ سوائیکٹزمینا ہے جس پر آج کل ایک دریا بہہ رہا ہے۔ والد محترم غزشتہ گیارہ برس سے اس دریا کے سونگھنے کا انتظار کر رہے ہیں۔

اگرچہ والدہ محترمہ کے طعنہ کی بنیادیں دریا بروٹھ چکی ہیں لیکن پھر بھی ایک فرمانبردار فرزند کے طور پر میں یہ اشتہار دینے پر مجبور ہوا ہوں۔

برادر عزیز چنتا منی کی تصویر مجھے نہیں مل سکی ورنہ اس اشتہار کے ساتھ ضرور چھپواتا۔ دراصل اس کے چھٹے فوٹو تھے وہ اس نے اپنی ذاتاً فوتاً ختم کی محبوباؤں میں بانٹ دیے تھے۔ پوچھنے پر چنتا منی کی ہر محبوبہ نے حجاب دیا کہ اس کے پاس چنتا منی کی فوٹو تھیں، وہ اس نے رسوائی کے خوف سے حجاب کر دی ہے۔ ایک محبوبہ تو اتنی صاف گوشت کی کہ اس نے تنک کر حجاب کیا۔

”میں نے شادی ہونے ہی چنتا منی کی وہ فوٹو شادی تھی اور آج کل بیٹوں میں اپنے خاوند کا فوٹو رکھتی ہوں۔“

چنانچہ فوٹو دستیاب نہ ہونے کے باعث مجبوراً میں اپنا ہی فوٹو اس اشتہار کے ساتھ شائع کر رہا ہوں۔ اس کے باوجود گم شدہ میرے سبائی کو سمجھا جائے مجھے نہیں یاد۔

والد اور والدہ محترمہ دونوں کی متفقہ رائے ہے کہ چنتا منی کی ناک تم سے ملتی ہے۔ اس نے پہچاننے میں آسانی رہے گی۔ ہمارے ناما مرحوم کی ناک بھی تم دونوں کے درمیان سے ملتی تھی اور وہ بھی گھر سے ہوا گئے تھے (عجیب ناک ہے ناما کے وقت سے کٹ رہی ہے) یہ کہیں فوٹو میں میری ناک حاضری ہے۔ ناک کے علاوہ میرے چہرے، اعضا، یہ وہ میرے ذاتی ہیں۔ برادر عزیز چنتا منی کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

برادر مرصوف چٹنامنی کے باقی ناک نقشہ کے متعلق پڑھ لیتا یہ ہے کلاس کا رنگ بچپن میں دودھ کی طرح گورا تھا (ان دنوں وہ صرف ماں کا دودھ پیا کرتا تھا) لڑکپن میں وہ دودھ پیا رنگ گدھی ہوتا گیا۔ کیونکہ اس نے گندم کھانا شروع کر دی تھی۔ جوان ہوتے ہی رنگ کامیلا سیاہی کی طرف ہو گیا۔ نہ جانے جوانی میں چورسی جیسے اس نے کیا کھانا شروع کر دیا تھا۔ البتہ حب والد محترم اسے ہیبت ناک قسم کی گالیاں اور بھکیاں دیا کرتے تو لمحہ بھر کے لئے اس کا رنگ ہلکا بھی پڑ جاتا تھا۔ گویا چٹنامنی بڑا رنگا رنگ آدمی تھا (خدا اسے ہر رنگ میں خوش رکھے)

آنکھیں بڑی بڑی مگر گونگی قسم کی۔ جیسے کوئی حسینہ فیروز کے برہ ہو گئی ہو۔ کبھی بار میں نے اسے مشورہ دیا۔

ارے بچلے! ان پر کالہ چشمہ لگالے۔ بات سن جائے گی۔

مگر وہ نہیں مانتا۔ ایک بار میں نے اپنی بیوی کی آنکھ بچی کر اپنا چشمہ اسے دے بھی دیا۔ مگر وہ اس نے ایک دوست کو دے دیا۔ دوست نوازی میں تو دیکھ مثال تھا۔

والد محترم اسے دوست نوازی پر ہمیشہ چٹری سے پٹیا کرتے تھے۔ اور اس پٹائی کو وہ کمال صبر و شکر سے سہہ لیتا تھا۔ صبر و شکر میں بھی بے مثال تھا۔ والد محترم نہایت فخر سے کہا کرتے تھے کہ میں نے اپنی زندگی میں صرف ایک ہی شریف اور صابر لڑکا پیدا کیا ہے اور وہ چٹنامنی ہے۔ بزرگوں کے سلسلے چل تک نہیں کرتا۔ آہ اس کے بھاگنے کے بعد اب ان بزرگوں کی چٹری کس کام نہیں آ رہی

چٹنامنی کی پٹائی ہر ایک دانہ ہے۔ ایک بار وہ چھت پر کھڑا ایک لڑکی کو گھور رہا تھا۔ لڑکی نکورہ نے جواباً ایک اینٹ دے دی۔ اگرچہ چٹنامنی نے اس خفت محبت کا ذکر کسی سے نہیں کیا۔ مگر بعد میں اس کا شکریہ اپنی سیلیوں سے ذکر کر دیا تو باپ باپ پل گویا۔ اور اس ڈانڈے

علاج کا بل ایک دم یہ بھکر بڑھا دیا کہ اینٹ کا رستم زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔  
 چنتا منی کے جسم کے باقی حصے صحیح سلامت ہیں۔ وہ ایک مضبوط الخیز لڑکا ہے۔  
 غلہ منڈی میں لہریاں اٹھانے کا کام کر رہا ہو۔ اور منڈی کے بیوپاری اسے نہایت  
 قلیل اجرت دے رہے ہوں۔ کیونکہ چنتا منی کو بھانڈا کو کرنا نہیں آتا۔ اسے  
 کچھ نہیں نہیں آتا۔ سواکے خاموش رہنے کے۔ سواکے ستم سہنے کے۔ مگر میں بیوپاریوں  
 کو مشورہ دوں گا کہ وہ اس ستم بند کی کا زیادہ اسفصال نہ کریں ورنہ وہ ان کے  
 ہاں سے بھی بھاگ جائے گا۔ کیونکہ بھاگنے کے لئے اس کے پاس پاؤں موجود ہیں  
 چنتا منی کی زبان کام نہیں کرتی پاؤں کام کرتے ہیں۔

چنتا منی جب گھر سے بھاگا تو اس کے تین پرصرت تین کپڑے تھے۔ ایک  
 تیلون (جو میری بھتیجی) ایک دھاری دار قمیص جس سے وہ بے حد نفرت کرتا تھا۔  
 مگر پھر بھی پہنے پھرتا تھا۔ اور ایک بنیان جو اس نے بڑے چاؤ سے خریدی تھی یہ بنیانی بھی  
 اسی والد صاحب سے ہی پہن لیا کرتے تھے۔ چرہ نہیں فٹ نہیں آتی تھی مگر وہ کہا کرتے تھے  
 کہ اگر باپ اپنے بیٹے کا بنیان پہنے لے تو دونوں کا محبت کا رشتہ استوار ہوتا ہے جس  
 دن چنتا منی بھاگا، اس دن رشتہ استوار کرنے کی یاری چنتا منی کی بھتیجی اس لئے بنیان  
 بھی اسی کے بدن پر کھتی (اور والد صاحب اس بنیان کے لئے زار و قطار روتے رہتے  
 ہیں اور کہتے ہیں کاش! یہ بنیان میرے پاس ہوتی تو میں اسے آنکھوں سے لگا کر  
 تسکین حاصل کر لیا۔

چنتا منی کیوں بھاگا؟ اس کے متعلق مورخین کی آراء میں شدید اختلاف پایا  
 جاتا ہے۔ والد محترم یعنی ابو الچنتا منی کا خیال ہے کہ بھوکا شادی کا خواہش مند تھا  
 مگر اسے دور و دراز تک شادی کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے تھے مگر  
 ہم الچنتا منی یعنی چچا جان اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ چنتا  
 سرے سے شادی سسٹم کے ہی خلاف تھا اور برہمن چریہ میں یقین رکھتا تھا۔ اس کے

علاوہ وہ ایک دوسرا راز بھی پوچھنا مالک تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی دو بہنیں ابھی تک کنواری بھیٹی ہیں۔ یعنی برہمن چریہ کے لئے اس کے پاس ٹھوس وجہ وجود ملتی ہے۔ تیسرے مورخ اعظم اچنٹا منی یعنی والدہ محترمہ کی رائے چچا جان کے کسی حد تک ملتی ہے صرف اس تنظیم کے ساتھ کہ بہو (یعنی میری نو بھلے) ہی اسے یہاں سے فرار ہونے میں مدد دے گا ہے۔

خود بہو بھی اس قسم کی ایک الگ رائے رکھتی ہے۔ یعنی جو ساس کہے اس کے الٹ۔

اشتہار دینے سے دو دن پہلے مورخین میں ایک خوفناک نقلی جنگ ہوئی تھی لے والد محترم پر الزام لگایا کہ آپ نے ہی جنتا منی کو بگاڑ دیا تھا اور اسے ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے کہ

”اے محسوس اکب تک بڑے عباتی کے ٹکڑوں پر پتا رہے گا اپنے پاؤں پر کڑا ہوتا سیکھ“

اور اس طرح آپ نے وہ لہجوں کے درمیان نفرت کی بیج حائل کر دی تھی۔ اس پر والدہ محترمہ میری مدد کو آئیں اور لیں۔

”اس بڑے کا شروع سے ہی یہی طریقہ رہا ہے۔ یہ سب ہی نقلی کر اس بڑے کے ساتھ تیس سال کا لگئی اڑھائیڑھ آئینہ بھی ایک ساتھ زندگی کاٹنے کا ارادہ رکھتے ہیں، یہ سن کر ہماری بڑی بیٹی جو ایک اسکول کی اساتذہ ہے، باپ کی حمایت پر اتر آئی“

اور بول

”جی بیا فرماتے ہیں کہ آج ڈیموکریسی کا زمانہ ہے ملک میں صنعتی ارتقاء ہو رہا ہے اس لئے پرانے طریقے کے مشترکہ خاندان کا ڈھانچہ قائم رکھنا درست ہے۔ ایک نوجوان لڑکے کو مجبور کرنا کہ وہ مشترکہ کپتے کی جگہ بندوں میں رہے عاقبت نااندیشی ہے۔ جی جی ٹھیک کہتے ہیں۔ دلش کے ہر نوجوان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہئے۔ اور میں تو کہتی ہوں جنتا منی اس ملک کا پہلا باغی ہے جو قدامت کی زنجیر توڑنا شروع کر چلا گیا۔ سب سب ہرے۔“

بڑی بہن ماڈرن فیشن رکھتی ہے۔ وہ ماڈرن اور قدیم زمانے کے درمیان  
 ٹنکی ہوئی اچھی تک کنواڈی بیٹھی ہے۔ اور شاید وہ اسی طرح سائنٹفک بنیادوں  
 پر پھر شادی نہ کرے۔ اگرچہ میں نے اس کا تکیہ کئی بار آنسوؤں سے بھیجا ہوا دیکھا  
 ہے۔ مگر آنسوؤں کے یا درجہ وہ صنعتی ارتقا کا دامن نہیں چھوڑتی۔ اس نے کئی  
 امیدواروں کے ساتھ منگنی کرنے سے اس لئے انکار کر دیا کیونکہ وہ صنعتی ارتقا  
 میں ادھورا یقین رکھتے تھے۔

بڑی بہن کی یہ بات سن کر والدہ محترمہ بھڑک اٹھیں اور دیوار کی طرف منہ  
 کر کے بولیں۔

”یہ بہن بے یا ڈاسن! چار لفظ پڑھ گئی تو اپنے بھتیجا سے بیا کرنا چھوڑ بیٹھی۔“  
 والدہ محترمہ نے یہ الفاظ اس اخطا سے کہے تاکہ بڑی بہن کے کان میں  
 نہ پڑیں۔ کیونکہ بڑی بہن اپنی بیشتر تنخواہ کنبے پر خرچ کرتی ہیں۔ لیکن چھوٹی بہن شیطان  
 ہے۔ اس نے یہ الفاظ بھی سن لئے۔ اور بولی۔

”ماں! کیا بہن بھائی کی محبت کا شور مچائے جا رہی ہو۔ بہن کس سے محبت  
 کرے؟ خیتامنی سے؟ جس نے فقروں کا س میں میٹرک پاس کی تھی۔ میں کہتی ہوں  
 یاد ہے وہ وقت جب خیتامنی کو کالج میں داخل کرنے کا سوال اٹھا تھا، تو اسی  
 بڑی بہن نے جو آج بڑے چڑھ کر اسے باہی سپرد بنا رہی ہے اس کے کالج کا خرچہ  
 اٹھانے کی شہیدہ مخالفت کی تھی۔ اور تم نے بھی کہا تھا کہ اسے کریانہ  
 کی دوکان کھول دو۔“

سہارمی یہ بہن خود بھی میٹرک میں فیل ہو گئی تھی اور اب سلائی مشین کا کام سیکھ  
 رہی ہے۔ مورخین کی اس جگہ کے بعد فریقا بہن نے اعلان کر دیا کہ وہ چھوٹی بہن کے  
 سلائی اسکول کی فیس ادا نہیں کرے گی۔ لہذا اس کی فوراً شادی کرادو  
 تھامین! مجھے امتحان افسوس ہے کہ خیتامنی کی خاطر مجھے اپنے کنبہ کی اندر  
 حالت ظاہر کرنا پڑی اور باعزت کنبے کے لئے یہ ڈوب مرگ کا مقام ہے۔ لیکن

یہ ماہر منظر دے بغیر چٹنامنی کی تلاش ناممکن ہے، بہر کیف مورخین کے ان شدید اختلافات کی وجہ تو اس وقت سے کہنا ناممکن ہے کہ چٹنامنی کیوں بھیجا گیا؟ بیکاری، بیزاری، گنہگار، کندہ سنی، پٹائی، ڈیموکرسی، صنعتی ارتقاء، برہم چربہ خرابائی، بے وقوفی۔ ان میں سے کوئی ایک وجہ بھی ہو سکتی ہے یا ساری وجہیں بھی ہو سکتی ہیں۔ شاید چٹنامنی ان تمام وجہوں کو اپنے ذہن میں پائتا رہ رہا تھا اور اس دن یہ تمام وجہیں منزل مقصود کو پہنچ گئیں جب اچانک دوسروں نے اس کے ہاتھ لگ گئے۔

یہ دوسروں نے میرے ایک دوست کی امانت تھی اور اب اس نے مجھ پر مقدمہ کر رکھا ہے۔

عزیز چٹنامنی کی تلاش میں ہم نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ریلوے اسٹیشنوں پر ڈھونڈا، جیل خانے چھلنے، جوتے خانوں میں گئے، فلم کمپنیوں سے پوچھا۔ میری ماں درختوں سے پوچھتی پھری۔ والد محترم نے مختلف ریل گاڑیوں پر سفر کیا۔ لیکن چٹنامنی جیسے ایک خدا تھا کہ کہیں نہیں ملا۔

تھک ہار کر ہم نے جیوتیشیوں اور نجومیوں کا رخ کیا۔ ایک نجومی نے بتایا کہ وہ مشرق کو گیا ہے دوسرے نے کہا، شمال کی طرف گیا ہے۔ ہم دونوں سمتوں میں گئے کیونکہ ہم نے دونوں کو فیس ادا کی تھی۔ ایک اور جیوتیشی نے بتایا کہ ایک کتابھی اس کے ساتھ ہے۔ ہم نے یہ بات بھی مان لی کیونکہ ہمارے محل کا ایک کتابھی اسی دن سے غائب ہے، جس دن سے چٹنامنی۔ زچلنے کتے کو کیا سوچیں کہ ہباگ گیا۔ حالانکہ اس محلے میں وہ بڑے ناز و نعم سے زندگی گزار رہا تھا۔ والد محترم کا خیال ہے کہ کتابھی وہاں جا رہا ہو۔ ضرور اس کے ساتھ گیا ہو گا۔ مگر چچا جان کا بیان ہے کہ کتے کو کھینچی والے دھرم دیکر گھسیٹ لے گئے ہیں۔

ایک جیوتیشی نے ہیں ایک منتر پڑھ کر دیا اور کہا کہ اسے آدھی رات کے بعد کسی قبرستان میں دفن کر آؤ۔ اس منتر کی طاقت سے چٹنامنی گھنچا چلا آئے گا۔

چنانچہ میں ایک ڈاکو کو ہمراہ لے کر قبرستان میں اس منتر کو دفن کر آیا (یعنی ڈاکو بڑے انسان دوست ہوتے ہیں) لیکن چنتا منی پر اس منتر کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بعد میں جیو تیشی مذکور سے پوچھے پر پتہ چلا کہ اس منتر کے دو قسم کے اثر ہوتے ہیں۔

میرا ایک : بھگڈا مضطرب ہو کر گھر لوٹ آتا ہے۔

میرا دو : بھگڈا تنگ آکر خودکشی کر لیتا ہے۔

شاید چنتا منی پر دوسرا اثر ہوا۔ مگر ہمارے چنتا منی ! شہادی ماں یہ ماننے

پر تیار ہی نہیں ہوتی۔

ایک خدا رسیدہ پاگل عورت نے جس کے اندر کالی دیوی کا نوا اس ہے اور جو ہر مشکوٰۃ کو بال کھول کر کھینچتا ہے یہ بتایا کہ لڑکا زندہ ہے۔ مگر اس کے منی پر بوجھ ہے۔ اس بوجھ کا انار اکر واد رکالی گتیا کو ہر روز کا بے باجرہ کی روٹی اور سفید مکھن کی ٹکیہ کھلایا کرو۔ چنانچہ یہ حرام خور گتیا گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ہمارے ہاں گھبرے اڑا رہی ہے۔ اور کھا کھا کے سارے محلہ پر بھونکتی رہتی ہے۔ مگر احتراماً کوئی زبان تک نہیں ہلاتا۔

اشہاد ختم کرنے سے پہلے ایک طوطے کا ذکر حالی اردو پس نہیں رہے گا کہ ایک ماہر نجوم کی ہدایت پر ہم نے بازار سے ایک طوطا خریدا۔ آج کل گم شدہ گویوں کی وارداتیں زیادہ ہونے کے باعث طوطوں کا سمناؤ بے حد بڑھ گیا ہے۔ بلکہ اعلیٰ النسل کے طوطے تو ملنے ہی نہیں (ایک میں مل جاتے ہیں) اور صرف بیچنے پر طوطے ہی باقی رہ گئے ہیں۔ چنانچہ ہم نے پندرہ روپے میں ایک محبوب قسم کا طوطا خریدا۔ اسے پھیل اور میوے کھلا کھلا کر اڑانے کے قابل بنایا۔ اور پھر مندرجہ ذیل چشتی پر اس ماہر نجوم نے پھونک ماری اور طوطے کے گلے میں یا ندھ دی جیٹھی یوں بھتی۔

اڑ جا طوطے، کھا کر غوطے، واہ رے تیرے بل بوتے

چنتا منی سے جا کر کہہ دے ارے سب ہیں روئے

تیرے سارے ہونے موتے۔

ٹوٹے کر دوڑ خنکلی میں سے جا کر فضا میں اڑا دیا اور مصلحت ہو کر گھر لوٹ آئے۔ گھر لوٹے تو  
 طوطا بھر گھر میں موجود۔ ہم نے پوچھا: "میاں سٹو! کیا ہوا؟"  
 وہ بولا: "بستہ کھاؤں، لپتہ کھاؤں۔"

ہم نے اس نابکار کو مزید لپتہ کھلاتا مناسب نہ سمجھا اور تنگ آ کر اس بے وقاف  
 جانور کو ماسی طوطا فروزش کے ہاں آدمی دام پر واپس دے آئے۔

خارجی کرام، ہماری یہ تمام کوششیں ظاہر کرتی ہیں کہ جتنا منی ہمیں کتنا عزیز ہے  
 اس لئے ملک بھر کے تمام بیہن بھائیوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اگر جتنا منی کو کہیں دیکھیں  
 تو سیدھے ہمارے ہاں آئے آئیں، خدمت خلق کا تقاضہ تو یہ ہے کہ یہ کام مفت کیا  
 جائے، لیکن زمانہ چونکہ صنعتی ارتقا کا ہے، اس لئے خدمت خلق کا تقاضا واجب  
 معلوم نہیں ہوتا، لہذا ہم بطور مبالغہ کچھ گپت دان ضرور پیش کریں گے، آئے عیادت  
 کا کرایہ بھی دیں گے، بشرطیکہ سفر نفرد کلاس میں کیا جائے۔

اور جتنا منی خود اس اشتہار کو پڑھے تو گھر چلا آئے، میں یہ کہہ کر جتنا منی کو پریشان  
 نہیں کرنا چاہتا کہ اس کی ماں بستر مرگ پر پڑی ہے، یا والد محترم نے کھانا پینا ترک کر کے کھا  
 ہے۔ نہیں یہاں سب خیریت ہے، سارے کنبہ کی حالت بدستور اچھی ہے، والد  
 صاحب کو کھانا بدستور پہنچ رہا ہے، ماں بھی پڑوسنوں سے ہر روز ملتی ہے، اس  
 لئے جتنا منی کو یہ خوف ہو کر گھبرا جانا جائے تاکہ کم از کم ہم اس کا لکتیا کو تو گھر سے  
 باہر نکال سکیں۔ "جتنا منی جلدی آؤ بھیا! ورنہ وہ اگر دو سو روپے سارے کے سارے  
 خرچ ہو گئے تو تمہارے واپس آئے ہکا کوئی فائدہ نہ رہے گا۔"



# فکر تو نسوی نے الیکشن لڑا

الیکشن مار جانے کے بعد فکر تو نسوی صاحب اچانک غائب ہو گئے ہیں۔ ان کی گرم شنگ کے متعلق طرح طرح کی افواہیں اڑ رہی ہیں۔ کوئی کہتا ہے دریا کے کنارے میں ٹوٹ کر مرے کسی نے کہا ہیں۔ :- انھیں بہا لہیہ کی طرف جگ ٹٹ بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا ایک صاحب نے بتایا کہ وہ لاہور ٹرولر کے اسٹیشن پر بمبیک مانگ رہے تھے اور زار و قطار رو بھی رہے تھے۔

ایک قمر بن خواہ حبیب ان کا سامان قرن کرانے پہنچا تو تلاشی کے دوران ان کا ایک مضمون بھی ملا جو انھیں دسوا کرتے کے لئے ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے۔

اچانک میرے بارے میں افواہ پھیل گئی کہ میں الیکشن لڑ رہا ہوں۔ یہ افواہ سن کر میرے سر پر میری بیوی کو مانتی نار بھیجا۔ کافی ہاؤس میں میرے دو دوستوں نے ایک دوسرے کو زخمی کر دیا۔ ایک چور نے ٹیلیفون پر مجھ سے شکایت کی ہم تو تھیں تھیں مگر فقارے گھر نقب نہیں لگاتے تھے۔ اب یہ الیکشن کے لئے روپیہ کہاں سے آگیا۔ میرے ایک مخالفت امیدوار نے ایک ایرجینیس ٹینک لٹائی کہ محلے کے اس واحد پبلے آدمی کو روکا جائے اور اگر نہ مائے خواہ سے اعزا کر لیا جائے۔

در حقیقت ہماریوں کہ جب ملک میں عام چناؤ کی جرح چا علی تو مجھے شرارت سوجھی کہ مندر کے مہنت و تحفظ اور اس کو چناؤ لڑنے پر اکسایا جائے کیونکہ ایک تو اس کے

پاس چڑھا دے کے ہزاروں روپے وافر پڑے تھے جنہیں ختم کرنا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ اس کا ٹول مطالعہ ایک نگارامان اور بھجنوں کے سستے انڈیشا والی کتاب سے آگے نہ بڑھا تھا۔ اسے کامیاب بنا کر میں یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ مہاراجا پارلیمنٹری جمہوریت کس حد تک مگر سکتا ہے۔ اس نے سسے لے کہا: "جہنت جی ملک کی جمہوریت خطرے میں ہے، اسے بچانے کے لئے آپ چن کر لیجئے!"

جہنت یولا: "ہی ہی ہی!"

میں نے کہا: "ہی ہی کا کیا مطلب۔"

"مطلب یہ کہ آپ مجھے مشر مندہ کر رہے ہیں۔"

"مشر مندہ تو دوڑ رہوں گے، آپ کھڑے تو ہو جائیے!"

"نہیں آپ مجھ سے زیادہ قابل ہیں آپ کھڑے ہو جائیے!"

"مگر قابل آدمی کے پاس موٹر کار نہیں ہے۔"

"میری موٹر کار حاضر ہے۔"

"روپیہ بھی نہیں ہے!"

"بھگوان دے گا!"

بھگوان کا انڈر میں میرے پاس نہیں ہے۔"

"وہ تو میرے پاس ہے!"

تو آپ اور بھگوان مشورہ کر کے مجھے آگاہ کر دیجئے گا۔"

میں تو یوں مذاق میں ٹال کر چلا آیا لیکن دوسری شام کو سارے علاقے میں

ایک قد آدم پوسٹر چسپاں پایا گیا، کہ جہنت رکھوڑو اس اور اس کی دو ہزار چار سو بیس عقیدت مند عسکیتوں کی طرف سے شری فکر تو نسوی کو ایکشن میں کھڑا ہونے کی درخواست کی گئی جو انھوں نے منظور فرمائی ہے۔

کچھ لوگوں نے اسے مذاق سمجھا۔ میرے سسر نے میری بیوی کو ماتحتی تار بھیجا لیکن

اس کے باوجود میری بیوی نے سارے محلے میں لڑو بانٹے۔ کیونکہ وہ بھی جہنت رکھوڑو

داس کی جہلی مٹی۔ جب اپنی بیوی اپنی ہفتوں کے بس میں ہو تو پولیٹیکل سوچ بوجھ بے معنی ہو جاتا ہے۔

جس دن کا خلافت نامہ دگی داخل کرنے کی آخری تاریخ مٹی میں صبح ہی صبح باغیہ روم میں جا چھپا۔ لیکن میری بیوی اور احباب نے سسپینس پر لیس سکونڈ کر بلا یا۔ اور اس کی مدد سے دروازہ توڑ کر مجھے باہر نکالا۔ باغیہ روم کے باہر میں ایک دوست نے ایکشن فنڈ کے لئے اپیل جاری کر دی اور گیارہ روپے بھی دے دئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو ہزار روپے اکٹھے ہو گئے۔ جن میں بچاؤ کے روپے نقد تھے اور باقی کے وعدے تھے۔ ان بچاؤ کے روپوں میں تین ٹوٹ بچے ہوئے تھے۔

اس پر پراپیگنڈہ مشینری فوراً حرکت میں آگئی اور دو ٹروں میں کنوینٹس کی گئی۔ ایک دوست نے کہنے میں لے جا کر سمجھایا کہ کامیاب ہونے کے بعد مختار سے ڈیر بننے کے چانس خالصے روشن ہیں۔ ایک جیونٹی کو بلا یا گیا۔ جس نے پانچ روپے لے کر ڈاکے بنایا کہ محنت کے ستارے میں ایک کار اور کوئلے کی صفات پیش ہوئی نظر آرہی ہے ڈائری اور ٹریڈ یونین کے ہریڈیٹس سٹریٹ رام نے پانی ملا ہوا دودھ کا گلاس میرے منہ سے دگائے ہوئے کہا۔ ایکشن میں دودھ کا سارا خرچ میرے ذمے! ایک اور صفات نے وعدہ کیا کہ ایکشن آفس کے لئے میری کوئٹ حاضری ہے۔ یہ کہنے کے بعد وہ صاحب کبھی نظر نہ آئے۔

ان حوصلہ افزائیوں نے میرا ایمان متزلزل کر دیا میرا خیال تھا کہ ایکشن لڑنا شرفاء کا کام نہیں۔ لیکن اب خیال آیا کہ صرف شرفاء ہی کو لڑنا چاہئے ورنہ ڈیموکریسی فنڈ و گروہی کا شکار ہو جائے گی۔ اس لئے جوہن میں نے اسی امر پر عجیب سے ایک عجیب سی احمقانہ طمانیت بھر گئی، درمشنڈے سے فوجیوں نے جو رام پلا میں راؤن کا پارٹل ادا کیا کرتا تھا۔ مجھے پکڑ کر گندھے پر بٹھالیا تھا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں رامائن کی سنبھال ہوں اور ڈیموکریسی کا راؤن مجھے اغوا کر کے لے جا رہا ہے۔

دوسری رات کو احباب نے ایک امیر جنسی میننگ بلائی، بچاس دوستوں  
 نے وعدہ کیا تھا۔ لیکن صرف بچیس شامل ہوئے، باقی بچیس میں سے کوئی خود بھیجا  
 گیا تھا۔ کسی کی بیوی بھیجا گئی تھی اور کسی کی عینس! ایک لیڈی وکر جو ایک بار جو  
 کے جرم میں گرفتار ہو چکی تھی اس میننگ میں شامل ہوئی۔ ایک لیڈی ٹاکٹر جو جنلی  
 پلاننگ اور اسقاط حمل دلوں کام ساتھ ساتھ کرتی تھی۔ میری مداح نکلی، ایکیش  
 کے ایک گھاگ ماہر شری بدلی چندر جی نے اس میننگ کی رہنمائی کی۔ یہ صاحب  
 چار بار ایکیش لڑ چکے تھے جن میں سے تین بار ہار گئے تھے۔ اور چوتھی بار ایک ٹیکیکل  
 غلطی کی وجہ سے کامیاب ہو گئے تھے۔ بدلی چندر جی نے ہتھ پدیش سے لے کر  
 دیوانہ چرکوں تک کے حوالے دے دے کر فرمایا کہ ایکیش میں کس قسم کی حکمت  
 عملیوں سے کام لیتا چاہئے۔ انھوں نے انکشاف کیا کہ ہر ایکیش پر میری جیب سے  
 صرف بچیس روپے خرچ ہوئے تھے باقی سبھی اخراجات دوشروں نے برداشت  
 کئے تھے۔ اس انکشاف کا میری ایکیش مہم پر بہت برا اثر پڑا۔ کیونکہ کئی دوستوں  
 نے اپنے وعدے کے روپے دینے سے انکار کر دیا کہ دوشروں برداشت کر سکیں اور  
 ایک دوست نے تو اپنے دیئے ہوئے پانچ روپوں کی واپسی کا مطالبہ بھی کر دیا۔  
 اس ہائی پاور میننگ میں ایک ایکیش گیش بنائی گئی۔ اس کمیٹی کو تمام اختیارات  
 سونپ دیئے گئے کہ وہ جیسے چاہے ایکیش مہم چلائے۔ پوسٹر نکالے، نہ نکالے، جلسے  
 کرے نہ کرے، مخالفت کے جلسوں میں گزربڑ پھیلانے، جلسوں نکالے، برائے پر  
 مظاہرین حاصل کرے، اپنے امیدوار میں وہ خوبیاں تلاش کرے جو اس میں موجود  
 نہ ہوں اور مخالفت امیدوار کے لئے وہ خرابیاں ایجاد کرے جو اس میں موجود نہ ہوں  
 جعلی دوشروں کی الگ فہرست تیار کرے۔ جوے میں سزا یافتہ لیڈی وکر کو قتلانہ  
 دوشروں کے محاذ کی انچارج بنا دیا گیا۔ میری ناکامی کی ایک اہم وجہ یہی جوئے باز  
 محرم رئیس۔ کیونکہ جس عورت کے پاس امی کنوینٹنگ کے لئے جاتی وہ منہ پھیر لیتی اور  
 مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ عورتیں، عورتوں سے گفتنی نفرت کرتی ہیں۔

جب میرے ایکشن کا پہلا پوسٹر نکلا تو کھلبلی مچ گئی۔ کیونکہ وہ اشتہار نہیں تھا ایک ادب پارہ تھا۔ اس ادب پارے کو پانچ فی صدی لوگ سمجھے۔ بچاؤ کے فیصدی نہیں سمجھے۔ میری ضمانت ضبط ہونے کی ایک اور وجہ یہ پوسٹر بھی تھا۔ جس نے میرے دو ٹروں کو پانچ اور پچانوے میں بانٹ دیا اور دونوں نے مجھے دو ٹ نہیں دیا سمجھداروں نے اپنی سمجھ کے زعم میں اور نا سمجھوں نے "بے ادب" ہونے کے ناٹے! اور جب چند عورتوں نے مجھے دو ٹ دیا ان کی زبان پر پتہ چلا کہ انہوں نے مجھ پر رحم کھا کر دو ٹ دیا۔ سچ مچ دنیا میں رحم دل انسان اب بھی موجود ہیں۔ میرا خاکہ اڑانے کے لئے نہیں بلکہ عاذتاً مخالفت امیدوار نے بھی جوابی پوسٹر نکالا۔ جن میں مجھ پر کچھ الزامات لگائے۔ مثلاً۔

- ۱۔ سیا کورٹ پہنا ہوں۔
- ۲۔ میری بیانی گمزدور ہے
- ۳۔ میں نے محلے کے کتے کو زہر دلا دیا تھا۔
- ۴۔ میں نے مندر کی تعمیر کے لئے سواروپہ چندہ نہیں دیا تھا۔
- ۵۔ میں دو درجہ میں ملاوٹ کا دھن ہو کر بھی اپنے بچوں کو درجہ میں پانی ملا کر پلاؤں تھا۔

جب یہ پوسٹر شائع ہوا تو سچاؤ کے فیصدی دو ٹروں کی سمجھ میں آسانی سے آگیا اس پوسٹر نے ذہنی طور پر قریب قریب مجھے مغلوب کر دیا۔ غصے اور اضطراب سے نیند اڑ گئی۔ الزامات صحیح ضرور تھے۔ لیکن معیاری نہ تھے۔ احباب نے مجھے مجبور کیا کہ میں بھی مخالفت امیدوار پر جوابی الزامات لگاؤں۔ مثلاً یہ کہ اس نے مندر کے ہتھ خانے میں تاجا گنز مشراب کی بھٹی چلا رکھی ہے۔ اس کے والد صاحب نالی تھے۔ اس کی موجودہ بیوی اعتراف دہ ہے۔ اس کا دادا بیرٹش سرکار کا چیمبر فنانس سرکار کا چپراسی تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ الزامات میرے الزامات سے بھی گرے ہوئے تھے۔ میں نے دل ہی دل

میں فیصلہ کیا کہ الیکشن نہ لڑوں گا اور ٹانگہ ٹانگہ چلاؤں گا۔ جب میں نے جوہا کے اسکا ذکر کیا تو وہ بولی: ”میں بھی تمہارے ساتھ ٹانگہ ٹانگہ چلوں گی“ میں نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

”تو محترمہ! الیکشن لڑنا کیا برا ہے؟“

غیرے دن سہارا انتخابی جلسوں نکالا گیا۔ میرا انتخابی نشان مرغی تھا۔ ایک صاحب نے تجویز کیا کہ ایک سوا ایک مرغے خریدے جائیں، ہر مرغے کو بائیسکل کی گدھی پر بٹھا کر ان کا جلوس نکالا جائے۔ تجویز بہت اچھوتی تھی۔ لیکن کسی سنگم پر مرغی خانے کے مالکوں تک یہ اطلاع پہنچادی تو مارکیٹ میں مرغوں کا خرچ سات روپے سے دس روپے ہو گیا۔ بیوی نے پیش کش کی کہ میرے طلائی زیور بیچ کر مرغے خرید کر بیٹھے۔ میرا گلا بھرا آیا۔ قربانی کی بیشمال صورت انقلاب قرائن میں ملتی ہے۔ انتخابی سپرٹ کے تحت ایک سوا ایک مرغوں کا جلوس بڑے کمزور سے نکلا۔ ایک سوا ایک بائیسکیں اور ان پر گدی نشین ایک سوا ایک مرغے اور انھیں سنبھالنے کے لئے ایک سوا ایک وکر۔ اس جلوس پر مخالفوں نے پتھر اور جراثیمیں پھینک دیں۔ جلوس میں مرغ اور ان دونوں شامل ہوئے، جلوس کے آگے آگے گٹر دلوں کوں کا ایک ٹیپ ریکارڈ برا بربک رہا تھا اور عوام غمرے لگا رہے تھے۔

جیتے گا بھائی جیتے گا!

مرغے والا جیتے گا!!

جلوس کے خاتمے پر معلوم ہوا کہ دس بائیسکیں اور پندرہ مرغے غائب ہیں کچھ دکانوں نے بتایا کہ چار پانچ مرغے تو مرغیوں کے پیچھے بھاگ گئے۔ کچھ دکانوں نے بتایا کہ جلوس کے درمیان ہی سے کچھ بائیسکیں بے کرکھک گیا۔

نہیں دن بعد مخالفت امیدوار نے بھی جلوس نکالا۔ اس کا انتخابی نشان بھی تھا۔ انھوں نے بھی ایک سوا ایک بھینسوں کا جلوس نکالا۔ عوام اس جلوس میں بھی ہزاروں کی تعداد میں شامل ہوئے ان عوام کا کوئی اعتبار نہیں۔ مرغے اور بھینس دونوں سے

کیاں عقیدت رکھتے ہیں۔ خوام کے اس دو نظریے پر ہی کتاب ہو گیا۔ صرف ایک بات اطمینان بخش تھی کہ مخالفت کی آگہم بینیں غائب ہوئیں جن کی قیمت مرغوں سے سات سو گنا زیادہ تھی۔

اس کے بعد جیلوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ امر تعجب خیز تھا کہ مرغوں کی طرح منفر رہیں بھی کرائے پر چلے جاتے تھے۔ مظاہر اور موسیقار ایک جیسے سے فارغ ہو کر دوسرے جیلے میں پہنچ جاتے۔ صرف امیدواروں کے نام بدل دیتے۔ مواد بھی رہنے دیتے۔ آرٹ اور آرٹسٹوں کی پے پیسہ پستی، دیکھ کر گئی بار مجھے شرم آئی بلکہ احباب کے سمجھا یا کہ یہ صنعتی دور ہے۔ یہاں آرٹ بھی بازار کی جنس بن گیا ہے۔ ہدی، آلو، ٹماٹر، انگڑا اور منفر۔ ان سب میں بھید بھاگ مٹ گیا ہے۔

ہمارے حلقے میں چوبیس ہزار ووٹر تھے۔ جن میں سے ڈھائی ہزار ووٹر جعلی تھے۔ یعنی خدا کی طرح موجود تھے۔ لیکن نظر نہیں آتے تھے۔ ایک صاحب میرے پاس آئے اور بولے: "ان ڈھائی ہزار ووٹروں کا ٹھیکہ مجھے دے دیا جائے۔ ڈھائی ہزار روپے لے کر ووٹ بٹکانا لگا، بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ایسا ہی ٹھیکہ مخالفت امیدوار سے بھی کر چکا ہے اور ڈھائی ہزار روپے لے چکا ہے۔ میں نے اسے باکر مشرندہ کیا۔ لیکن وہ مشرندہ رہا اور کہنے لگا: "مشرندگی کیسی؟ پوڈوزنس ہے۔"

ایک ہزار ووٹر رعیت فرما گئے تھے۔ جس سے مجھے بہت تسکین ہوئی کیونکہ ووٹر جیلے بھی کم ہوں اتنی ذمہ داری کم ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر ووٹر کے پاس جا جا کر ہاتھ جوڑنا پڑنے ہیں۔ الیکشن کی اصطلاح میں اسے "ڈوٹے ڈو کر کونینگ" یعنی درود کی خاک چھاننا کہتے ہیں۔ میں نے کئی ایسے ووٹروں کے سامنے بھی ہاتھ جوڑے جو اندھے تھے۔ ایسے ووٹروں کو اپنا مینی فیسٹو سنایا جو پیرے تھے۔ اس کنوینینگ میں محلے کے چھ معززین ہمارے ساتھ چلتے رہے مخالفت امیدوار کے ساتھ بھی چلا کرتے۔ ان میں سے ایک معزز نے مجھے کان میں بتایا کہ ہم صرف اخلاق اور تہذیب کی خاطر مخالفت امیدوار کے ساتھ جاتے ہیں۔ ورنہ ہم ووٹ آپ ہی کو دیں گے۔

اور ان میں سے اکثر معزین نے ہم دونوں میں سے کسی کو بھی دوش نہیں دیا۔ پرتنگ کے دل یا تو وہ یا ہر چلے گئے یا اس کھیلنے سے۔  
پرتنگ سے دو دن پہلے سرگرمیاں کچھ زیادہ تیز ہو گئیں۔ مثلاً مخالف امیدار کے ایک خاص ایلچی نے رات کے دو بجے کر میرا دروازہ کھٹکھٹایا۔  
میں نے پوچھا: "کیا چاہتے ہو؟"  
وہ بولا: "آپ کا ضمیر!"

میں نے کہا: "ذرا وضاحت فرمائیے۔"

اور اس نے بطور وضاحت پانچ ہزار روپے کے نوٹ میری جیب میں ڈال دیے۔ میں نے کھلی کی طرح تبسم کیا اور کہا کہ خرچ بالا کن۔ وہ اداس ہو گیا بولا: "مالک نے مجھے چھ ہزار روپے دیے ہیں۔ ایک ہزار میں نے بطور کمیشن رکھ لیا ہے۔"

میں نے یہ سن کر اپنے کتے سے کہا: "ان صاحب کو گھر چھوڑ آؤ۔"  
دوسرا انکشاف یہ ہوا کہ تمام سبزی خوردوں نے مندر میں جا کر قسم کھائی کہ مرغا ایک طرح کا مانس ہے۔ اس نے کوئی سبزی خورد مرغے کو دوش نہ دے گا۔ لیکن مندر کے بیٹو بھاری نے پچاس روپے میں اپنا ضمیر بچتے ہوئے جباہ کر جب قسم کھائی کہ اس وقت بھگوان کی مورتی کو نہ لایا نہیں گیا تھا اس نے قسم کا قبول ہونا مشکوک ہے۔

تیسرا انکشاف یہ ہوا کہ دوڑ کی کوئی ذاتی رائے نہیں ہوتی۔ بلکہ مختلف لوگوں فرقرن، ذاتوں اور برادریوں کی رائے ہی اس کی رائے ہوتی ہے۔ حزکان برادری گوالا برادری جوڑے باز برادری، چڑی مار برادری، بھو تر برادری، غرض ان گنت برادریوں میں دوڑ حضرات کی تقسیم و تفریق ہو چکی ہے۔ میں نے افراد کی بجائے برادریوں سے انتخاب کی کہ میں بھی آپ ہی کی برادری کا ممبر ہوں ممبر بنانے کے بعد انھوں نے وعدہ کیا کہ ہم آپ ہی کو دوش دیں گے۔ مخالف امیدوار سے بھی ایسا ہی برادرانہ وعدہ کیا گیا۔



اور سب سے آخری اور عظیم انکشاف یہ ہوا کہ حبیب پورنگ کے بعد دوڑوں کی  
 تگڑی کی گئی تو میری بیوی کے سو کسی کو یقینی نہ کیا کہ میری ضمانت حنبہ ہو گئی ہے لیکن  
 مجھے برابر رشک رہا کہ میری بیوی نے بھی مجھے دھوکا نہیں دیا۔ بد قسمتی سے نہیں  
 لاعلمی سے !!

# وارنٹ گرفتاری

ایک دن جب رات کو گھر لوٹا تو راستہ میں ایک بیل گاڑی سے ٹکرا گیا۔ اور ایک  
کافریم ٹوٹ گیا۔ وجہ یہ تھی کہ اس مقام کو ایک ادبی اجتماع میں وزیر ہندوئی امور  
نے مجھ سے کہا تھا کہ فکر صاحب! آپ سلطنتِ ادب کے کوہ نور میرے ہیں۔  
اور کوہ نور میرا فرطِ مسرت میں حبِ علیک کا فریم تڑا کر لوٹا تو بیوی نے دیکھتے  
کہا: "آج آپ کے وارنٹ گرفتاری آئے تھے۔"  
منجھلے بچے نے مارے خوف کے چھٹنے ہوئے کہا: "ڈیڑی کیا آپ اب جیل  
بٹے جاسیے گے؟"

سب سے چھوٹے بچے نے خوشی سے اعلان کیا: "ڈیڑی، میں بھی آپ  
کے ساتھ چلوں گا۔"

پڑوسی رگھو رام میری آواز کی بوجھلے کر آگیا اور بولا: "فکر صاحب!  
شاید سب سے کل بھی آئے گا۔ اس لئے گرفتاری سے بچنا چاہئے۔"

پڑوسی مادھو رام جس کی پڑوسی رگھو رام سے خاندانی دشمنی تھی۔ اس نے  
رگھو رام کی آواز کی بوجھلے کر آکر بولا: "فکر صاحب شریف آدمی ہیں۔ بچنے کی  
کوئی ضرورت نہیں۔ انھیں خود بخود کچھری میں حاضر ہو جانا چاہئے۔"

میں سر ہل کر سٹیج گیا۔ یہ کہ ہے کے وارنٹ گرفتاری تھے؛ کس جرم میں؟ میں

۷۔ اپنے غرض سے چالیس سالہ جرائم پر نگاہ ڈالی تو صرف ایک جرم دکھائی دیا۔ جبکہ پندرہ برس کی عمر میں لاہور میں سے میں نے ایک کتاب چرائی تھی مگر آج کل تو میں اس لاہور میں کی مشاوری نگین کا ممبر تھا۔ میں نے بیوی سے پوچھا۔ "تم نے وارنٹ کی عبارت پڑھی تھی؟"

"ہاں" عدم ادائیگی قرضہ کے وارنٹ تھے۔

بیوی نے زندگی میں پہلی بار سچی بات کہی تھی۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ سچکڑوں بار کہہ چکی تھی کہ میں آپ سے سچی محبت کرتی ہوں۔ مگر مجھے اعتبار نہیں آتا تھا کیونکہ سچی محبت وہ صرف اپنی ماں سے کرتی تھی۔ میں نے سرکار سے سچ بچ ایک بار قرض لیا تھا اور واپس اس لئے نہیں کیا تھا، کیونکہ میرا خیال تھا کہ سرکار کے پاس مجھ سے زیادہ پیسہ ہے۔

لیکن سرکار نے سماجی انصاف کی خاطر میرے وارنٹ نکال دیئے۔ وارنٹ کا تصور ہمارے گھناؤنا ہوتا ہے۔ گندی گالی وارنٹ سے کم تو ہیں انگریز ہوتی ہے سب سے زیادہ غصہ مجھے پڑوسی رنگورام پر آیا جسے یہ معلوم ہو گیا کہ سرکار مجھے ہتھکڑی لگانے آئی ہے۔ میں اسے رنگورام کو اب اپنا ڈھکے چٹا استعمال کرنے کے لئے کبھی نہیں دوں گا۔

دوسرا غصہ سرکار پر آیا۔ اس نے میرے وارنٹ کیوں نکال دیئے؟ کسی اور کے نکال دیتی کیا اسے معلوم نہیں تھا کہ سرکار کے وزیر قہذری امور نے مجھے کوہ نور ہیرا کہا ہے۔ ایک طرف کوہ نور، دوسری طرف وارنٹ؟ ایک ہی آدمی کے بارے میں سرکار کی یہ ڈبل پالیسی کیوں ہے؟

اور پھر سرکار نے مجھے قرضہ ہی کیوں دیا تھا؟ صفیر نے کہا تم نے خریدا تھا کیا سرکار کو معلوم نہیں تھا کہ میں لوٹا نہیں سکوں گا۔ اور پھر میں نے اکیلا فقوڑے لیا تھا۔ ہزاروں مصیبت زدگان نے لیا تھا۔ سرکار کا فرض تھا کہ یہ قرضہ معاف کر دیتی۔ تاریخ میں تو یہ اکثر ہوتا آتا ہے کہ مسطنتوں کے اربوں روپے ڈوب جاتے

ہیں۔ بلکہ خرد سلطنتیں ڈوب جاتی ہیں۔

رات بھر ڈراور غصہ میں نیند نہ آئی اور میں سرکار، قاتلہ، بلیعت، حتیٰ کہ گھر کے چڑھوں تک کو کوستا رہا جو سہاری چینی کی پلٹیں توڑ جاتے ہیں۔ صبح کے قریب آئینہ لگی تو خراب میں والد صاحب نے درشن دیکھے اور کہا: "قرضہ چکا دو بیٹیا! کیوں باپ کا نام ڈوب رہے ہو۔"

جب آئینہ کھلی تو سب سے پہلا خیال یہ آیا کہ بیوی بچوں کے گم ہر دوار چلا جاؤں اور گھر کے دوازے پر پرچٹ چسپاں کر جاؤں۔

"نکر تو نسو! اپنے گناہوں کے پشچا تاپ کے لئے تیرے یا ترا پر گیا ہوا ہے۔"

لیکن - (۱) اگر سرکار نے فراموشی ملزم قرار دیا؟

(۲) اگر آج کیجنت، بلیعت پھر آگیا؟

(۳) اگر کچہری میں خرد بخود حاضر ہونے پر کلکٹر نے

جیل میں ڈال دیا؟

والد صاحب کی اس تجویز پر سخت افسوس ہوا کہ قرضہ چکا دو۔ آہ۔ آہ!

چنے گردی رکھ دوں؟ مگر نہیں۔ دنیا کی تو بے فی عتکریاں گہنوں کو خاوند سے زیادہ

پیار کرتی ہیں۔ بلکہ غیظ ممکن ہے، بیوی اسی پراسٹ پر طلاق کی دھمکی دے ڈالے

— کیا کسی وکیل سے مشورہ کروں؟ مگر والد صاحب نے ایک بار نصیحت کی تھی

کہ بیٹیا! تو سے حکیم اور پورے وکیل کے پاس نہ جانا۔ دونوں دوگ بڑھا دیں گے۔

صرت ایک طریقہ باقی تھا کہ بغیر ناشتہ کئے گھر سے چلا جاؤں اور بیوی سے کہہ دوں

کہ بلیعت آئے تو اسے اطلاع دے دینا کہ ملزم سندھوستان چھوڑ کر ناگنا نیکا چلا گیا ہے

اور اس جنم میں نہیں لوٹے گا۔

چنانچہ جلدی جلدی کپڑے بدلے، بیوی کو وصیت کی اور گھر سے باہر نکل گیا

راستہ میں جو آدمی بھی خاک کی دروی پہنے گزرتا، میری طرف گھورتا۔ اور میاں آنکھیں بند

کر کے اسے چل دیتا اور آگے بڑھ جاتا۔ اور اس دن سڑک پر نہ جانے کیوں؟ ہزاروں

بلیٹ وارنٹ لئے گھوم رہے تھے لیکن میں ان کے ہاتھ نہیں آیا۔ دن بھر کئی دوستوں  
 و حضروں اور آشناؤں کے ہاں گیا دیر سب میرے ٹانگہ نیکا تھے۔ اور آخر شام کو ایک  
 ریسٹورنٹ میں جا بیٹھا اور دوستوں سے گپ خپ لوائے لگا۔

ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے بیٹھے کیا دیکھتا ہوں کہ ایک پراسرار حشمتیں  
 ہماری میز کی طرف بڑھ رہا ہے۔ قریب آتے ہی اس نے مجھ سے پوچھا: "کیا آپ کا نام  
 فکر تو نسوی ہے؟"

میں نے بڑے بہادرانہ لہجہ میں کہا: "کبھی کبھی ڈر کی شدت میں انسان بہادر  
 بھی بن جاتا ہے۔" نہیں صاحب! میرا نام رام گوپال ہے، البتہ فکر تو نسوی کو جانتا  
 ضرور ہوں۔"

اب مجھے یقین آ گیا کہ یہ وہی کم بخت بلیٹ ہے جو مجھیں بدل کر آگیا ہے۔ سوچا  
 اسے غلط ایڈریس بتا دوں، لیکن عذری میں کوئی غلط ایڈریس بھی نہیں سوچا اور کہہ دیا  
 "ٹانگہ نیکا چلے گئے ہیں؟"

شخص مذکور یا اس ہو کر چلا گیا۔ بعد میں ایک دوست نے بتایا کہ یہ ایڈریس کارپوریشن  
 میں ملازم تھا اور مختار امداد تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ ایک مداح خوا مخواہ میرے ہاتھوں  
 بلیٹ بن گیا۔

شام کو چاندی کے قریب گھر لٹا۔ اپنے پلان کی کامیابی پر نازاں، اپنی بزدلی  
 پر شرمندہ، لیکن وارنٹ کے تصور سے بدستور ہراساں۔

جوبھی گھر کی کنڈی کھٹکھٹائی، بیوی نے اندر سے آواز دی: "کون ہے؟"  
 میں نے مذاق میں کہا: "بلیٹ۔"

اندر ہی سے کڑخت لہجہ میں جواب آیا: "مرا پھر آگیا۔" اچھی بلیٹ صاحب! تم  
 سے تین بار کہہ چکی ہوں، فکر صاحب! ٹانگہ نیکا گئے ہوئے ہیں؟

میں نے کہا: "ڈارنگ! میں ٹانگہ نیکا سے واپس آگیا ہوں۔"

بیوی نے ڈارنگ کے لفظ کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا: "ہاں ہاں ٹانگہ نیکا"

جورِ اعظم افریقہ میں ہے۔“

اس مرتبہ بیوی کی ہنرمندی پر بے حد پیار آگیا۔ میں پہلے سمجھا کرتا تھا فضول سی بیوی ہے، صرف بچے پیدا کرنا جانتی ہے۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ یہ تو جفرائیہ بھی جانتی ہے۔

میں نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ کیونکہ ڈپلومیٹک بیوی سے مجھے ایک اور خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں میں دروازے پر ہی کھڑا نہ رہ جاؤں اور وہ دروازہ ہی نہ کھولے اور حد سے زائد ہنرمندی میں مجھے بچانے سے ہی انکار کر دے۔ چنانچہ میں کھلی طرف سے دیوار بچاند کر اندر آئنگن میں داخل ہو گیا۔ ”یہ کیا حرکت ہے؟“

عرض کیا: ”جب فکر تو نسوی اور بلیٹ میں فرق مٹ جاتا ہے تو دیوار بچاند کر اندر آتا پڑتا ہے۔ تم نے دروازہ کیوں نہیں کھولا؟“

”آپ نے کیوں کہا تھا کہ میں بلیٹ ہوں۔ وہ کم سخت آج تین مرتبہ آیا تھا مجھے خطرہ ہے کہ کہیں پھر نہ آجائے۔“

ستھ پاگل ہوئی ہے کیا؟ رولز کے مطابق اب میرے وارنٹ لانگکامز کا ہی جائیج بیوی بے اختیار سنس پڑی، بچے ہی سنس پڑے۔ میں خود بھی کس حد تک سنس پڑا۔ لیکن دل کی پھلی تہوں میں کوئی بیٹھا کہہ رہا ہے۔

”اور اگر بلیٹ آگیا تو...“

اور دوسرے دن بلیٹ واقعی آگیا۔

میں برآمدے میں کرسی ڈالے اخبار پڑھ رہا تھا کہ اچانک کیا دیکھتا ہوں۔ بلیٹ میری کرسی کے عین پیچھے کھڑا ہوا۔ ”وہاں آئے کہا“ اگر یہ بلیٹ ہے میں تو کبھی سمجھو کہ بلیٹ نہیں ہے۔ تم اخبار پڑھتے رہو۔“

بلیٹ نے کہا ”جواب...“

میں نے اخلاقاً کہا ”کون ہو کیا چاہتے ہو؟“

”جناب! کیا فکر تو نسوی صاحب آپ کا اسم گرامی ہے؟“  
 ”میرا خیال ہے۔ پہلے آپ بتائیے کہ آپ کا اسم گرامی کیا ہے؟“  
 ”میں سرکاری مبلغ ہوں۔“

”تو پھر میں فکر تو نسوی نہیں ہوں۔“

بلیغ مسکرا دیا دکنی خوشامک مسکرا سہٹ تھی ظالم کی، چند سکندربک مجھے  
 گھورتا رہا اور جب تک وہ گھورتا رہا میں دل ہی دل میں گائتری منتر کا جاپ کرتا رہا  
 آخر کار وہ بولا: ”جناب! آپ مذاق کر رہے ہیں، کیونکہ آپ مزاح نگار ہیں نا؟“  
 مگر عرض یہ ہے کہ میں نے آپ کا نوٹ ایک رسالہ میں دیکھا تھا۔ جس کے نیچے فکر  
 تو نسوی لکھا تھا۔“

”وہ پرتشنگ کی غلطی ہوگی۔“

”ایک بار ایک مشاعرہ میں آپ کو نظم پڑھتے بھی دیکھا تھا۔“

”وہ مشاعرہ والوں کی غلطی ہوگی۔“

”اور آپ کے بڑے ہی رنگورام نے بھی مجھے اکہل اکہل بتایا ہے کہ وہ سامنے  
 سرسی پر فکر تو نسوی صاحب ہی بیٹھے ہیں۔“

اب میں نے گائتری منتر پڑھنا بند کر دیا، اس زمانے میں گائتری منتر میں بھی  
 جان نہیں رہی۔ چنانچہ گائتری منتر کی بجائے میں نے خاندانی مشافقت کا سہارا  
 لیا اور لکھتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ، کہا: ”اچھا چلو، مذاق ختم۔ بتاؤ کیا چاہتے  
 ہو؟“

آپ کو تحفہ دار صاحب نے عدالت میں بلایا ہے آپ کے وارنٹ  
 گرفتاری میں؟“

آہ! یہی وہ غلیظ فقرہ تھا، جسے میں سننا نہیں چاہتا تھا۔ اخبار ایک طرف  
 رکھ کر میں نے وارنٹ گرفتاری اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اسے خواہ مخواہ پڑھنا  
 شروع کیا۔ وارنٹ پر وہی روایتی توہین الیگنس عبارت تھی جو

” ہر گاہ کہ کسی فکر تو نسوی ولد ..... فات ..... پیشہ .....  
 سکھ ۔ دبیرہ دانستہ عدالت میں حاضر ہوئے سے گریہ کر رہا ہے ، لہذا البتہ عدم  
 اور اس کی قرضہ مجریہ سرکار عالیہ ۱۹۵۰ء سے کسی مذکور کے وارنٹ گرفتاری جاری کئے جاتے  
 ہیں کہ ملزم کو گرفتار کر کے بر عدالت منتقل کیا جاوے گا ۔ ..... تک پیش  
 کیا جائے .....“

### دستخط

” ہر عدالت .....“

میں نے محسوس کیا کہ میرے بیوی بچے کھڑکیوں میں کھڑے مجھے جھانک رہے  
 ہیں ۔ اور اداہر کی کھڑکیوں سے دو چار پڑوسیوں کے منہ سے چہرے بھی جھانکے  
 دکھائی دے رہے ۔

پہلے میں نے سوچا کہ بلیٹ سے کہوں ، وارنٹ کی عبارت ٹھیک مگر اگر  
 لاؤ کیونکہ ادنیٰ اعتبار سے اس میں کمی مستقیم ہیں ۔ لیکن بلیٹ نے مجھ سے پہلے  
 کہہ دیا ۔

” تو چلے جناب “

میں نے کہا : ” ٹیڑھ چلتا ہوں ، نقوڑا سا سوچ لوں ۔“

رنگھو رام پڑوسی ہماری باتوں کا لطف اٹھانے کے لئے ہمارے پاس آگیا  
 ” کیئر ! “ ۔ میں نے دل ہی دل میں کہا ۔ لیکن وہ اسے بددعویٰ جاننے کے بہتہ میں  
 بولا : ” کیا بات ہے فکر صاحب ! “

میں نے کہا : ” کچھ نہیں ، ان صاحب کی ایک بھینس گم ہو گئی ہے ۔ پوچھ رہے  
 ہیں ، ہمارے گھر تو نہیں آئی ! “

رنگھو رام بولا : ” معمولی بات ہے ، مجھ پر چھوڑ دیجئے ۔ بھائی صاحب  
 خدا اداہر میری بات تو سنئے ۔“

وہ بھائی صاحب کو ایک طرف کمرے میں لے گیا اور کھڑکے پر کھڑے لگا ۔ شاید



اسے بڑکا رہا تھا کہ تم فکر نہ منوی کو ضرور گرفتار کر کے لے جاؤ۔ درجن تیار رہی دھڑلہ مٹ کر دوں گا۔۔۔ مگر بلیٹ مسلسل انکار میں سر ہار رہا تھا۔ اتنے میں رگھورام میرے پاس آیا اور سرگوشی میں بولا: "اجی دور رو پے دے دوسلے کر ٹل جائے گا۔"

میں اصولی طور پر رشوت کے خلاف ہوں۔ لیکن سوچا کہ یہ کارآمد اصول کسی اور بہتر وقت کے لئے استعمال کروں گا۔ لہذا جھٹ دور رو پے نکال کر رگھورام کی تھیلی میں بٹھادیئے۔ رگھورام نے ہلین کے صلبیوں کے افلاس زدہ چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

بلیٹ نے حقارت سے زمین پر نفوس کر کہا۔ "اجی! کیا آپ مجھے رشوت خور سمجھتے ہیں؟"

میں نے جو تیسرا دسیہ دینے کے لئے جیب سے نکالا تھا۔ ڈر کے مارک والی جیب میں ڈال لیا۔ (پچھلے اور ایماندار آدمی کے کبھی کبھی کتنا ڈراتا ہے؟)۔

رگھورام نے بھی تکنیک بدل لی۔ بولا: "بلیٹ! کیا تم جانتے ہو فکر صاحب بہت بڑے ادیب ہیں؟"

ہلین نے بغیر سوچے سمجھے کہا، میں رگھورام سے اتفاق کرتا ہوں۔

بلیٹ نے جواب دیا: "ہاں۔ میں ان کا مداح ہوں، لیکن سرکار کا نوکر بھی ہوں اور یہ میری نوکری کا سوال ہے۔"

بلیٹ کی مدلل حجت نے ہمیں بے بس کر دیا۔ اب مجھے بلیٹ پر نہیں سرکار پر غصہ آ رہا تھا۔ یہ کیسی سرکار ہے جس کا بلیٹ اور کلچرل منسٹر دونوں میرے مداح ہیں مگر مجھے گرفتاری سے نہیں بچا سکتے۔ ایسی سرکار کا کیا فائدہ؟ ایسی سرکار کو بدل دینا چاہئے ایسی سرکار مردہ باد! — انقلاب زندہ باد!!

نقدی دیرہ ایک خوفناک خاموشی طاری رہی۔

اور پھر میں بغیر سوچے ایک طرف چلنے لگا۔

بلیٹ بھی میرے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

میں نے رومال سے ناک صاف کیا۔

بلیٹ نے بھی ایسا ناک صاف کیا۔

بلیٹ میرا نقاب کیوں کر رہا ہے۔ بلیٹ مجھے چور سمجھتا ہے۔ یہ ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ مجھے پیاروں کی طرح گرفتار ہو جانا چاہئے۔ میرے پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ بلیٹ نے کہا۔ ”جناب! چلئے، اب کوئی مزید بہانہ منت سوچئے۔“

”ہے، بہانہ کیا؟“ میں اکر گیا۔ ”میں تمہارے وارنٹ سارنٹ سے نہیں ڈرتا۔ اور ابھی کپڑے بدل کر تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“

”مگر اب آپ کپڑے کبھی نہیں بدل سکتے آپ جانتے ہیں کہ مجھے تھکڑی نگانے کے اختیار ملتے ہیں؟“

جی جابل بلیٹ کے منہ پر طمانچہ خبر دوں لیکن مداح سمجھ کر رک گیا۔ تو میں، ہتھکڑی جیل انتھیلدار۔ سبھی بھرتوں کی طرح میرے ارد گرد ناچنے لگے اور جیسے کوئی گھنٹا دنا خراب دیکھتے وقت آدمی بول نہیں سکتا، میری زبان بند ہو گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ کھڑکی میں جھانکنے والی میری جوتی نے ایک دردناک چیخ ماری ہے۔ شاید زمیں پر گر کر میوٹ بھی ہو گئی ہو۔ (کبھی کبھی ان میوٹوں کو خاندانوں پر بے ساختہ پھینکا جاتا ہے)

آخری نوٹ: اس کے بعد کی کہانی ہنسایت معمولی ہے کہ مصنف عدالت میں چلا گیا اور فوراً ہی رہا کر دیا گیا۔ لیکن مصنف اس ڈسپچ کھڑک کا ہمیشہ ممنوع رہا، جسکی ذرا سی غلطی سے اس کے وارنٹ جاری ہو گئے، کیونکہ اگر کھڑک غلطی نہ کرتا تو مصنف اتنی خوبصورت کہانی نہیں لکھ سکتا تھا۔

# بیویوں کی سٹریڈیوین

چند دن سوئے میں رات کو جب گھر لٹا۔ اور مردانہ روایت کے مطابق دیر سے  
وٹا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میری پہلی اور آخری بیگم نے اپنے گورے گورے کندھے پر ایک  
سیاہ بڈ لگا رکھا ہے۔

میں نے عرض کیا "یہ کیا ہے حضور؟"

وہ بولا "جھنڈا اور پتھر ہے ہمارا"

میرا اتفاقاً ٹھنکا کہ آج وال میں کالا ہے۔ چاند سا چہرہ جو کل تک رخت تباں  
تھا، آج کسی اکجن خدام وطن کا پوسٹر معلوم دے رہا تھا جس پر تحریر تھا  
"اٹھو، مر رہی دنیا کے غریبوں کو جگا دو  
کابخ امراء کے درد دلیار ہلا دو"

میں نے کچھ مسکرا کر داور کچھ ڈر کر کہا "اے انقلاب زندہ باد! کھاتے آؤ"

وہ اپنی سٹریڈیو بائیں کو کسی جھنڈے کی طرح ہل کر بولی "آج کھانا پیٹ لگا  
آج چلے گا ڈیڑھ سٹریڈیو" ہے۔

بے یقینی میں بدلتے لگا کہ معاملہ گھبر ہے اور اب بیگم کے ساتھ رونا ٹٹک گفتگو کرنا  
نہقول ہے۔ یہ کس منہم گرنے لگے پھر پانقلابی چھاپا مارا ہے کہ آج محترمہ کی آنکھوں میں کا جس  
کی خمری کی بجائے مطالبات کا چادر ڈکھائی دیتا ہے۔ معاملے کی سبیدی کی کور دیکھ کر میں نے

بھی اچانک دلچسپ بدل دیا اور مالکانہ وقار کے ساتھ کہا: "بیگم تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تم میری بیوی ہو۔"

ترزاقت سے جواب آیا۔ "ہاں مگر میں ایک درکر بھی ہوں اور آپ میرے مالک ہیں اور میری محنت کا استحصال کرتے ہیں۔"

"مگر ڈارلنگ!۔" میں نے پھر اپنا دلچسپ بدل لیا۔ "مالک تو تم ہو، میرے دل و جان کی مالک، اس سلطنت کی تم نواب و اجد علی شاہ ہو۔ تباؤ ہو کہ نہیں؟"

ایک دن پہلے تک میرا یہی فقرہ ظلم ہو بشر یا کام کر جانا تھا۔ اور خیم ٹرپ کر میرے بازوؤں میں اگرتی تھی۔ لیکن آج آغوش میں آنے کی بجائے اس نے اپنی نرم دناڑک مٹھی دکھائی اور میز پر اتار تے ہوئے بولی۔ "سیٹھ جی! مجھے دار لفظوں کے یہ جھلا صے اب نہیں چلیں گے۔ صدیوں سے ظلم کی چکی میں پسینہ ہوتی بیویاں اب بیدار ہو چکی ہیں۔ اور اب تو اپنے حقوق منوا کر دم لیں گی اور۔۔۔"

جو ہم سے ٹکرائے گا جود جود ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "کیا آج ہمارے گھر میں کوئی ترقی پسند شاعر آیا تھا؟"

وہ بولی "شاعر میرے اندر سویا ہوا تھا۔ آج جاگ اٹھا ہے۔ لہذا میرے

مطالبات مانے نہیں تو۔۔۔"

"کوئی سے مطالبات"

"سب سے پہلے بیگم نے حلق میں ٹھوک گھلتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں گھنگرول کی مادیس محفکار نہیں تھی۔ بلکہ طبل جنگ کی سی گھن گرج تھی۔" سب سے پہلے میرا مطالبہ یہ ہے کہ میرے کام کے اوقات گھٹائے جائیں، صبح پانچ بجے سے رات کے تیارہ بجے تک اٹھارہ انٹرارہ گھنٹے روزانہ کام کرنی ہوں، انھیں کم کر کے تو گھنٹے کے چار بجیں۔ ہر مذہب سماج میں یہی دستور ہے۔"

مگر ڈارلنگ یہ تو سہو و سانی سماج ہے۔"

وہ پھر کہتی تھی "اور بانی وی وے جب تک مطالبات کی گفتگو جاری رہے

آپ مجھے ڈارلنگ کے لقب سے مخاطب نہ کریں۔ میں تو سب دوستانی سماج کو مہذب بنانے کے لئے تو گھنٹے کے اوقات آپ کو منظور ہیں ؟"

میں نے کہا "دیکھو ڈارلنگ تمہیں (وکر سیم) انکم میں اگر صرف نو گھنٹے کام ہوا تو اس سے پروڈکشن پر برا اثر پڑے گا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کام کی دو شفٹیں کرنا پڑیں گی۔ دو شفٹیں اور دو میریاں۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میں اس گھر میں دو سرری بیوی بنے آؤں ؟"

سوکھن کا جلا پا عورت کی نازک رگ ہے۔ میں نے اس رگ پر جان بوجھ کر انگلی رکھ دی کہ ٹریڈ یونین کے اندر انتشار پیدا ہوئے مگر بیگم کے اندر جیسے وہ قدیم حاسد عورت مڑھتی تھی۔ وہ بولی۔ "یہ مالک کی اپنی پرالیم ہے۔ آپ چاہیں تو کوئی ملازمہ رکھ سکتے ہیں۔"

بیگم سوکھن والے پہلو سے صاف بچ کر نکل گئی۔ اس کی یہ چترائی میرے لئے پریشان کن تھی۔ چنانچہ میں نے ایک اور سہتیار نکالا۔ "مگر اسے تنخواہ کہاں سے دیں گے؟ جتنی تنخواہ ملتی ہے۔ قہارے گورے گورے ہاتھوں پر لا کر رکھ دیتا ہوں۔ تم چاہو تو اس تنخواہ میں سے ملازمہ رکھ سکتی ہو۔"

"اس تنخواہ میں ملازمہ نہیں رکھی جاسکتی۔"

"تو بھر کر کیا جائے؟"

"میں نے کہا تھا؟ یہ مالک کی اپنی پرالیم ہے اسے خود سوچنا چاہیے۔"

"آل رائٹ۔" میں نے تنگ آکر کہا۔ "مینجمنٹ اس پر محدود دائرہ خود کرے گا اب اگلا مطالبہ پیش کیا جائے۔"

"دوسرا مطالبہ جھپٹیوں کا ہے۔"

"متغزل جھپٹی کا؟ اس کی تو میں کسی بار پیش کر چکا ہوں۔ مگر ہر بار تم نے

اسے حقارت سے ٹھکرا دیا۔"

"دیکھیے آپ اسے مذاق میں منٹتے تھے، حالانکہ اللہ قسم! یہ مذاق بالکل

نہیں تھا، ہندوستان بکیر کے سارے کامگاروں کو انوار کی ہفتہ وار چھٹی ملتی ہے مگر مجھے انوار کو سب سے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ ہر انوار کتاپ کے احباب کو دھکتے ہیں۔ کوئی بچ کھلے اور کوئی ڈنڈ اور کوئی یوں ہی گھومتے گھومتے چلے جینے آتی ہے۔ دیوالی، دسہرہ، عید، بقرعید کوئی چھٹی بھی تو نہیں ملتی ہے۔ نہ میڈیکل چھٹی نہ ایمر جنسی چھٹی۔ کھلائی کوئی زندگی ہے؟ یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگی۔

میں بھی رونا چاہتا تھا مگر مینجمنٹ میں رونے کا رواج نہیں تھا۔ مطالبہ (خدا بھوٹ نہ بلوائے) بالکل جائز تھا۔ لیکن مینجمنٹ کا رویہ بھی اس کے متعلق بڑا واضح تھا کہ کسی بھی مطالبے کو جائز قرار نہ دیا جائے۔ بلکہ اگر مطالبہ تسلیم بھی کر لیا جائے تو اسے اس کی بجائے احسان کا درجہ دیا جائے۔ چنانچہ میں نے کہا: "دیکھو بیگم! عورت ذات کی تاریخ گواہ ہے کہ اسے موت سے پہلے چھٹی نہیں ملتی۔"

"لیکن میں تاریخ کا دھارا موڑنا چاہتی ہوں۔"

"میری پیاری شہل! اگر تم عقل کا تصور اس میں استعمال کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ سماج کی تاریخ کا سارا ڈھانچہ عورت کے کندھے پر کھڑا ہے جس دن بھی عورت نے چھٹی کی سماج میں ایک تعطل آجائے گا۔ بھائی بھائی کرتی ہوئی ایک ویرانی گھر پر منتقل ہو جائے گی۔ سارا کام اس روز جو پٹ ہو جائے گا، یوں لگے گا، فیکٹری پر جبری نااہل بندیا کرا دی گئی ہے۔ بچے روئیں گے، میں روؤں گا، گھر کی آبی ادا طوطا اور جیو سبھی روئیں گے۔ میں پوچھتا ہوں، مختاری چھٹی کے دوران کام کون کرے گا؟"

"اسپ کیجئے گا۔" جذبات سے بالکل عاری ہو رہی تھی، ظالم!

اب میں نے ہنسی بولا اور کہا: "اتھیا چلو میں تمہاری ہفتہ وار چھٹی منظور کرتا ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ اس چھٹی پر تم کر دو گی کیا؟"

"بس جیلتی رہوں گی سوئی رہوں گی، ہسپتالوں کے ساتھ گھومتے جاؤں گی فلم دیکھوں گی۔"

لب و لہجہ سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ بیگم صرف میری عقل کو ناچاہتی ہے اور عقل بالکل نہیں ہے۔ ایک بار دل میں پیشطانی خیال بھی آیا کہ اسے اور ڈانٹ کا لالچ دیدوں مبین جھٹی کے دن کام کرو دو گئی اجرت ملے گی۔ اور ڈانٹ کی رقم جمع کر کے۔ ایک ساڑھی خرید لینا لیکن بیوی کو اور ڈانٹ کی ترانہ دہر تو نا کچھ اچھا نہیں لگا۔ لہذا میں نے مردانہ فراخ دلی کی انتہائی بلندی پر کھڑے ہو کر آواز دی ”دیکھ جھٹی منظور کی جاتی ہے مگر ایک شرط پر کہ تم اس دن بال بچوں کو ہمراہ لے کر مجھے چلی جایا کرو۔“

بیگم کے بچ پر بیگم کچھ بوکھلا گئی۔ میکہ پر عورت کی کمزوری ہے۔ بیگم کے سامنے سارا ٹریڈ یونین ازم منتشر ہو جاتا ہے۔ اگرچہ بیگم کی سمجھ میں یہ بات فوراً نہیں آئی کہ اس کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا ہے یا مطالبہ کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا گیا ہے مطالبے کے ساتھ شرط کی بجنگ لگا کر میں نے ایک تیر سے دو ٹکا کر رکھے تھے۔ میں نے سوچا کہ اس سے بیگم بھی خوش ہو جائے گی اور میں بھی بیگم کی غیر حاضری میں خاوند کر جو آزادی نصیب ہو جاتی ہے اس کا اندازہ صرف وہی شادی شدہ مرد لگا سکتے ہیں جو ایک مستقل کیا نیت سے نالاں رہتے ہیں۔

بیگم نے زیر لب غصہ سے اس فیصلہ پر صا و کیا اور میں نے دل ہی دل میں خوش ہو کر کہا کہ :-

مگر کی چاروں سے بازی لے گیا سربازدار

اتھائے سادگی سے کھا گیا مزد و رماں

بیگم کا تیسرا مطالبہ یہ تھا کہ گھر کے اخراجات کے لئے اسے جو رقم دی جاتی ہے اس میں اضافہ کیا جائے۔ کیونکہ اشیاء کے پرانے نرخ قائم نہیں رہے۔ ہر چیز پہلے کے مقابلے پر دو گنی ہونگی ہوگی ہے۔ مگر اخراجات کی رقم بدلتی رہی ہے۔

گویا رہنمائی الاؤنس کا مطالبہ تھا جو جبکہ وقت جائز اور ناجائز تھا۔ میں نے صحیح کہا ”بیگم! مجھے تمہارے اس مطالبے سے بہرہ دی ہے، بلکہ صرف بہرہ دیا

وہ تڑپ اٹھی : ” مگر ہمدردی سے تو بنیائیں بھی نہیں آسکتی۔“

” تو بنیائیں نہ خریدو۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ روکھی سوکھی روٹی کھانے کے ٹھنڈا پانی پی۔“ تو اس کا کچھ مطالب تھا، کچھ فلاسفی تھی، اخوس یہ ہے بیگم ! کہ تم ٹریڈ یونین ازم کے جرس میں بزرگوں کی فلاسفی بھول گئیں۔“

اس کے جواب میں بیگم نے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ بہت اذیت ناک تھا، اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ دیکھے سوکھے گی فلاسفی پر یقین نہیں رکھتی وہ معیار زندگی کو گر کر محلے میں اپنی ناک کڑانا نہیں چاہتی، اس نے آنسوؤں کا استھیا رنکال کر ہجہ پر بار بار چلنے کے اور دھمکی دی، گھر کے اخراجات کی ذمہ داری تم خود سنبھال لو خالی خالی ہمدردی اور بزرگوں کی فلاسفی کے ساتھ تم ایک ہفتہ میں ہی دیوالیہ نہ بن گئے تو میں بیگم کہلاتا چھوڑ دوں گی۔“

” توھر میں کیا کروں ڈارلنگ ؟ جتنی آمدنی ہے اس سے زیادہ کہاں سے لاؤں گا۔“  
” اپنی آمدنی بڑھاؤ۔“ انقلابی بیوی نے فقرہ لگایا۔  
” کیسے ؟“

رشتہ مند لو، جیب کڑی شروع کر دو، اسمگل کیا ہوا مال بیچو، کوئی پرومٹ لائسنس لے لو۔ سادہ دنیا اسی طرح ترقی کر رہی ہے۔“

اور صبراً جواب یہ تھا کہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکے گا، گزشتہ ایک سو برس سے جو خاندانی مشاقت ہمارے سر پر سایہ کے ہوئے ہے، میں اسے چند کرسیوں، اتاج کے چند والوں، انبیائوں اور آلوگوں کی خاطر تباہ و برباد نہیں کر سکتا۔

مگر بیگم مصرقتی نہ ہو درمیان اخلاق اور شرافت کی قدریں بدلنا رہتی ہیں، اخراجات میں کمی کر دینا بزدلی ہے، اور بزدل انسان کو کسی معزز بیوی کا خاوند بننے کا کوئی حق نہیں، اس لئے میرا یہ مطالبہ مایہ لوور نہ جزل، اسٹرائیک کے لئے تیار ہو جاؤ۔



اس نے مجھ بزدل کہا۔ میرے شوہر سچ کو مشکوک قرار دیا۔ جبریل اسٹراٹیک کی دھمکی دے کر گھر کے مفاد پر ضرب لگانے کا اعلان کیا۔ یہ رویہ سیدھا طلاق کی منزل کی طرف بڑھا جا رہا تھا۔ مگر میں نے بھی تہیہ کر لیا کہ بیوی کو طلاق دے دوں گا خاندانی اخلاق کو نہیں دوں گا۔

چند منٹ کی بھڑائی خاموشی کے بعد بولی: "تو کیا ارادے ہیں؟"

"مطالبہ رو کیا جاتا ہے۔" میں نے تاریخ انسانیت کا عظیم نرسي اعلان کیا۔

"لیکن یہ میرا غیاءی مطالبہ ہے، اگر اسے رو کیا گیا تو میں اس پر غور کروں گی۔"

کہ پہلے دو مطالبے بھی منظور کروں یا نہ کروں؟

"مجھے یہ جیلنج منظور ہے۔"

اس مرحلے پر آکر سمجھوتے کی بات چیت ٹوٹ گئی مصلحت کے تحت بیگم لینک بر جالٹی، خصلت کے مطابق میں یوں ہی کوئی پرانا رسالہ اٹھا کر ورق گزرائی کرتے دکھا۔ گھڑی کی ٹنگ ٹنگ سہارے غم اور مسرت دونوں کو پیچھے چھوڑ کر وقت کی بے نیاز منزلیں طے کرتی رہی۔ میں نے کھانا نہیں کھایا، شاید بیگم نے بھی نہیں کھایا اور پھر یوں لگا کہ جیسے ہم دونوں ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ دور ہوتے جا رہے ہیں۔ شاید ہم اندر ہی اندر روتے روتے سو گئے تھے، کھو گئے تھے۔

اور پھر جب بھوک کے گھڑیاں نے دوبجائے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک گرم گرم آنسو میری پیشانی پر آگرا ہے اور پھر ملکی ملکی سسکیوں کی آواز اور نرم دناؤک ہاتھوں کا لمس اور چڑیوں کی مترنم جھنجکار۔

"یہ کون تھا؟"

یہ کوئی ٹریڈ یونین لیڈر تو نہیں تھا۔

یہ کوئی انقلابی بھی نہیں تھا۔

یہ میری اکلائی، پہلی اور آخری بیگم تھی! جو کہہ رہی تھی۔

"اٹھا کھانا کھا لو۔ مجھے غیہ نہیں آ رہی ہے۔"

# سوانا ایک بیمار

میں کئی برس سے بے حد شرمندہ تھا کہ مجھے کوئی سیریس بیماری لاحق نہیں ہوئی تھی۔ ہونے لگتی تو خیر ذکاوت میں بدل جاتی یا سرور دیا پیٹ درد میں۔ احباب اور رشتے دار طعنہ دیتے کہ ان غیر ضروری بیماریوں پر آپ سے کوئی کیا ہمدردی کیسے میری بیوی تو کٹناٹھے اشارے سے کہیں بار کبہ چکی یعنی کہ میں آپ کی خاطر مر مٹنے کے لئے بھی تیار ہوں۔ لیکن مر مٹنے کی کوئی غلطی بنیاد بھی تو ہو۔

اور سچائے کس کی دعا قبول ہوئی کہ ایک صبح شیڈ کر کے اٹھا تو اجانک غرض پائے کیا راہ لبتا کہ چلا میں میری بیوی جو اس نا در لچے کے انتظار میں ادھیڑ ہو گئی تھی ڈاکٹر کو بلا لائی جس نے کہا: "یہ بیماری سیریس ہے۔"

بیوی نے بے ساختہ کہا: "ہائے یہ بیماری سچے لگ جائے۔"

ڈاکٹر بولا: "یہ متنازعہ مسئلہ ہے۔ ہسپتال میں جا کر فیصلہ ہو گا۔"

چند منٹ بعد احباب اور رشتہ دار جمع ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اب فکر تو منسوی راہ راست پر چل پڑا ہے۔ ان کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو بہہ گئے۔ میری بیوی نے جذبات سے کانپتے لفظوں میں اعلان کیا کہ وہ میرے غنیمتِ صحت پر یقیوں کو کھانا کھلائے گی ہسپتال کے بڑے ڈاکٹر نے بتایا ممکن ہے بھائی صحت پر کئی سال لگ جائیں۔

کئی سال ۔ مجھے یقینوں کا مستقبل بے حد تاریک نظر آیا ۔  
 ہسپتال کے ہیڈ پر لیٹتے ہی میں غصہ سے پھولا نہیں  
 سمایا ۔ کہ اب سیریس بیماری کی بدولت کئی لوگوں پر احسان  
 کر سکوں گا ۔ اور مجھ سے سمجھ رہی کا فراخ دلانا استعمال  
 کر سکیں گے انہیں ٹھنڈی آہیں بھرے اور آئسو بیاتے  
 کا نادر موقع مل جائے گا ۔ اور وہ میری ایک جنبش لب پر گردنیں کھڑائی پر بھی تیار  
 ہو جائیں گے ۔ میری بیوی ہر پرسان حال کے ہونٹوں پر اسٹگی رکھ کر کہہ سکے گی کہ  
 سرہانے میرے آہستہ بولو

ابھی تک روتے روتے سو گیا ہے

مجھے خوشی یہ تھی کہ زندگی میں کسی کے کام تو آیا ۔ اور نہ آج تک زندگی بالکل  
 رنگینان بنی رہی تھی ۔ نہ آئسو نہ قسم نہ خلوص ۔ نہ کسی کا امتحان نہ کرنی سمجھتی !  
 ایک دوست نے موقع سے فائدہ اٹھایا ۔ ہرلا ہسپتال کا میڈیکل سپرنٹنڈنٹ  
 میرے کالج کا سائنسی ہے ۔ مجھ سے سٹینڈنگ کی گائیڈنگ مانگ کرے جایا کرتا تھا ۔  
 چنانچہ اسے ٹیلی فون کیا کہ ہمارے مریض کو فوراً میڈیا جائے ۔ ہسپتال میں ہیڈ میٹر  
 آئے کا مطلب ہے ۔ جیسے کسی بے روزگار کو اپائنٹمنٹ لیٹر مل جائے ۔ ایک پروفیسر دوست  
 نے تبصرہ کیا : ” اچھی بیڈ کیوں نہ ملتا ۔ فکر صاحب کی رسائی تو منسٹروں تک ہے ۔ “  
 اور مجھے منسٹروں کی پستی پر رحم آگیا ۔

ہیڈ کے بعد احباب اور رشتے دار بڑے سرگرم ہو گئے ۔ چاروں طرف مبالغے  
 مبالغے پھرنے لگے ۔ ایک رشتے دار نے انکشاف کیا کہ بلڈ پریشر کے انچارج سے میں نے  
 کہہ دیا ہے کہ شکر کیجئے ۔ ایک عظیم مریض آپ کے ہسپتال میں داخل ہوا ہے ۔ اور  
 دوسرے صاحب نے اطلاع دی کہ اس وارڈ کا انچارج ڈاکٹر میری خالہ کا چوتھا بیٹا  
 ہے ۔ اس کی لومبرج سے پہلے کے سبھی لومبرج میں نے ہی ڈرافٹ کر کے دیئے تھے ۔ ایک  
 دوست نے بیک وقت تین اخباروں میں میرا نوٹس لٹے کروا دیا ۔ تاکہ میری موت کے

بعد بطور یادگار کام آئیں۔ کافی ہاؤس میں چار پانچ دوستوں نے ریترو لیوشن پاس کر لیا کہ خدا نہ بخواتے اگر فکر تو نسوی انتقال کر گیا تو سارا کافی ہاؤس نہ صرف شمشان بھومی تک جاٹے گا۔ بلکہ پسماندگان کے لئے چہرہ بھی اکٹھا کرے گا۔  
احتیاطاً چندے کی اپیل کا مضمون بھی ڈرافٹ کر لیا گیا۔

یہ سرگرمیاں دیکھ کر یوں لگا۔ جیسے سارا ہندوستان میری بیماری کی خاطر زندہ ہے۔ ہر روز کئی ڈاکٹر مجھے بیمار شری میں لے جاتے اور مجھ پر تجربے شروع کر دیتے۔ جیسے وہ ڈاکٹر نہ ہوں۔ طالب علم ہوں اور میں ایک کافی ہوں۔ جس پر وہ ہوم ورک کر رہے ہوں۔ میں نے ایک ڈاکٹر سے پوچھا۔ "آپ مجھ پر سیرج کیوں کر رہے ہیں۔"  
وہ بولے۔ "تاکہ آپ کی وجہ سے نئی نوع انسان کو قائم نہ بن جائے۔"  
میں نے کہا۔ "اگر میں بیمار رہتا تو نئی نوع انسان کا کیا بننا؟"

اس پر ڈاکٹر نے اسٹنٹ کو حکم دیا۔ کہ اسے ٹیشک ڈیپارٹمنٹ میں لے جاؤ۔  
دماغ میں کبھی غلط معلوم ہوتا ہے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ میرے دماغ میں غلط نہیں ہے بلکہ مسرت ہے۔ کیونکہ میں نے سن رکھا تھا کہ ہسپتال کا ماحول بے حد دردناک ہوتا ہے۔ کئی ادیب تو دماغ جا کر ناول تک لکھتے ہیں۔ اور اپنی بیماری سے ادب عاید میں اضافہ کرتے ہیں۔ بلکہ کئی تو نرسوں سے بھی پیار کرنے لگتے ہیں۔ اور وہ تو کمری پرلات مارکر ان کے ناول کا ایک پیرا گراف بن جاتی ہیں۔

چنانچہ ایک دن میں آنکھیں بند کئے بیڈ پر پڑا تھا کہ جیم سے ایک نرس آئی۔  
رودمانٹک نہیں تھی، حسین بھی نہیں۔ اس نے میرے بیڈ کے سر پرانے میلے گتے پر ایک میڈیکل چارٹ لگا دیا۔ اور چلی گئی۔ اور مجھے یوں لگا۔ جیسے وہ میری قبر پر دیا جلا کر جا رہا ہے۔

اسی طرح جب مجھے بیڈ پر رہائش پذیر ہوتے ہوئے کئی چھپے گزر گئے تو مجھے شک ہونے لگا کہ ڈاکٹر حضرات کو خدمتِ خلق سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ ان کی حالت اس خدمت کی سما ہے۔ جو ہر روز مشیر کے لئے کھانا تیار

کرتی ہے۔ سچ کو ملک ٹرلوے دودھ اور خام کو سبزی لافتی ہے اور اسے سگرستی ہی کہتی ہے۔ یوں لگا۔ کہ یہ اکثر بھی خدمت خلق سے اگنا چکے ہیں۔ اور جیب بھی مریض کے مارٹ یا پیسٹری کی رپورٹ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تو یوں محسوس کرتے ہیں جیسے آلو چھیل رہے ہوں۔ یا سبزی میں نمک اور مرچ چکے رہے ہیں۔ ایک دہی میں نے ایک ڈاکٹر سے پوچھا۔ ”آپ کے اندر انسانیت کا جذبہ کیوں مر گیا؟“ وہ دو دو فی چار کا پیازا پٹر مٹتے ہوئے بولا۔ ”جنگائی اور کرپشن کی وجہ سے اب انسانیت تو ایک اچھوت بن کر رہ گئی ہے۔ ہم ڈاکری کے لئے خدمت کرتے ہیں۔ خدمت کے لئے ڈاکری نہیں کرتے۔“

یہ سن کر مجھے افسوس ہوا کہ مریض بننا بھی بیکار ہو گیا۔ مریض ہو یا صحت مند ہر جگہ اچھوتوں کی دنیا ہے۔ جو مریض سمجھتا ہے کہ وہ ڈاکٹر کو انسانیت پر مجبور کر دے گا بہتر ہے کہ وہ صحت مند ہی رہے۔ کیونکہ ڈاکٹر بے چارے کے پاس تو اتنی فرصت بھی نہیں ہوتی کہ کسی لیڈی ڈاکٹر پر پیار کی نظر ڈالنے سے پہلے پوچھ لے کہ تمہاری تنخواہ کتنی ہے۔

آہستہ آہستہ میرے پرسان حالی غائب ہوتا شروع ہو گئے۔ البتہ ہسپتال سے باہر ہر راہ چلتے سے پوچھتے پھرتے، ”بھائی، ٹنگر صاحب کا بیڈ نمبر کونسا ہے؟“ اور پوچھنے کے بعد بیڈ نمبر یاد رکھتے، مجھے بھول جاتے۔ اور ایک دن ایسا آیا کہ سبھی پرسان حالی نظروں سے اوجھل گئے۔ اور میرے بیڈ کے پاس صرف چند شیشیاں۔ ایک میڈیکل چارٹ اور بیوی رہ گئی۔ شاید احباب بیماری کی طوالت سے بور ہو گئے اور سوچنے لگے کہ زندگی صرف بیماری کے گرد تو نہیں گھومتی۔ کئی اہم کام اور بھی ہیں مثلاً ٹینگ اٹال ہے۔ نوکیوں کو چھڑتا ہے۔ پڑوسیوں سے ملتا ہے۔ اور یوں میں غیر دلچسپ ہوتا گیا۔ اور محسوس کیا کہ بیماری کو عادت نہیں بنا لینا چاہیے۔ اتنی بڑی کائنات میں ایک مریض تو مدغم سا نقطہ ہے۔ جس سے کوئی لفظ نہیں بنتا، کوئی کیر نہیں بنتی۔

میں سے ایک افسانہ نگار دوست نے خط لکھا۔ "تم خوش قسمت ہو کہ دہلی میں بیمار پڑے ہو۔ جہاں پر سان حال مل جاتے ہیں، لیکن میری بد بختی کہ میں نے نہر علاقہ پر پڑا ہوں۔ جہاں پر سالی حال اس لئے نہیں آتے، کیونکہ وہ میری بیماری سے زیادہ اہم کاموں میں مصروف ہیں۔ مثلاً مالک مکان سے تو تو میں میں کر رہے ہیں تو کل ٹرین کا تقاب کر رہے ہیں۔ جو کہ مٹانے کے لئے کچھ وقت کیلوں کا رسٹ پر چھتے رہتے ہیں اور کچھ وقت ٹھنڈی آہیں بھرتے رہتے ہیں۔ چھ ماہ تک پر سان حال کا احتیاط کرتا رہا کل کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ تو میں بڑا خوش ہوا کہ دنیا میں ابھی درد مند لوگ موجود ہیں۔ دروازہ کھولا گیا۔ تو نو دروازہ اندر داخل ہوا۔ یہ میرا پڑوسی تھا۔ بولا۔

"نہ کار کرتا ہوں آپ کے یہاں ایک ضروری ٹیلیفون کرنا تھا۔ ۱۰ مارتھ ہو تو کروں۔"

میں نے اس خط پر مجھے آبدیدہ ہو جانا چاہئے تھا۔ مگر اتنے میں تھک کر کے ایک پروڈیوسر صاحب تشریف لائے مجھے شرمندہ کرتے ہوئے بولے۔ "نکر صاحب! آپ تو بیماری سے چھٹ ہیں گئے ہیں۔ میں پوچھنے آیا ہوں کہ یو ڈرامہ آپ ہمارے لئے لکھ رہے تھے۔ اس کے تین صحن ابھی باقی ہیں۔ ان کا کیسے گا؟

میں نے کہا۔ غسل صحت کے بعد ہی لکھوں گا۔"

بولے۔ "جلدی جلدی غسل کیجئے۔ بہارا بڑا نقصان ہو رہا ہے۔ یہ آلو بھارا آپ کے لئے لایا ہوں۔ اسے کھائیے اور سوچئے کہ دوران مرض آپ وہ ڈرامہ مکمل نہیں کر سکتے۔"

ایک اور نزدیکی رشتہ دار آئے، میڈیکل چارٹ آنکھوں سے لگایا اور بولے۔ "آپ جلدی جلدی صحت یاب ہو جائیے۔"

میں نے عرض کیا۔ "آپ کو اتنی کیا جلدی ہے۔"

وہ روتے ہوئے بولے۔ "دراصل آپ کی طبیعت کے بیاہ کا مسئلہ بتا رہا ہوں۔"

مقرر کر لی ہے۔ کل تک ہے کہیں لڑکے والے مکر نہ جائیں۔ مگر آپ کی بیماری کی وجہ سے دے کے ہوئے ہیں۔

میں نے کہا۔ ” غلط میری ہے کہ کل تک میں بیمار ہوا۔ آپ بیاہ کر دیجئے میری بیماری پر بعد درست کیجئے۔“

چند دن بعد معلوم ہوا کہ انہوں نے بیاہ کر دیا ہے۔ اور میری آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ نکل سکا۔ جسے شادی کے دعوتی کارڈ پر ہوا سکوں۔ البتہ اتنا ضرور کیا کہ ہسپتال کے قواعد توڑ کر گھر آگیا۔ پرسانِ حال کے بھروسے پر کوئی گھنٹہ تک بیمار رہتا چلا جائے۔

گھر آ کر ایک رشتہ دار کا پیام ملا کہ میں ہسپتال میں اس لئے حاضر نہیں ہو سکا کیونکہ میرا بیٹا جوئے میں گرفتار ہو گیا تھا۔ ایک دوست نے چپ بھجوائی کہ میں صرف مختصص صحت مند حالت میں دیکھ سکتا تھا۔ بیماری کے عالم میں نہیں۔ اس لئے پریشانی کو نہیں آیا۔ ایک اور دوست سے کافی لمبے وقت میں ملاقات ہوئی۔ ہمیں کربوے ” اتنا ضرور متا تھا کہ تم بیمار ہو۔ لیکن میں سمجھا۔ مذاق کرنا بہتاری عادت ہے بیماری سے بھی تم نے مذاق ہی کیا ہوگا۔“

اس کے بعد میں ہر رشتہ دار اور دوست کے گھر جا کر پیام دے آیا کہ میں ابھی تک بیمار ہوں۔ اس لئے مرق غنیمت ہے۔ اگر پوچھ جاؤ۔ ایک دوست آئے شکایت کرنے لگے۔ کہ میں ہسپتال میں ہڈیاں جوڑنے والے وارڈ میں حمیض ٹھونڈا پیرا۔ تم ملے ہی نہیں۔ کم از کم یہ تو بتا دیجئے۔ کہ آپ کی ہڈی نہیں ٹوٹی۔ اعصابی نظام ٹوٹا ہے۔

میں نے معافی مانگی اور وعدہ کیا۔ کہ آئندہ موقع ملا تو ہڈی ہی تڑوا دینگا اور پھر یوں ہسپتال سے باہر آ کر میں نے محسوس کر دیا دلی کی ویسی ہے کسی کو کسی کی خبر نہیں۔ بہر آدمی ایک دوسرے کے سامنے قہقہے لگانے میں مصروف ہے۔ کون مر گیا۔ کس کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ کس کی آنکھ پھوٹ گئی۔ اس سے بے نیاز دنیا کا

ہر آدمی اپنی ہما چند سانس گھنٹے میں مصروف ہے۔ اور پھر انھوں نے مجھے اپنے  
 آپ میں یوں کھپا لیا۔ جیسے میں بیمار نہیں ہوں، جیسے میں کبھی بیمار نہیں ہوا تھا۔ البتہ  
 ایک دوست زیادہ مہربان نکلتے۔ مجھے اپنے گھر لے گئے اور بولے۔ "تم آج تک  
 غلط دوائیاں استعمال کرتے رہے۔ یہ روشنی اسے استعمال کرو تیر بہد وقت۔"  
 "آپ نے یہ ڈاکٹری کب سے سیکھی؟" میں نے پوچھا۔  
 "اپنے نانا جانی سے۔ وہ بھی اس بیماری میں انتقال کر گئے تھے۔"



# ور کے لئے کینیا کی ضرورت

یہ اشتہار ہمیں آج سے دس سال پہلے دنیا چاہئے تھا۔ لیکن ان دنوں وہ یعنی بر خرو دار علی چند "دنیا کے عظیم میراث" نامی کتاب پڑھنے میں مصروف تھا اور کہتا تھا۔ "جب تک لائبریری میں یہ کتاب موجود ہے میں شادی نہیں کراؤں گا"

اور اب جب کہ ہم یہ اشتہار دے رہے ہیں۔ اس کتاب کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ بلکہ لائبریری میں اس کا تازہ ایڈیشن بھی آگیا ہے۔ مگر اس کے باوجود بر خرو دار علی چند شادی پر آمادہ ہو گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اب اسے رات کو ڈراؤٹے خراب آئے لگے ہیں بلکہ کئی بار تو خراب میں آسمان پر اڑتے اڑتے بحر اوقیانوس میں جا گرا ہے۔

بر خرو دار علی چند کا قدم ٹھکنا ہے اس لئے وہ طبعی خیالات کا مالک ہے۔ اونچی پاری کے اتاروں میں بیٹھ کر بتانا ہے کہ ہمارے اندر کون کون سی خرابیاں ہیں۔ علی چند میں یہ بلند خیالی ان دنوں پیدا ہوئی اچھی دنوں فول گر افروں نے یہ پروپیگنڈہ شروع کیا تھا کہ فول گر کھنچواتے وقت مسکراتا ضرور جاتا ہے۔ دراصل وہ ہندوستان کی بیداری کا رونا تھا۔ ہر ہندوستانی کو شک گزرتا تھا۔ کہ ہندوستان بیدار ہو رہا ہے۔ لیکن مشرق اور ڈر کے مارے کوئی کسی کو بتانا نہیں تھا۔ مگر علی چند کی نڈر تھا۔ وہ بلا جھجک ہندوستان کی



ہو چکے ہیں اور کچھ بال اڑ چکے ہیں۔ جونہی اس کی کوئی محبوبہ شادی کرتی۔ علی چند کے کچھ بال یا تو اڑ جاتے یا سفید ہو جاتے۔ اور اب اس کے اندر ایک ایسی ضروری آجلی ہے، جیسے شادی کے دس سال بعد کسی خاندان میں آ جاتی ہے۔ خاندان کی سی ضروری پاکر اب وہ خاندان بن جاتا چاہتا ہے۔ اور یہ بھی چاہتا ہے کہ جس کنیا سے بیاہ کرے، وہ کم از کم اس کی حسرتوں کی داد ضرور دے، وہ کم از کم یہ ضرور محسوس کرے کہ اس قبر کے نیچے کتنا عظیم الشان مردہ دفن ہے۔

علی چند تسلیم یافتہ آدمی ہے۔ اور ایم۔ اے میں دومرتبہ فیل ہو چکا ہے۔ ایک مرتبہ تو وہ اس لئے فیل ہو گیا تھا کیونکہ وہ اپنی ایک کلاس فیلو لڑکی سے رومانس کر رہا تھا۔ فیل ہونے کی وجہ بعد میں صحیح نہیں نکلی۔ کیونکہ وہ لڑکی ایم اے میں پاس ہو گئی تھی۔ یہ نہیں ہوتا کہ امتحان ایک کوفیل کر دے اور دوسرے کو پاس محبت تھی ہو تو اس کے اثرات یکساں ہوتے ہیں۔ لیکن علی چند کا بیان ہے کہ وہ لڑکی چونکہ بیوہ تھی، اس لئے وہ اندیشہ تھی۔ اور وہ بیک وقت محبت بھی کرتی تھی اور پڑھائی بھی۔۔۔۔۔ بہر کیف کچھ بھی تھا علی چند اور اس لڑکی میں بالآخر صرف دو فقرات کا تبادلہ ہوا اور محبت ٹوٹ گئی۔

”ڈیر شو بھا! کچھ دنوں سے تمہارا رویہ عجیبانہ نہیں رہا۔“

”ڈیر علی! محبوبیت ہم دونوں میں شاید بچتی ہی نہیں۔“

اور برخوردار علی چند دوسری مرتبہ اس لئے فیل ہو گئے تھے۔ کیونکہ اس بار بہت سے اور بھی لڑکے فیل ہو گئے تھے۔ مگر کتبیہ نے اس کے دوسری بار فیل ہونے کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ بلکہ صرف اتنا کہا کہ اب علی چند کو شادی اور ایم۔ اے کے امتحان، دونوں میں سے ایک چیز کا فوری انتخاب کر لینا چاہیے۔

برخودار علی چند ہنسا پر کھلتے پتے گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ (مگر میں دو چراغ اور بھی ہیں) اس کے والد صاحب جناب فاضل چند تھی، جن سے برخوردار

علیٰ چند کو شدید نفرت ہے ، سوسائٹی کے معزز فرد ہیں ۔ اُن کی بیوی اُن کے سامنے بچوں کی طرح کانپتی ہے ۔ کانپنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ فاضل چند جی کے پاس پچاس ہزار روپے کی جائیداد ہے اور جائیداد کے تلذذ سے نہ بیٹا محروم رہتا چاہتا ہے نہ ماں ۔ اس لئے دونوں فاضل چند جی کے ستم بہتے ہیں اور دیک کر رہتے ہیں ۔۔۔ ایک مرتبہ سنا کر ہے کہ علیٰ چند نے ایک صاحب کو اپنے والد کے ہاں بھیجا ۔ تاکہ اُن سے ایک لڑکی (محبوبہ) کے رشتے کی بات چیت چلائے مگر فاضل چند جی نے ان صاحب کو جھڑک کر کہا تھا ۔ ”علیٰ چند نام کا کوئی لڑکا میرے گھر میں نہیں رہتا۔ بھاگ جائیے۔۔۔۔۔“

چنانچہ علیٰ چند کے کیریکڑ کی تعمیر و تخریب میں باپ کی سخت گیری اور ماں کی مظلوم نرمی دونوں کا ہاتھ ہے ۔ فاضل چند جی باپ کو ٹھالیاں دیتے ہیں اور ماں روپے دیتی ہے ۔ اگر سوسائٹی میں فاضل چند جی کی عزت نہ ہوتی تو وہ ماں بیٹا دونوں کو خانہ بدر کر دیتے ۔ مگر سوسائٹی کسی عزت دار آدمی کو ایسا نہیں کرنے دیتی ۔ لہذا فاضل چند جی مجبور ہیں ۔ کہ وہ علیٰ چند کی نفرت کے باوجود اُسے ہی جائیداد کا وارث بنائیں ۔ فاضل چند جی اتنے بیوقوف نہیں ہیں کہ صرف بیٹے سے نفرت کی خاطر اپنی جائیداد کسی دھارمک سنگھ کو دان میں دے دیں ۔

لہذا جس کنسیا سے علیٰ چند کا بیاہ ہوگا وہ ایک صاحب جائیداد خاوند کی بیوی کہلائے گی ۔ کیونکہ علیٰ چند اب اپنے انقلابی خیالات کی اُس منزل پر پہنچ چکا ہے ، کہ وہ اپنے باپ کی پچاس ہزار روپے کی جائیداد کو ٹھکرائے گا نہیں بلکہ یوں قبول کرے گا جیسے رام بن باس کے وقت بھرت نے ابو دھیا کی گدھی قبول کر لی تھی ۔

اس جائیداد کے علاوہ ۔ اگر کنسیا چاہے تو گھر سے جینز لاکر اس میں خاندان بھی کر سکتی ہے ۔ اگرچہ علیٰ چند جینز کا قائل نہیں ہے ۔ لیکن اگر کنسیا کی شکل و صورت اچھی نہ ہو تو وہ جینز لانے میں بھی بُرائی نہیں سمجھتا ۔ البتہ

اس کے والد فاضل چند جی کا خیال ہے کہ جہیز کا تعلق حسن سے نہیں، عزت سے ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حسین بہو کو بھی جہیز لانا چاہیے۔ کیونکہ بہو کے ہونٹ چاہے کتنے ہی گلابی کیوں نہ ہوں۔ اگر جہیز نہیں لائے گی تو ان ہونٹوں پر کوئی بوسہ محبت ثبت نہیں ہو سکے گا۔

بہر کیف ہمیں ایک ایسی کتیا کی ضرورت ہے جو فاضل چند جی اور علی چند دونوں کے خیالات کا چھوڑ ہو۔ اور اگر کوئی ایسی کتیا مادرِ غمیت نے پیدا نہیں کی تو کوئی ایسی کتیا بھی قبول کر لی جائے گی جو علی چند کی طرح یادِ محبوب میں ابھی تک کنواری بیٹھی ہو۔

برخوردار علی چند کا معیار حسن کیا ہے۔ ۹۔ اس کے تعلق خود علی چند اپنے آپ سے اختلاف رائے رکھتا ہے۔ مثلاً وہ بڑی بڑی غلافی آنکھوں کو پسند کرتا ہے۔ لیکن غلافی آنکھوں والی لڑکی کی کمر موٹی نہیں ہونی چاہیے کیونکہ سنی کمر پر علی چند کو کئی شعر بہت زیادہ پسند ہیں، لیکن فطرت کسی کی شادی کے حساب سے تو لگن نہیں بناتی۔ فطرت تو ڈکٹیٹر ہے۔ سوشل ریگلاٹر نہیں ہے۔ کہ غلافی آنکھوں اور کمر میں ترمیم و تسخیر کر کے سماجی برائیاں دور کرتی رہے۔ — لہذا علی چند فطرت اور موٹی کمر دونوں سے تالاں ہے۔

دوسری طرف — علی چند چاہتا ہے کہ لڑکی شریلی ہو۔ اور جب بات کرے۔ تو اس کے خوبصورت ہونٹ فرط حیا سے ہنر خزانے گلیں۔ لیکن فرط حیا دالے کئی ہونٹ علی چند نے دیکھے ہیں۔ کہ فلسفہ اور دنیاویات پر بحث نہیں کر سکتے۔ لڑکی ایک فقرہ بولتی ہے تو ہزار بار ساڑھی کا پلو جباتی ہے۔ ایک بار علی چند نے اپنی ایک محبوبہ سے کہا تھا "نیلی! فلسفی سپائی نوزا کی اخلاقیات سے مجھے بہت پڑ ہے۔ اس شخص کی بنیاد میں سے ایک بچے کی پڑ آتی ہے۔ تیار کیا خیال ہے؟" اور نیلم نے فرط حیا سے ہونٹ ہنر خزانہ کہا تھا۔ مجھے خود بچے پسند نہیں ہیں۔ شادی کا مطلب بچے بائیں نہیں ہیں ڈیر! "

مگر علی چند اعلیٰ ملک ہندوستان کے مقرر ہوتے ہوئے ہونٹوں سمیٹ کر ہی طرح  
 مایوس نہیں ہوا۔ اس کا خیال ہے کہ فطرت ایک نہ ایک دن سپائی لودا اور مقرر ہوتے  
 ہوئے ہونٹوں کو ضرور یکجا کر دے گی۔ لیکن فی الحال وہ کسی بھی ایسی لڑکی سے پیار  
 کرنے لگا جس کے صرف ہونٹ ہی مقرر ہوتے ہوں۔ سپائی نوز اکا پارٹ وہ خود ادا  
 کرنے لگا۔

لڑکی تعلیم یافتہ ہونی چاہیے یا نہیں۔ اگر ہونی چاہیے تو کس حد تک؟ اس کے  
 متعلق چارہ کوئی آزادانہ رائے نہیں ہے، سماج کی رائے ہی مہربانی رائے ہے۔ یہ سماج  
 کی کیا رائے ہے، اس پر سماج میں بھی اختلاف رائے ہے۔ علی چند کہتا ہے کہ جو لڑکی  
 غالب کا شعر صحیح صحیح پڑھ سکے مگر کچھ نہ سکے وہ لمبے پسند ہے، مگر علی چند کی ماں کہتی ہے  
 کہ جو بہو خاندان کی قیاس کے بنی ٹانگ کے بڑی سریش کنیا ہے۔ اور اگر غالب کے اشعار  
 میں بنی ٹانگ کی تعلیم دی گئی ہے تو بچے زیادہ خوش ہوگی۔ مگر محترم ناضل چند بھی کا خیال  
 ہے کہ کنیا کو اتنی تعلیم ہرگز نہ دلائی جائے کہ کسی بھی دفتہ دفتر میں نوکری کر لینے کی دھمکی  
 دینے لگے۔

بہر کیف اس بات پر سارا سماج متفق ہے کہ کنیا اپنے در سے کم تعلیم یافتہ  
 ہو تاکہ گھر میں امن قائم رہے۔ حد سے زیادہ تعلیم دینا کس سے۔ اور ایسے ہی اعلیٰ معیار  
 پیدا کرتی ہے جن کا بعد میں علاج ممکن نہیں۔ اس لئے کم تعلیم ہی بہتر ہے، علاج سے  
 بہتر بہتر ہے۔

البتہ اگر کنیا خوبصورت ہو، سڈول ہو اور پڈنگ بھی اچھا بنا سکتی ہو تو یہ  
 ضروری نہیں کہ وہ غالب کے اشعار بھی پڑھ سکے۔ ایسی صورت میں غالب والی  
 شرط اڑائی جا سکتی ہے، کیونکہ غالب تو دراصل پڈنگ کا نعم البدل ہے۔

اس کے علاوہ ہم کنیا کے لئے چند عام فہم شرطیں بھی عرض کرنا چاہتے ہیں۔ ایسی شرطیں  
 جن کے بغیر کوئی چوری، جوی نہیں کہلاتی۔ خاوند لگتی ہے۔ مثلاً سنگٹھ ہو یعنی ٹوٹا پیٹا ہو  
 اپنی سقرہ جگہ پر رکھا جائے، نہ کہ جو ہوں کے بل سے برآمد کرنا پڑے۔ دنا شمار ہو یعنی

اگر خاندان کے سر میں درد ہو تو جوئی کا سمدہ خراب ہو جائے، بڑوں سے بڑے بچے کے تعلقات رکھنے کیونکہ ان سے کئی ہزار آٹا اوروں کو کھانا عاریتاً لینا پڑتا ہے، کفایت شعار ہو، اگر خاندان کے خزانے پر اعتراض نہ کرے، کیونکہ خاندان لوگ بڑے ذکی الحس ہوتے ہیں، اور شدت جذبات میں گھراؤنا ہی بچوڑ دیتے ہیں۔ اور بر خور اور علیٰ چند تو اتنا احساس ہے، کہ شاید ترک وطن ہی کر جائے۔

کھانا نہایت فنیس پکا سکتی ہو۔ اگرچہ گھر میں عام طور پر مال بھاجی ہی گئے گی منہ شہناہو کے بار چال میں ٹہنی کمال کر دکھاتے تھے، کپڑے دھو سکتی ہو، کچی کچی گنگناہی سکتی ہو، سپیلیوں میں میٹھ کر علیٰ چند کی مقبولیت کی ہوا باندھ سکتی ہو، ظلم دیکھ علیٰ چند سے دوائس کر کے، جیسے سنگترے کی بھانگیں بھیل کر نہ میں دینا اور اُس کے سر کے سفید بال نہایت پیلتے نہ لانا اور بھوپانہ عشوہ سے کہنا۔ جاؤ ٹہنی، ہمیں یہ بال اچھے نہیں لگتے۔

اشتہار ختم کرنے سے پہلے ہم ایک آخری استدعا کرنا چاہتے ہیں۔ کہ متذکرہ بالا تمام تشریحات اور شرائط صرف علیٰ چند کے پس منظر کے طور پر دی گئی ہیں۔ اس لئے کہ کیا کے والدین انھیں نظر انداز بھی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ اشتہار خلوص نیت سے دیا گیا ہے یعنی ہم واقعی علیٰ چند کی کہیں نہ کہیں شادی کر دینا چاہتے ہیں۔ کیونکہ علیٰ چند کی اب یہ حالت ہو گئی ہے، جیسے کوئی آدمی دن بھر کمرے میں بیٹھے بیٹھے آؤب گیا ہو، علیٰ چند کے پاس جو کچھ اپنا تھا وہ اس کا منہ پس منظر تھا۔ اور اب اُس کے پاس اپنا کچھ نہیں رہا۔ جو کچھ باقی ہے، سماج کا ہے۔ علیٰ چند کے تمام خیالات اپنے شریں پر پہنچ چکے ہیں۔ اور اب وہ بالکل شانت ہے۔ یہ خیالات اُس کے دشمن تھے۔ اور اب یوں لگتے ہیں جیسے کوئی اپنے دشمن کو قتل کر کے اُس کی لاش پر بیٹھا سکیاں بھرتے بھرتے سو گیا ہو۔

اس لئے موجودہ صورت حالات میں ہمیں ایک ایسی کینا چاہیے جو مرگ کینا ہو، کینا ہونا ہی کافی ہے۔ باقی تمام باتیں خلفشار ہیں۔ لڑکی جب گھڑائے گی تو بالکل اسی طرح مگر میں ڈھل جائے گی، جیسے آج تک ہندوستان کی ہر لڑکی ڈھل چکی ہے۔ اور اگر اشتہار میں کسی کو ہماری مردانہ عزت کی آواز آئے تو اُسے مرگ اشتہار کی ڈراما شگ کا نقص سمجھنا چاہیے اور کچھ نہیں۔۔۔ ۵۔۔۔

## میں مالک مکان بنا

اور آنسو بھری آنکھوں کے اصرار پر میں نے وہ ڈیڑھ کمرہ کرائے پر اٹھا دیا۔ اس سے اگرچہ خاندان کی روایت ٹوٹ گئی۔ لیکن بیوی نے نئی روایت قائم کر دی۔ شادی کے بعد خاندان کی حیثیت بیوی کے مقابلے پر سیکندری ہو جاتی ہے۔

یہ ڈیڑھ کمرہ میری مناسب ضروریات سے زیادہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ اس کا مصروف یہ تھا کہ میرا بڑا لڑکا کبھی کبھی اس میں گھس جاتا اور اپنی محبوبہ کے ٹوئٹر پڑھا کرتا تھا یا اس کے ایک تاریک گوشے میں کچھ خستہ قسم کی خاندانی دستاویزات پڑی رہتی تھیں جن کا میں خواہ مخواہ احترام کیجے جا رہا تھا۔

میری ٹریجڈی یہ تھی کہ میں انسانیت کو کرائے داروں اور مالک مکانوں میں تقسیم کرنا نہیں چاہتا۔ یہ اصول ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ انسانیت کے متعلق میری معلومات کافی ناقص تھیں۔ لیکن میرا خیال ہے اصول کا معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

میرے کرایہ دار کا نام گجاندھی تھا۔ جو اگرچہ نام معقول نام تھا۔ لیکن چونکہ وہ منسٹر سا سفارشی خدا لایا تھا۔ اس لیے مجبوراً میں نے کہا: ”گجاندھی! منسٹر تو سفارشی خدا کھد کر اپنا سوشلزم کا گڑا کر لیتے ہیں۔ مگر آپ کرایہ دار بن کر کیوں کرنا چاہتے ہیں؟“

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ جو بے حد مانوس تھی، اور بولا: ”جواب! مجھے جیوتشی نے بتایا ہے کہ اس جنم میں تم مالک مکان نہیں بن سکتے۔ صرف اگلے جنم میں چانس ہے۔“

جواب میں مصیبت تھی۔ — جو مجھے پسند آئی۔ مصیبت یہ ہے کہ مصعوم انسانیت کے راستے میں جیوتشی حائل ہیں۔ گجاندھی کے لیے میں جو سادگی اور پاکیزگی



تھی اس کی بنا پر میں نے پوچھا۔

”بھائی جان ! آپ اتنے شریف اور مہذب کیوں ہیں ؟“  
وہ جھپٹ بول اٹھا : ”یہ خاندانی وراثت ہے ، اس میں میرا کوئی دخل نہیں

جناب !“

عجیب بات ہے۔ کئی ماں باپ درٹے میں مکان چھوڑ جاتے ہیں۔ اور کئی صرف شرافت اور تہذیب — میں نے اُسے کہا یا۔

”گجانبند جی ! دراصل کمرہ تو ایک ہی ہے ، مگر میری بیوی نے ایک حق لگا کر اُسے ڈیڑھ کمرہ بنا رکھا ہے تاکہ ڈیوڑھا کرایہ وصول کر سکے اور شرفار کے لئے صرف ایک کمرے میں رہنا غیر موزوں ہے۔“

اور جواب میں اُس نے جیسے میری ساری خلافتی کی توہین کر دی اور کہا۔

”آدل تو مجھے شرفار میں شمار نہ کیجئے اور اگر آپ شمار کرتے ہیں تو اُس کا انکشاف دوسروں پر نہ کریں۔“ اس کے علاوہ گجانبند نے میری بیوی کا ذکر اپنے درٹے سے بھی زیادہ احترام کے ساتھ کر دیا کہ وہ بے حد معقول خاتون ہیں۔

اور میں بیوی کی معقولیت سے گھبرا گیا اور وہ ڈیڑھ کمرہ گجانبند کے حوالے کر دیا۔

تین مہینے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے گجانبند اُس ڈیڑھ کمرہ کو جنت سمجھ کر رہ رہا ہے۔ وہ اتنا سرنجان مریخ نکلا کہ محلے کے بچے سات چوہے تک نقل مکان کر کے جنت میں گھس گئے۔ شرفار کی بھی ٹریبونڈی ہوتی ہے کہ وہ چوہے اور انسان میں کوئی امتیاز نہیں برت سکتے۔

ایک دن محلے کے تین چار معزز لوگ میرے پاس تشریف لے آئے ، میرا مطلب ہے لباس سے وہ معزز سلووم ہوتے تھے۔ ایک نے کہا۔

”سہارک ہو ڈنگر صاحب ! آپ اب مالک مکان بن گئے ہیں !“

دوسرے نے وضاحت کا : ”جب تک کرایہ دار نہیں آیا تھا آپ مالک مکان

کہلانے کے مستحق نہیں ہوئے تھے۔

تیسرے نے کہا :- ”یعنی اب آپ میں ایک مغنوم پیدا ہو گیا ہے۔“  
چوتھے نے ایک نارم میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا :-

”اور اب آپ ہماری متحدہ رنگ پورہ مالک مکان ایسوسی ایشن کے معزز ممبر بن جائیے!“

میں نے اپنے علم میں اضافہ کرنے کی غرض سے پوچھا :-

”اس ایسوسی ایشن کے جنم کا کوئی معقول یا نامعقول مقصد ہے؟“

وہ بولے :- ”بات یہ ہے جی! کہ یہ کرایہ دار لوگ بڑے بد معاشر ہوتے ہیں۔“  
یعنی میرا کرایہ دار بھی بد معاشر ہے۔؟

”نہیں ہے تو ہر جائے ٹھا۔ اس لئے ہم مالک مکان آپس میں بھائی چارہ پیدا۔“

کرنا چاہتے ہیں اور آج سے آپ ہمارے بھائی ہیں؟

میرا جی چاہا، اُنھیں کہہ دوں کسی مفشر کی سفارش لائیے، جب آپ کا بھائی  
بہنوں گا۔ لیکن یہ شرط بھونڈی سلوم ہوئی کیونکہ اسے معززین آسانی سے پوری کر سکتے تھے  
آنکھیں بند کر کے دستخط کر دیئے۔ اگرچہ دستخط کے بعد اپنی حرکت پر بہت تعجب ہوا۔ چند  
دن پہلے میں نے گجاستند کو بھی اپنا بھائی کہا تھا۔ اب مکان مالکوں کا بھی بھائی بن گیا  
ہوں۔ یہ دو متہ ادم قسم کے بھائی.....؟ لیکن پھر سوچا۔ اس دنیا کے بھی  
انسان بھائی بھائی ہوتے ہیں۔

اسی شام گجاستند سے اطلاع عرض کر دیا کہ آج سے آپ بھائی صاحب نہیں  
ہیں۔ بلکہ کرایہ دار ہیں۔

اور گجاستند نے کہا :- ”چھوڑیئے جی! آپ تو مذاق کرتے ہیں؟“

لیکن میں مذاق نہیں کر رہا تھا۔ بہت سیریس تھا۔ ایسوسی ایشن کا (معزز)  
ممبر بن جانے سے میری ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں، اس لئے میں دن رات اس ٹوہ  
ہے دھ کہ گجاستند کے کمرے سے کوئی آواز نہ اٹھے اور میں جھپٹ بھاڑ دوں

فرش پر پتنگ کھسکانے کی آواز، رات کو دیر سے آنے کی آواز، چوہوں کے گھاس توڑنے کی آواز، منگائی کے خلافت گالیوں کی آواز، یہاں تک کہ اس کے بچوں کے رونے کی آواز بھی آئے تو میں لگا کر کہوں۔

”گجبانہ! اپنے بچوں سے کہو، رونا بند کر دیں! کیونکہ اس سے میرے بچوں کو معلوم ہو جائے گا کہ انسان روتے بھی ہیں۔ اور یوں میرے بچوں کا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔“

لیکن ایسی کوئی آواز شاید گجبانہ کے نصیب میں نہیں کھلی تھی، ایسی ایشن کے معزز عہدیدار وقت فوقتاً میرے یہاں دیر نہ کرتے رہے اور مجھ بتاتے رہے کہ گجبانہ سے کون کون سی بد معاشیوں کے امکانات، روشنی ہیں اور ان امکانات کا سہا باب کرنے کے لئے محتاط کب جانا چاہیے۔ گالیاں کب دینی چاہییں۔ پالتو کتا کب چھوڑنا چاہیے۔ اور غنڈے بھلا کر اعلیٰ شراب کب اور کیوں پلانی چاہیے۔ بلکہ ایک معزز عہدیدار کو تو اس بات پر بہت حیرت ہوئی کہ کرایہ دار کی وجہ سے ابھی تک آپ کی آتما کی شانتی میں خلل نہیں پڑا؟

میں نے اعتراض کیا کہ میری آتما میں کوئی نقص ہے۔

ایک دن ایسی ایشن کے پریذیڈنٹ جن کی شکل بھونڈی اور لباس حسین تھا آشریف لائے اور جیسے مجھ سے راز دارانہ لہجے میں ہمدردی کرنے لگے، فکر صاحب! ایسی ایشن کے معززین میں آپ کی قدر منزلت کچھ کم ہو رہی ہے۔ بلکہ کوئی ایک تو (سنت کیجئے) آپ کی نیت پر بھی شک کرنے لگے ہیں کہ آپ کی وجہ سے آپ کے کرایہ دار کے حوصلے بلند ہو گئے ہیں۔ جن کا اثر ان کے اپنے کرایہ داروں پر پڑ رہا ہے۔ میں نے عرض کیا: ”مگر پریذیڈنٹ صاحب! اسے میری ٹریجڈی سمجھئے کہ گجبانہ شریف اور بہت بے انسان ہے۔“

”وہ بولے۔“ یہ کجی ہو ہی نہیں سکتا۔ کرایہ دار ہند بھوتے ہی نہیں! مگر وہ کوئی غیر ہندو نہ حرکت نہیں کرتا۔“

”کیسے نہیں کرتا۔۔۔؟ اچھا بتائیے، غسل خانے میں جا کر غسل لیتا ہے کہ نہیں؟“

”اؤں ہوں۔۔۔“

”بڑا ڈال کرایہ دار ہے۔ آپ کرایہ دار بدل دیجئے!“

”ورنہ؟“

”ورنہ معززین آپ کا سوشل بائیکاٹ کرنے کے متعلق سوچ رہے ہیں۔ یہ مریخا دھکی ہن مگر خانہ آئی ورثے کے باعث میں اس دھکی کو چیلینج دے کر اہل نہیں رہا تھا۔ اس لئے سوچ سوچ کر میں نے گجبانند کے خلاف ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ کر لیا اور بازار سے گلیوں کی ایک کتاب لے آیا اور ساری رات اس کی سٹڈی کرتا رہا۔“

”اور دوسری صبح کو اپنے نچھٹے پھلکار گجبانند کے پاس پہنچ گیا اور کہا۔ تم انسان نہیں ہو۔ آؤ ہو!“

”وہ حیران ہوا۔ جس سے مجھے خوشی ہوئی۔“

”اور میں اس آؤ سے پوچھتا ہوں۔ یہ کھڑکی کا شیشہ کس آؤ کے پچھتے لے توڑا؟“

”آپ کے جھوٹے صاحب فرادے تے ہوا ایک ڈھیلہ عرض کر دیا۔“

”تو تھلاؤں! تم نے اس کے باپ کو فحش گالیاں کیں نہیں دیں؟“

”اجی، میں نے سوچا۔ بچے سب کے برابر ہوتے ہیں۔ اگر میرا بچہ ڈھیلہ

مار دیتا تو۔۔۔۔۔“

مجھے بہت طیش آیا۔ گویا اب یہ بچوں کی دلہیت کو کنفیوژ کر رہا ہے۔

بچے سب کے بچے ہوتے ہیں۔ سبھی انسان سببائی سببائی ہوتے ہیں، تہنہ بانا سببیں یہ کیسی دنیائے؟ کیسی اس کی تلاش ہے۔ میں ٹوٹے ہوئے شیشے اور تلاش کی درگت پر بڑبڑاتا ہوا لوٹ آیا۔ گلیوں کی کتاب آدھے دام پر فروخت کر دی۔ مجھے

گھماند معزز نہیں بنے دیتا۔ میرے الزامات کو احمقوں کی بڑکچھا ہے۔ ہتھ! پھوں!

میں دو تین دنوں تک شاید کرتا رہا کہ شاید وہ راجہ راست پر آجائے۔ تیسرے دن وہ آٹا مجھے راجہ راست پر لے آیا اور ملکینک کو بلا کر اپنے پیوں سے نیا شیشہ نٹ کر دیا اور میرے تنوں میں آگ لگ گئی۔ جی چاہا اپنے جھوٹے صاحب نادرے کو سوار پیہ رشتہ دے کر کہوں کہ اس نئے شیشے کو جی ڈھیلہ مار کر چٹکنا چور کر دو۔ لیکن وہ ناخلف نکلا۔ کہنے لگا۔ گھماند مجھے انگریزی کے سخن اتنی خوب سمجھتی اور پیار سے پڑھاتا ہے کہ میں ناخلف بنتا زیادہ پسند کروں گا۔

گویا یہ ایک سازش تھی۔۔۔ وہ میرے بچے اور بچے کے باپ میں بھڑک کا بیج ڈال رہا تھا۔ ایسے آدمی کو کرایہ دار رکھتا، اپنے پاؤں بلکہ اپنے خاندان کے پاؤں پر گھبراہٹی مارتا تھا! سوچ سوچ کر میں نے اس سازش کا توڑ تلاش کر لیا۔ دل ہی دل میں اس کی گلاں پکڑ لی۔ اور زبان بجا زبان سے کہا: اگلے ہفتے میرے بڑے لڑکے کی شادی ہے، اس نئے میرا کرہ خالی کر دو۔

حالانکہ میرے بڑے لڑکے کو اس کے ساتھی ہر لڑکی مسترد کر چکی تھی اور وہ تنگ اگر سماج کی نیش کام سید اکا پر وگرام بنارہا تھا۔ لیکن شادی کی خبر سننے ہی گھماند نے کہا۔

میں معزیزی رویتندہ کی شادی کی خوشی میں ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے تیار ہوں۔۔۔!

عجیب ہرلق انسان ہے۔ اسے مکان خالی کرنے کا غم نہ تھا۔ بلکہ میرے بیٹے کے بیاہ کی خوشی تھی۔ یعنی اب میں اس کا سامان بھی زبردستی نکال کر نہیں بھیج سکتا تھا۔ غصے میں آکر میں شام کو باگونی پر کھڑا ہو گیا اور ساری دنیا اور اس دنیا کو جانے والے خدا تک کو مٹانے کے لئے بلند آواز میں کہنے لگا۔

- نیئے حضرات ! یہ کیا بر معاشی ہے، میرا کرایہ داد مجھے زخمی کرنے کے لئے کل رات غنڈے لے آیا۔ اُنھیں مشراہیں پلائیں۔ لیکن میں اس غنڈہ گردی سے نہیں ڈرتا۔ میں اُس کی ہڈیاں چبا جاؤں گا ! کیونکہ سپرنٹنڈنٹ پولیس میری سالی کا بہنوئی ہے اور ڈپٹی کمشنر مجھ سے طالب علمی کے زمانے میں ریاضی کے سوال حل کروانا رہا ہے۔ جتھہ ! میں اپنے لڑکے کی شادی پر اس سے کمرہ خالی کروا کے رہوں گا ؟ یہ سچی کرا آسمان سے پھولوں کی بارش نہیں ہوئی۔ البتہ ایسوسی ایشن کے پریذیڈنٹ نے میرے اعزاز میں ساک ٹیل پارٹی کا اعلان کر دیا اھدیہ اعلان اُس وقت دو آتش ہو گیا جب مسیری جرات رندانہ دیکھ کر محض کے چند مشنڈے کرایہ دار میری بالکونی پر چڑھ آئے اور گر جئے گئے۔

• کون مائی کالال چاہو گجائنند سے کمرہ خالی کر دالے ! آپ کس بھی کرایہ قانون کے تحت یہ غنڈہ گردی نہیں کر سکتے ! ہم ڈپٹی کمشنر کے بھی ریاضی کے سوالوں کو غلط قرار دیں گے۔ جو ہم سے ٹکرائے گا، پاش پاش ہو جائے گا ! مجھے آن مشنڈوں کی جرات پر خوشی ہوئی گویا اب تنازعہ بڑھے گا اور دو آتش لطف آئے گا۔ لیکن گجائنند نے میرے کئے پر پانی پھیر دیا اور اپنا سامان پیک کرنے لگا۔ یہ میری دافنی شکست تھی۔ میں بھاگا بھاگا اُس کے پاس آیا اور اُس کا کندھا زور سے جھنجھوڑ کر بولا۔

”اے سوکڑے تنم ! مت جاؤ۔ اس کمرے کا کرایہ دگنا کر دو اور جھبک مار کر رہتے رہو !“

وہ چپ رہا۔۔۔ مغز میں میرا احترام زیادہ تھا۔ میں نے اُس کے بال و حشمتہ انداز میں کہنے لگے۔

”اے شیطان کی اولاد ! مجھے انگوٹھا دکھا دو اور کہو کہ میں ایک پیچیدام نہ بڑھاؤں گا !“

وہ اُسی طرح سامان باندھنے میں مصروف رہا۔

اب میرے ضبط کا پیمانہ ہرگز ہو گیا اور پیمانے سے اچانک ایک قطرہ

نکلا !  
 میں نے دگن کرایہ مانگ کر تم سے جھوٹ بولا ۔

۔ آپ جھوٹ بول ہی نہیں سکتے !

اور دوسرے لمحے وہ میرے ہر جھوٹ کو پاؤں سے ٹکرا کر چلا گیا اور میں  
 بے قرار ہو کر سیدھا اُس کمرے میں داخل ہوا اور اپنی خاندانی دستاویزات بھاڑ کر  
 کھڑکی سے باہر پھینک دیں !!





ماسٹر جی کو جانا ہوں کہ سورج کو میں نے ہمیشہ مشرق سے اُگتے دیکھا ہے، تو ماسٹر جی خوش ہو کر کھتے ہیں۔ آپ بچا فرماتے ہیں۔ میں نے خود سورج کو ہمیشہ مشرق سے اُگتے دیکھا ہے۔  
 یہی وجہ ہے کہ ہمارے تعلقات جو فنگوار چلے آ رہے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر اس دنیا میں کیلا اور سورج نہ ہوتا تو انسانی تعلقات کافی دگرگوں ہو گئے ہوتے۔

لیکن ایک دن اچانک ہمارے تعلقات میں پہلی دھڑکن لگی، کیونکہ ٹافون قدرت کو یہ منظور نہیں تھا کہ ہم ایک دوسرے کو آن جانے میں بے وقوف بناتے رہیں۔  
 ہوا یہ کہ ایک دن ماسٹر جی لال نے مجھ سے بڑی سنجیدگی سے کہا: ”لو جی!“

میں مشہور ہونا چاہتا ہوں؟

میں نے عرض کیا: ”آپ کو محض مشہور ہونا چاہیے۔ وہ نہ آپ ہمیشہ کیلا بنے رہیں گے۔ اور آپ کو قبض نہیں ہونے دیں گے۔“

وہ بے حاشہ ہنس دیتے — لیکن فوراً بعد جیسے انہیں خیال آیا کہ وہ انہی ہی سنجیدہ بات پر ہنس رہے ہیں، چنانچہ ایک دم آداس یعنی سنجیدہ ہو کر بولے۔  
 ”آپ مجھ پر طنز کر رہے ہیں۔“

”میں نے کہا: ”نہیں، یہ میری عادت ہے، نیت نہیں۔ آپ فرمائیے کہ مشہور ہونے کے لئے آپ نے کون سا طریقہ سراپا ہے؟ مثلاً گذشتہ دنوں ہمارے محلے کے ایک صاحب نے مشہور ہونے کی خاطر اپنی گلی کے سرے پر اپنے نام کی تختی پر کھکھ کر لگا دیا۔ پرکاش چند اسٹریٹ“ لیکن ان کی شہرت اس وقت خطرے میں پڑ گئی جب اسی گلی میں ایک کرایہ دار آکر بنے لگا۔ اس کا نام بھی پرکاش چند تھا۔ چنانچہ انہوں نے وہ تختی اتار لی چنیز سے نئی تختی پر لکھوا دیا۔ پرکاش چند مہو ترہ اسٹریٹ“ — اس لئے میرا مطلب یہ ہے کہ آپ مشہور ہونے سے پہلے یہ تحقیق ضرور کروالیں کہ اس شہر میں کسی اور آدمی کا نام تو ماسٹر جی لال نہیں ہے اور وہ آپ کی طرح مہو ترہ تو نہیں ہے۔

انہوں نے اپنے ماتھے پر اپنی استخوانی انگلیاں دو چار مرتبہ ماریں اور جیسے سارے شہر کا چکر لگا کر ڈیڑھ منٹ میں لوٹ آئے پھر بولے۔

صرف ایک ماسٹر حضرت لال ضرور ہے مگر وہ اسٹیشن ماسٹر ہے اور میں  
اسکول ماسٹر ہوں اور پھر وہ صرف اس لئے مشہور ہے کہ اس کی سات لڑکیاں  
ہیں اور لڑکا ایک بھی نہیں ہے۔

میں نے ان کی پیٹھ پر اطمینان دلانے والی تھپکی دی "خیر، ان کی مشہوری  
کی لائن الگ ہے، مگر آپ کی لائن کیا ہے؟"

"میں ایک فلم بنانا چاہتا ہوں۔" وہ واقعی مطمئن ہو کر بولے۔

"ضرور بنائیے۔ اور اس فلم کا نام اسکول ماسٹر رکھئے۔"

انہیں پھر شک ہو کہ میں طنز کر رہا ہوں، بولے: فکر صاحب! آپ پھر مذاق  
اڑا رہے ہیں۔ لیکن بچپن سے یہ میری تمنا ہے کہ میں زندگی میں ایک فلم ضرور بناؤں گا  
اور مجھے یقین ہے کہ میرے اس خواب کی تعبیر ضرور نکلتے گی۔"

"ہائے بچپن کے سہانے خواب!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ مگر انہوں  
نے میری بات شاید نہیں سنی اور بتاتے چلے گئے کہ میں نے فلم کے لئے ایک کہانی نہیں  
کہہ ڈالی ہے اور اس کا نام بھی رکھ لیا ہے۔" دوبارے ایک گلاب۔

اب میں سنجیدہ ہو گیا اور کہا: ماسٹر جی، اس نام سے ملحق جلتی ایک دو فلمیں  
چلے ہیں بن چکی ہیں۔ بلکہ ایک پروڈیوسر تو اسی قسم کے نام سے ایک مزاحیہ فلم بھی بنا رہا  
ہے۔ "ایک سیخ دو کباب" اس لئے بہتر یہی ہے کہ آپ کوئی چیز کا دینے والا نام  
رکھئے۔"

"نہ آپ ہی کوئی نام تجویز فرمائیے۔ انہیں مجھ پر بالفاظِ حد تک اعتقاد تھا۔ مجھے  
مجوزوں کے ٹیلے کے مبارک کو اس امر پر اعتقاد تھا کہ اس بچے کے سچے واقعی مجوزوں کو  
دفعہ کیا گیا۔

میں نے کہا: چلے آپ اپنی کہانی سنائیے، تب ہی اس کا کوئی معقول یا  
ناممقول نام تجویز کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ آجکل کی دنیا نے فلم سے۔۔۔ وہی نہیں ہے  
کہ کہانی کی تقسیم اور فلم کے نام میں کوئی تعلق ہو۔ لیکن جو کہ۔۔۔ رہا نام۔۔۔

ہیں اور غضب یہ کہ اس کی بدولت مشہور بھی ہونا چاہتے ہیں۔ اس لئے آپ کی کہانی کی روح قلم کے نام میں پوری طرح اجاگر ہوئی جیسا ہے۔"

انھوں نے شاید مجھے پروڈیوسر یا فنانشر یا دونوں سمجھ کر کہانی سننا شروع کی اور بڑے میری کہانی ایک باغیچے سے شروع ہوئی ہے، جہاں پر ایک مالی کا لڑکا اور ایک سیٹھ کا لڑکا آپس میں گیت بولا کھیل رہے ہیں۔ اور .. .

مجھ سے رہا نہ گیا، بے ساختہ میرے منہ سے نکلا: "میں سمجھ گیا چرت لال جی آپ کی فلم میں ہی یہ دونوں لڑکے بڑے ہو کر جوان ہو جائیں گے۔ اور دونوں ایک ہی لڑکی سے عشق کرے۔ لگیں گے .. . اور پھر دونوں اس لڑکی کی خاطر ایک دوسرے کے خون کے پیا سے ہو جائیں گے۔ ان میں سے ایک لڑکا کسی عام خفیہ میں مر جائے گا اور دوسرے لڑکے سے وہ لڑکی شادی کرے گی کہانی ختم، فلم ختم، اور پھر آپ کو نیشنل ایوارڈ .. ."

ماسٹر چرت لال ایک دم اداس ہو گیا، اور جیسے میلوں کی مسافت طے کر کے آنے والا مسافر تھکان سے چود چور آواز میں بولتا ہے: "میں نے یہ کہانی لکھنے پر پورے گیارہ مہینے عرق ریزی کی مگر آپ نے ڈیڑھ منٹ میں ہی ساری کہانی سنادی .. . مگر معاف کیجئے، میری کہانی میں ایک نہیں دو لڑکیاں ہیں۔"

میں اچھل پڑا: "پھر تو کام اور بھی آسان ہو جائے گا۔ ماسٹر چرت لال جی ہندوستان بھر کی لڑکیاں آپ کے ہاتھ میں ہیں۔ آپ چاہیں تو دو کی بجائے چار یا پانچ لڑکیاں بھی لاسکتے ہیں، لیکن سیردکن تو ہر کیف ایک ہی لڑکی ہوگی۔"

نہیں میری فلم میں دو سیردکنیں ہونگی۔ ایک امیر گھرانے کی لڑکی .. .  
 "جروالی کے لڑکے سے عشق کرے گی تاکہ ملک میں سوشلزم آ سکے .. ."  
 "اور دوسری ایک غریب طوائف کی لڑکی، جس کے لئے سیٹھ کا لڑکا اپنے والدین کی جائیداد پر لات مار دے گا .. ."

"بس، بس!" میں نے ماسٹر چرت لال کا منہ چوم لیا "آپ سچ بچہ ایک

عظیم آدرش پر فلم بنارہے ہیں کہ امیروں کو غریبوں سے عشق کرنا چاہیے اور غریبوں کو امیروں سے۔ تاکہ ملک میں حقیقی سوسلزم آسکے۔ میرا مطلب ہے کم از کم فلموں میں تو سوسلزم آہی جانا چاہیے۔۔۔۔۔ آپ اس کہانی کو فرماؤ، سے پیشتر فلما دیجئے میری طرف سے اجازت ہے۔“

یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ کیونکہ یہ ایک غیر مشرقی نوعیت کا تھا۔ اگر ماسٹر حیات لال کی کہانی میں ترمیم و تفسیح کے مشورے دیتا اور خود بھی دیکھی ہوتا اور ماسٹر حیات کے نازک پھینچے پر بھی چہرہ نہایت چلا آتا۔ اللہ جانتے جاتے ہیں ماسٹر حیات سے یہ ضرور کہہ دیا کہ ان میں ایک لڑکے یا ایک لڑکی کو کسی حادثے یا جھگڑے میں مردانیت ڈالنے بلکہ ان دونوں جوڑوں کی خوشگوار شادی کروا ڈالنے کیونکہ ملک کو اس وقت خوشحال و شادابی شدہ جوڑوں کی اشد ضرورت ہے۔

ماسٹر حیات نے سچ سچ مجھ سے وعدہ کر لیا کہ میں ایسا ہی کروں گا۔ حالانکہ اگر وہ اپنی فلم میں سٹیج کے لڑکے کو عمر قید و لادیتے اور اس کی مجبورہ کو جوگن بنا کر بندھ دیا چل پہاڑ کی طرف بھیج دیتے تو میں مجھے کوئی خاص اعتراض نہ ہوتا۔ کیونکہ فلموں میں ایک ناکامی لا استعمال کیا جائے یا دوسرا فارمولا۔ انجام ہر فلم کا یہی ہوتا ہے کہ نفا ماسٹر کو تانی مل جاتا ہے اور فلم شاد و رنگین کا انکم ٹیکس دیا لیتے ہیں اور نیشنل اپوارڈ پاتے اہل ہر جاتے ہیں۔

آٹھ دس دن بعد ماسٹر حیات لال اچانک پر نمودار ہو گئے میں نے پوچھا ”سنائیے ماسٹر حیات! آپ کی فلم کس منزل میں ہے؟“

اس دن ان کے انٹرویو سٹوڈیو کے چہرے پر ایک عجیب سی رونق چھائی ہوئی تھی۔ ان کے ہاتھ میں ۵۵۵ کے سکرین کا ٹیٹی تھا، اور سوٹ بھی نیا ڈرائی کالیں کیا ہوا تھا۔ سکرین کی طرح جیسے ڈانس کرتے ہوئے ہوئے، مگر صواب! مبارک ہو ایک نیا سفر مل گیا ہے۔ جو اس فلم پر چار لاکھ روپے صرف کرنے پر

آبادہ ہو گیا ہے ۔۔۔ کہاں سے پیدا ہو گا ہے۔“

میں نے پوچھا: مبارک باؤ کے بعد عرض ہے کہ فائسز کون ہے؟ وہ بھی کوئی احمق ہی ہو گا کیا کام کرتا ہے؟

وہ سرگوشی میں بولے: کسی کو بتائیے گا نہیں۔ وہ بلیک مارکیٹیا ہے۔ اس کے پاس دس بارہ لاکھ روپے کا کالا دھن ہے۔ اور وہ بھی بظہر قلم پر وڈیو سر مشہور ہونا چاہتا ہے۔ میں نے چوری چھپے ایک ٹینڈی آہ بھری اور بظاہر خوش ہو کر کہا: ماسٹر جی! آپ نے پروڈکشن کے لئے نہایت مناسب آدمی کا انتخاب کیا ہے۔ ہمارے ملک کی یہی دگھو کل رہیت چلی آئی ہے کہ آٹ اور لڑ بچر کی خدمت اور سرپرستی صرف بلیک مارکیٹری کرتے رہے۔ ظہور کے ذریعے سوشلزم لانے کا سہرا صرف کالے دھن والوں ہی کے سر بندھے گا۔ تو آپ بہت کجا رہے ہیں! کیونکہ قلم سازی کا مرکز تو ممبئی میں ہے۔“

وہ بولے: ”اوہ! مگر ممبئی دوا دھو نے سے پہلے ہی آپ سے یہ مشورہ کرے آیا ہوں کہ قلم کے لئے میرا کس کو لیا جائے؟“

۔۔۔ کسی کو بھی لے لیجئے۔“ میں نے بے پروائی سے جواب دیا: ”دو پیسہ ہاتھ میں ہو تو آپ کسی بھی ظہور کی روح یا جسم خرید سکتے ہیں۔ راجندر کمار، راج کمار، پریم کمار، انوپ کمار کوئی بھی کمار آپ کی قلم میں سیر و بھج سکتا ہے لیکن آپ کی قلم میں تو دو میرو تھے نا؟ ایک مائی کا لڑکا، ایک سینے کا لڑکا اس طرح تو خرچ دگنا ہو جائے گا۔ آپ یوں کیجئے کہانی میں ترمیم کر لیجئے اور ایک ہیرو کو قلم کے پہلے ہی میں کسی نہ کسی طرح مروا ڈالئے۔“

۔۔۔ نہیں، فائسز کا کہنا ہے کہ وہ اس قلم پر چار لاکھ کی بجائے آٹھ لاکھ روپے خرچ کر دے گا۔“

۔۔۔ ہب ہب ہرے! میں نے داد کی مرلی بجاتی! اور اگر وہ آٹھ لاکھ کی بجائے بارہ لاکھ روپے خرچ کر ڈالے تو قلم میں تین ہیرو رکھ لیجئے۔“

۔۔۔ خرچ بھی کیا ہے، کالا دھن جتنی زیادہ سے زیادہ تعداد میں باہر نکل کر عوام میں تقسیم ہو گا اتنی ہی عبادی ملک میں سوشلزم آئے گا۔ اور جناب! ذرا اندازہ لگائیے کہ جب آپ کی قلم میں نہیں تین مشہور ہیرو ہوں گے اور تین تین ہیرو نہیں تو عین جنگ

آمن پڑوٹ پڑے جی بارہ لاکھ کے چوبیس لاکھ بن جائیں گے اور آپ کی شہرت تین گنی بڑھ جائے گی۔“

ایک ہفتے بعد ماسٹر چرٹ لال پھر میرے پاس یہ خوش خبری لے کر آئے کہ میرا خانا سر بارہ لاکھ روپے کی بجائے چودہ لاکھ روپے خرچ کرنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ بلکہ اس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ چونکہ بغیر سوچے سمجھے جو فلمیں بنائی جاتی ہیں وہی کامیاب ہوتی ہیں، کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں، آپ اس فلم میں ایک دہلی کو شامل کر دیجئے۔ کیونکہ دہلی بھی مرتے پتے میں رو سے کم نہیں ہوتا۔“

مگر ماسٹر جی سوچ میں پڑ گئے۔ چند سکند تک اپنی پیشانی پر انگلیاں بجاتے رہے۔ جیسے سوشلزم اور ملک کا مستقبل ان کی پیشانی کے اندر چھپس گیا ہو۔ اور پھر غمگین ہجھ میں ہوئے۔ مگر فکر صاحب! میں نے تو یہ سوچا تھا کہ سیٹھ کے لڑکے کو دہلی کے روپ میں پیش کیا جائے۔ یعنی دہلی کو فلم میں پہلے سے موجود ہے۔“

میں نے دست لبتہ عرض کیا۔ ”ایک کی بجائے دو دہلی بنا دیجئے آپ کا کیا بگڑتا ہے۔“

”لیکن دو دہلیوں کو فلم میں مروتا پڑے گا۔“

”دست مرقا ہے، آپ تو خدا ہیں۔ جانا اور مارنا آپ کے اختیار میں ہے۔ عام فلموں کے راستے سے ذرا ہٹ کر فلم بنائیے اور آخر میں دونوں دہلیوں کی شادی کر دیجئے۔“

”مگر فکر صاحب! وہ پریشان ہو گئے۔“ دہلی کیسے شادی کر سکتے ہیں شادی تو آخر میں بہرہ رمن کی ہوتی چاہئے۔“

”افو! آپ سمجھ نہیں، فلم کے پہلے حصے میں دہلی کو بہ طور دہلی پیش کیجئے دوسرے حصے میں دہلی اپنے گناہوں کا اعتراف کرے اور بہرہ رمن جائے آپ شاید نہیں جانتے کہ سرودے لیڈر تو بامعاوضے جی نے تالیفِ قلوب کے سلسلے

میں ایک تحریک چلائی، حتیٰ اور مدحیہ پر دیش کے ڈاکٹروں کے دل تبدیل کروا دیئے تھے، تو کہا آپ کے وطن بٹنچا سناپ نہیں کر سکتے؟“  
 ”کر سکتے ہیں۔“ وہ ایک عجبر اور محسوس پنجپی کی طرح بولے۔  
 ”تو بس اب جائیے اور کہانی میں یہی منضم کیجئے۔ میری دعائیں اور فنانسز کا دھن آپ کے ساتھ ہے۔“

اس کے بعد ماسٹر چریت لال جی گئی بارمبہ سے ملنے رہے، کیونکہ انھیں اپنی فلم کہانی میں بھی بارمبہ میں کرنا پڑی تھی بارمبہ کے کہنے پر ترمیم کی ایک بار فنانسز کے کہنے پر ایک بار فنانسز کے سامنے کے کہنے پر کیونکہ وہ سالاس فلم میں بطور سائنڈ ہیرو کام کرنا چاہتا تھا۔ ایک مرتبہ سالے کی پانچ سالہ بیٹی کے کہنے پر کیونکہ اس نے منہ کی تھی کہ، انکی ٹیبل اپنی فلم میں رول دیں، چنانچہ تھی گئی کہ ”اکاموڈ میٹ“ کر لے کے لئے نصرت کہانی دوبارہ لکھنا پڑی، ایک ڈسٹری بیوٹر کے کہنے پر جو فنانسز کے سامنے کا بیٹوئی تھا اور اس نے فلم میں دو لاکھ روپے لگائے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ ————— مالی کے غریب لڑکے کا عشق ایک ڈانسرس سے کروانا پڑا، کیونکہ اس کے بیٹوئی کی بیوی ڈانسرتھی۔ غرض ترمیم کے بعد جب آخری شکل میں کہانی مجھے ملانی گئی تو ماسٹر چریت لال کی حقیقی کہانی کی قبر کے اوپر بھی قبریں بن چکی تھیں اور اصلی قبر کو پہچاننا مشکل ہو گیا تھا۔

ہر کیف ایک دن مجھے اطلاع ملی کہ وہ عظیم فلمی کہانی کا ماسٹر چریت لال اپنے بیوی بچہ دسے یہ کہہ کر ممبئی کی طرف روانہ ہو گیا ہے کہ میں جلد ہی بطور مشہور پروڈیوسر ممبئی بلالوں گا۔

اس کے بعد دو مہینے تک ماسٹر چریت لال کی کوئی اطلاع نہیں ملی اور میں بھی بے سوچ کر خاموش ہو گیا کہ ماسٹر چریت لال نے منہ سا گرم میں خود کشتی کر لی ہوگی۔ اس خود کشتی پر مجھے صرف اتنا افسوس ضرور ہوا تھا کہ فلموں کے ذریعے سوشلزم آگے

تذکرہ تاخیر مر جائے گی۔

مگر دو مہینے بعد آپ تک ایک دن کسی نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے دروازہ کھول کر دیکھا تو ایک مہجھایا ہوا چہرہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے کہا، "فرمائیے"

وہ بولا، "آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں ماسٹر حرط لال ہوں!"

میں نے بڑھ کر اس کو سینے سے لگا لیا اور کہا، "پہچانتا کیسے ماسٹر جی!"

آپ کے چہرے پر تو سنو شلزم چھا گیا ہے۔ یہ سیاہی بے جھریاں، یہ جھانکتی ہوئی ہڈیاں آپ کو کیا ہو گیا ہے؟"

وہ بولا، "مجھ سے سخت دھوکا کیا گیا فکر صاحب! میری وہ کہانی کسی

دوسرے پر پڑ پڑی ہے جہاں۔"

"کیسے؟ وہ کہانی تو پہلے ہی کئی فلموں سے چرائی ہوئی تھی۔ چرائی ہوئی کہانی کو کس نے چرایا؟ یہ بھی کے فلم ساز تو بڑے احمق ہیں!"

ماسٹر حرط لال کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور وہ جیسے فریادوں کی طرح اپنی دردناک داستان سناتے رہے۔ بات دراصل یوں ہوئی کہ جب سارے معاملات طے پا گئے تو ہم نے فلم کی شو ٹنگ شروع کر دی، اسٹوڈیو، فلم شارڈ لال اور کئی دوسرے پیشہ ور لوگ مل جل کر ہمارا دو لاکھ روپیہ کھا گئے۔ اور جب دو ریلیں سی گئیں تو چنانکہ ایک دن اسٹوڈیو کو پولیس نے گھیرے میں لے لیا۔ معلوم ہوا کہ ہمارے فنکار صاحب کے خلاف سرکار نے اسمگلنگ کا کیس بنایا ہے۔ اور اس سلسلے میں اسے گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ کیونکہ یہ سارا کالا دھن اس نے اسمگلنگ کے ذریعے کمایا تھا۔ چنانچہ فکر صاحب! حب ہمارا فنکار گرفتار ہو گیا تو فلم کی شو ٹنگ رک گئی، اور میں .. ..

".. .. آپ کی کہانی تو گرفتار نہیں ہو گئی۔ آپ اسے کسی اور پڑ پڑ کر کو دے دیتے!"



ماسٹر چرت لال نے پانچ کلو میٹر لمبا ہیری اور کہا : یہی تو دکھ ہے فکر چنا۔  
 کہ اس فٹاشر کے سلسلے میں وہ کہانی اٹھا کر ایک اور پروڈیوسر کو سنائی  
 تو مضموم ہوا کہ بالکل ایسی ہی کہانی وہی پروڈیوسر پہلے بھی خرید چکا ہے، اور اس کی  
 بنیاد پر ایک فلم تیار کر رہا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ میری یہ کہانی کس بے ایمان نے  
 چرا کر اس پروڈیوسر کے ہاتھ بیچ دی؟

# بیوی کے ہجر میں

اچانک میری بیوی کے اعلان کیا کہ وہ ایک ہفتے کے لئے میکے جا رہی ہے حالانکہ وہ اس سے پہلے کبھی بارگاہِ حقیقی کی اس میں سسرال کو میکے بھی سمجھتی ہوں اور ادھر میں کئی برس سے اصرار کر رہا تھا کہ میں بتا رہے ہجرت کی لذت اٹھانا چاہتا ہوں۔ اس لئے تم کہیں دفع ہو جاؤ۔ لیکن وہ کبھی حقیقی کی ہجر صرف ایک شاعرانہ تکلف ہے۔ اس سے میرا گھر اجڑ جائے گا میری غیر مادی میں کچن کا ایک چھپے ہوئے گم ہو گیا جو یقیناً گم ہو جائے گا تو تاریخ میں میرا نام سیاہ حرفوں میں لکھا جائے گا۔

گو یاد رہے ہجر کو ایک لمحے سے زیادہ وقعت نہیں دیتی تھی۔

ساٹھ سال کے تلخ تجربے کے بعد میں مایوس ہو گیا کہ میری بیوی سے کوئی مفصلندی سرزد نہیں ہو سکتی۔ خداوندِ کریم سے کیا جتنی رقت و عاشقی مانگیں۔ سبھی رانگیاں گئیں اور اصل میری پراٹھ قدرے آؤٹسٹاک آتی کر رہا۔ نہ کاؤنٹر بدلنے کے لئے ماحول میں کبھی کبھی کوئی تبدیلی ضرور آتی چاہئے۔ بیوی کا بھروسہ ایک طرح کی تبدیلی تھی۔ حسب اس کا ذائقہ بہت لذیذ ہوتا ہے۔ یہ سمجھ رہے کہ وہ میری بیوی ہے۔ اور کس خدائی بیوی تھی۔ بلکہ اس کا حوصلہ بلند کرنے کے لئے میں اسے اکلوتی بیوی بھی کہہ دیتا تھا۔ لیکن یہ بات بھی نامتنا سب متنی کہ جب بھی خام کو گھر لڑنا تو گھر میں رہا پرانی جانی پہچانی بیوی ملتی تھی صرف بیوی ہی نہیں۔ کچن میں کیتلی بھی وہی ملتی تھی۔ چھ وہ جیسے ہی لانی تھی۔ ایک دن وہ دھڑک

میں نے بیوی کا بدلہ قاتلی سے لینا چاہا اور کہا: "اب اسے ریشاٹر کر دو اور زخمی ہو گئی ہے۔" وہ بولی نہیں، میں اسے جیتے جی الٹ ڈکروں گی۔ کیونکہ اسے دیکھ کر ہی مجھے ہاں کی شیریں یاد آ جاتی ہے۔"

میں نے یہ سوچ کر اپنے دل کو پر جا لیا کہ وہ یا تو قاتلی سے محبت کرتی ہے یا اس سے۔ مجھے بے محبت نہیں کرتی۔ مجھے تو صرف ٹھکر کی نیم پیٹ سمجھتی ہے۔ مجھے یاد ہے ایک بار اس نے یہ ثابت کرنا چاہا کہ یہ گھونیم پیٹ کے بغیر بھی مکمل ہے۔ اس دن میں بازار سے ایک سینکڑہ پیٹڈ سوئیٹر خریدا لایا۔ اسے دیکھتے ہی محترمہ کا پارہ گرم ہو گیا کہ میرے مشورے کے بغیر یہ میری منظوری کے بغیر سوئیٹر کیوں نے آئے؟ بولیں، میں پچھتی ہوں، کیا یہ سوئیٹر ہے؟ کتنا گھٹیا اور کتنا عجیب؟

میں نے چکر کر کہا: "ہاں ہاں، میں جو لایا ہوں۔"

بولیں، تو کیا آپ اس ٹھکر میں کبھی کوئی بھی کام کی چیز لائے ہیں؟

میں نے کہا: "ایک تو تمہیں لایا ہوں۔ اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟"

اگر وہ وسیع القلب ہوتی تو اس بچے پر مسکراتی۔ لیکن الٹا الٹا گھٹاٹوں کے کر لپنگ پر جا لیتی اور کہنے لگی۔ یہ میرے والد صاحب کی غلط فہمی میرا کوئی قصور نہیں ہے۔"

رہ جائے۔ کیوں اسے یقینی ہو گیا تھا کہ یہ گھر ایک بیابان ہے جس میں وہ ایک پھول کی طرح کھل ہوئی ہے۔ اگر یہ پھول ایک دن کے لئے بھی آٹ آٹ اسٹیش ہو گیا تو یہ گھر بھر بیابان ہو جائے گا۔ اجڑ جائے گا۔ لیکن میرا خیال تھا کہ ہر روز پھول کی خوشبو اور رنگ سے بھی انسان بڑھ جاتا ہے۔ اسی لئے کسی دن گھر کی بیابانی سے بھی لطف اٹھایا جائے۔ بلکہ تجر کا کافہ اٹھا کر ایک غزل بھی لکھ لی جاوے۔ لیکن آہ میں یہ دیکھ کر قریب قریب مایوس ہو گیا کہ غزلوں کا مستقبل بے حد تاریک ہے۔

لیکن اس دن یہ اعزاز سن کر مجھے حیرت ہوئی اور سر نہ ہلایا۔ وہ ایک ہفتہ کے لئے میکے جا رہی ہے۔ یعنی میرے سارے اندازے غلط نکلے۔ چنانچہ میری بیوی اتنی

نالائق نہیں۔ ذرا تم ہر تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی  
اور کہ اس مٹی سے تو غزلوں کے گویا دیوان اُگ سکتے ہیں !

اجر کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے اس نے ایک گتے پر ہدایت نامہ خاندانہ لکھ کر  
ٹھکانا دیا اور کہا کہ ہر روز صبح اٹھ کر اس کا پانچ کیا کرو۔ خلا ان میں سے ایک دو ہدایتیں  
پڑھیں۔ ہر روز چہ دان میں پیاز کا ایک ٹکڑا لٹکا دیا کرو۔ ایک پیاز سے کم از کم تین  
چرموں کا شکار لازمی ہے۔ پیاز کے اس اسٹینڈرڈ کو قائم رکھا جائے اور میری داپسی  
پر اعداد و شمار کے ساتھ رپورٹ پیش کی جائے۔ پڑوسی کوئی کاتیں پہلائی نہ کیا جائے  
مہارے گھر میں اس کی چینی کی ایک پلیٹ موجود ہے۔ لیکن میری عدم موجودگی میں اس  
کے ساتھ کوئی لین دین نہ کیا جائے۔ اور تیسری اور چوتھی سیر سی ہدایت یہ تھی کہ اول  
تو اپنے کسی دوست کو گھر میں مدعو نہ کیا جائے اور اگر کوئی اپنی بیوی سے نالایا ہو کہ ہمارے  
گھر میں پناہ لینے کے لئے آج بھی جائے تو اسے ڈرامنگ دم میں بیٹھ کر سگرٹ پیٹنے سے  
منع کر دیا جائے۔ کیونکہ وہ سگرٹ کی راکھ سے قالین کا بیڑہ غرق کر دے گا اور اپنے ملازم  
کے کان میں چپکے سے کہہ گا کہ ایسے ہر دوست کا نام، علیہ اور ایڈریس لاشکر لیا کرو  
میں ان سے قالین کا کلیم وصول کروں گی۔ دہلی چھوٹنے سے تین سیکڑے پہلے دھمکی  
دے گئیں کہ اگر کوئی ہدایت مجھے میکے میں نہ لگواؤں گی لیکن گرام کے ذریعے بھیج دوں گی۔

بیوی کے جانے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا اور میری بے حد رونا شک ہوئی ہے  
اس کے فرشتوں نے میری چھت پر ٹپکے پھیلا دیئے اور کہا "مبارک ہو!" غسل خانے میں  
گھس کر بے اختیار جی جا پا۔ زور زور سے گانا شروع کروں۔ سٹلے سے گزرا تو ہر عورت  
حسین اور دلکش نظر آئی گھر کی بلی نے اگر مودبانہ سلام کیا اور اس ہچے میں میاؤں کی  
جیسے کہہ رہی ہو "مالک دودھ کہاں دکھائے؟ ناچیز کو بھیرک لگی ہے۔ اجازت دیجئے"  
تاکہ فی لوں میں جانتی ہوں کہ دستہ چلانا آپ کے خدایانِ شان نہیں، وصولی نے اگر  
گھنٹی بجائی اور جب میں نے اسے بتایا کہ بی بی جی میکے گئی ہیں تو وہ گستاخ بولا "بھوک  
سے تو کوئی بات کرنا فضول ہے۔" میں نے کہا "کوئی حساب کتاب کی بات ہر وقت سنا کر"

لیکن وہ بولا کہ آپ کی سمجھ میں نہ آئے گی۔

دھوئی کے اس نقطہ نگاہ سے مجھے مشتعل ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن میں نے اس کی گتہ حتیٰ کو فراخ دلی سے نظر انداز کر دیا۔ کیونکہ میں سامراج سے تازہ تازہ آزاد ہوا تھا اور آزاد انسان بہت فراخ دل ہوتا ہے۔ میں آزادی کی فضا میں کھل کر سانس لیتا چاہتا تھا۔ کسی سے تنازعہ کر کے اپنے موڈ کو یکسر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے نوکر سے کہہ دیا کہ اب میرا بچہ اور ڈنڈا ہر ہی رہے گا۔ لیکن اس کے باوجود ہماری فتنہ خانہ میں کٹوتی نہ ہوگی کیونکہ میں بی بی جی طرح مباحثی ذہنیت نہیں رکھتا۔ گما برس بعد پہلی بار ہوٹل کے کھانے میں وہی طعنت آیا جو کتنا روپے میں آیا کرتا تھا۔ آہ میں کتنا روپے سے کتنا محروم ہو گیا تھا! احباب کو بچے نکلتے دعوت دی کہ آؤ ماش کھیلو، مسگر ٹیپ بھونکو۔ بستر وں پر شکنیں ڈالو، ایک ایک آدھ پانگ کا پا پر بھی توڑ سکتے ہو! چائے کے کپ پر کپ لڑھاؤ، کسی رولز اینڈ ریگولیشنز کے بغیر بے مہابا۔ فش کام سرورس کی جائے گی رات کو بہت لیٹ آنے میں ایک سرور رکھنے لگا۔ جیونیٹوں نے گھر کے واسطے منکے چمسل حملے شروع کر دیے۔ لیکن انھیں ڈسٹرپ نہیں گیا۔ چڑیاں میرے گھر کو اپنا آبائی دلش سمجھ کر گھسولنے پر گھر نیسے نیسے لگیں اور سارے مکروں میں جنس و خاشاک بکھیر دئے۔ لیکن میں نے ان کے ذالی معاملہ بہت اشدت کرنا ضروری نہ سمجھا۔ یہاں تک کہ ایک چڑیا بار بار چڑے بدل بدل کر لاتی رہی۔ لیکن پھر وہی ذالی معاملہ۔ جو بے تک میری فراخ دلی سے میسر ہو گئے۔ وہ چرچے دان کو اپنا دانت دکھا کر یوں گزرجانے جیسے کہہ رہے ہیں۔ استیاں جیسے کو قال! اب ڈر کا ہے کا! اب ایک فرق ضرور تھا کہ مجھ کو کے چلے جانے کی خبر سن کر کوڑوں نے آنا بند کر دیا کیونکہ ان کا راستہ ڈیپ ہی میس میں اٹھ گیا تھا۔

تین چار دن اس آزادی بلکہ آزاد روی میں مہنی خوشی، پک چھپکتے گزر گئے تو پانچویں دن اچانک خیال آیا کہ بھری لذت تو اٹھائی نہیں۔ ہجرت تو لکھنؤ میں گزر گیا اور محرم پر سون لوٹ بھی آ چکی گی۔ اور اتنے ہی پوچھیں گی کہ کس کس سے وہ غزل و اور گمیں ہیں یا ایک قیمتی مہفتہ ضائع کر دیا؟ لیکن شادی کے بعد میں نے رنج عری کو

جلا وطن کر دیا تھا۔ اس لئے بیوی کے نام ایک ہجیرہ خط لکھنا ہی مناسب سمجھا اور خط لکھنے لگا۔

”اے جان بہار و خزاں !

جب سے تم گئی ہو، کوئی بے تمنا رہے فراق میں کالمیں کالمیں کرنا چھوڑ دیا ہے۔ بادل صرف گرج گرج کر رہ جاتے ہیں، برستے نہیں۔ نہ جانے انہیں کیا غم ہے۔ چاند لگتا جیٹھ لگتی ہے تو دعاؤں میں مارنے کو جی چاہتا ہے۔ کل تان پور کے تاروں کو چھوڑا تو وہ جیسے گریا کر لاکھنے لگے۔ ”لوٹ کے آ، لوٹ کے آ“ میرے میت ! اور پیاری ! سب سے بڑا ظلم تو یہ ہے کہ جنگیں جیتے ہو گئے۔ راشن ڈپو پر گھلبا آٹا ملنے لگا۔ غرض تمہارے بغیر کوئی چیز اپنے ٹوکے پر نہیں رہی۔ یہاں تک کہ کل الماری میں تمہارا گہنوں کا ڈبہ دیکھا تو وہ بھی غائب تھا ! چور نے گئے یا تم اپنے ساتھ لے گئیں۔ جب تک تم لوٹ کر نہیں آئیں، میں تمہارے میں گہنوں کی اسٹ نہیں لکھا سکتا۔ اس لئے آجاؤ آجاؤ۔ میری خاطر نہ سہی گہنوں کے ڈبے کی خاطر ہی آجاؤ۔

یہ ہجیرہ خط لکھ کر لغاتے میں بند کیا اور بیوی کا ایڈریس لکھا کہ دھڑاک سے دروازہ کھلا اور بیوی اندر داخل ہوئی۔ بولی۔ کیا لکھ رہے ہو؟ میں نے کہا کچھ نہیں ایک بے معنی سا خط ہے۔ لیکن تم اتنی جلدی کیوں واپس آ گئیں؟ بولی۔ کل رات میں نے سہنا دیکھا کہ آپ کو چھوڑ کاٹ رہے ہیں۔ دو ہتھ مار کر کہا۔ ”ہاتھ میں بھی کتنی نالائقی بیوی ہوں۔ چھوڑ دانی تو سٹور میں بند کر کے دکھا آئی ہوں۔ سو جا چلوں انہیں پھیر دانی تو نکال کر دے آؤں۔“

ہجیر کا اینٹی کلائمکس۔

ہجو بیوی کے اس غیر ضروری وصال پر سارا راسخہ ہی پلٹ گیا اور محترمہ نے ایک ہی دن میں اپنا اقتدار بحال کر دیا۔ ہجیر کی ساری سرگرمیاں میں منتظر میں چلی گئیں۔ ”میں سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے!“ بی گھر گیا کہ اچانک وہ سری

صبح کو پوسٹ میں عورت نامہ رسید نے مجھے ایک دیوٹر لاکر دیا۔ یہ خط بیوی نے میکے سے شام کو پوسٹ کیا تھا اور اسی راستہ کو چھروالی کا خواب دیکھ کر صبح گھاڑی پر سمار ہر کر گھر واپس آئی تھیں۔ یعنی جنون محبت میں کیفیت کچھ ایسی ہو گئی کہ خط بعد میں پہنچا، محبہ پہلے پہنچ گئی! میرے منہ سے بے اختیار (بیوی کی حمایت میں) غالب کا یہ شعر نکل گیا۔

خدا کے واسطے دادا اس جنون شوق کی بنا کہ اس کے در پر پہنچنے نہیں نامہ رسید ہم آگے یہ خط نہیں تھا، ہجر کا ایکٹی کلا ٹنگس تھا۔

اور اس میں لکھا تھا۔

بڑے بچہ، چھوٹے بچہ، منی مبرا ایک اور منی مبرا کے آبا جی!

میں یہ ان بچوں سمیت خوش ہوں۔ امید ہے آپ بغیر بچوں کے خوش ہوں گے بچے ہر روز آپ کو یاد کرتے ہیں۔ بچے ہیں نا، کچھ بوجھ نہیں ہے۔ انھیں لاکھ سمجھائی ہوں کہ اگر تمنا ہے آبا کو تمہاری یاد تازہ کی تو بھیانگے آئیں گے۔ لیکن وہ پہلے ہی میری کوئی بات نہیں مانتے تھے۔ اب سب باتیں گئے۔ دراصل آپ ہم سے بچوں کو بگاڑ دیا ہے۔ جب میں انھیں لے کر گھر لوٹوں گی تو ان خندہ بچوں کی پٹائی کھردر کیجئے گا تاکہ انھیں سبق مل جائے۔

باقی یہاں پر خبر سیت ہے۔ آپ کی خیریت کی چنتا رہتی ہے کہ نہ جیلے آپ نے میرے بیڑ گھر کا کیا حال بنا رکھا ہے۔ پانی کا نل کبھی کھلمت چھوٹے گا۔ ہتھ پر سگریٹ کی راکھ جھینڈے پر ہنر کیجئے گا۔ میں پلنگ کے ساتھ والی پٹائی پر ایش ڈالے رکھ آئی تھی۔ کپڑے میلے ہو گئے۔ تو انھیں فرش پر اور کونوں کھدروں میں مت بھینک دیجئے گا۔ کیونکہ اس طرح جوہوں کو کترنے کا گولڈن جالس مل جاتا ہے۔ مجھے رہ رہ کر شک ہوتا ہے کہ وہ لمبی ناک والی ڈروٹا میری عدم موجودگی سے شر پا کر اپنے چہرے ہمارے گھر کی طرف اٹک دے گی۔ آپ کو اپنے گھر کے اور ڈروٹا کے چہروں کی پیمپان دکھانی چاہیئے۔

اور اپنی باتوں کے خدشے سے میکے میں میرا جی نہیں لگتا۔ ہر لمحہ جی چاہتا ہے پر دگا کراڑ جاؤں اور آپ کے پاس پہنچ جاؤں۔ یہاں نیپال سے سولگنگ کے سارے عیال آئی ہوئی ہیں۔ سستی بھی ہیں اور خراب صورت بھی۔ میں نے ایک ساڑھی خرید لی ہے۔ اب تو نامہ

بیس دیجئے اور ہاں آپ کے لئے سسٹم کنگ کا ایکب اولی سوٹ خرید لیا ہے۔ ظاہری کی سالگرہ پر آپ کو پیش کروں گی۔ لیکن سلاواؤں کی جینج اینڈ کمپنی سے۔ آپ کے پرانے ٹیلر ماسٹر تفریحی اینڈ کمپنی سے نہیں۔ وہ ڈیزائنر ہیں۔

اور کیا لکھوں؟ آپ گھر کے حالات تکبیس تو میں بھی ان کی روشنی میں آپ کو کچھ مزید لکھ سکوں۔ چھوٹی مٹی کے خفے منھے انگوٹھے کا عکس اس خط پر بھیج رہی ہوں اسے چوم لین۔ میں نے چوم لیا ہے۔ فکر نہ کریں۔

آپ کی

بڑے بیچ، چھوٹے بیچ، مٹی نمبر ایک اور  
 مٹی نمبر دو کی ماں .....“  
 (دستخط اصلی ہیں)



# شوخی و گفتار

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں  
مجموعہ خیال ابھی فرد فرد تھا

# اور سائیں بابا نے کہا

منہ مانگی موت

ایک خفیہ و نزار بوڑھا جھانگی جابر پائی پر پڑا کراہ رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا۔  
 ”آہ! نہ جانے موت کب آئے گی؟“  
 اتنے میں موت آگئی اور بولی۔

”بابا میں آگئی ہوں!“

بوڑھا تاراضی ہو کر بولا

”بڑی بے وقوف ہو۔ میں نے تو اپنے رٹکے کو بلایا تھا۔ کہ وہ آکر میری خبر  
 گیری کرے۔“

موت نے کہا۔

”بابا! میں تمہارا رٹکا ہوں“

دو دوست ادو دشمن

جنگل میں جاتے جاتے سائیں بابا نے نوکھیا کہ ایک کوڑیا لاسانپ مرا پڑا ہے  
 چند قدم کے فاصلے پر ایک بیولا بھی مرا پڑا تھا۔

سائیں بابا نے نیلے گواٹھایا اور سانپ کے پاس لاکر رکھ دیا سان دو توں

کی باتیں ایک دوسرے کی گردن میں ڈال دیں۔ بالکل دو دوستوں کی طرح وہ ایک دوسرے کی گردن میں باتیں ڈالے بڑے رہے۔

حیدرمنٹ تک سائیں بابا انھیں دیکھتا رہا۔ اچانک ان دونوں میں ایک حرکت سی پیدا ہوئی۔ دونوں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ دونوں نے آنکھیں کھول کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

اور پھر دونوں آگ بگولا ہو کر ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔

## کامیاب یتیم خانہ

یتیم خانے کے انچارج تھے مجھے بتایا۔

”ان سب بچوں کے ماں باپ مرجھے ہیں۔“

افسوس!

”افسوس کی کوئی بات نہیں بہم انھیں پالیں پرسیں گے۔ انھیں کام سکھائیں گے انھیں باروزگار سکھائیں گے ان کی شادیاں کر دیں گے۔ ان کے بچے پیدا ہوں گے۔“

”اور پھر ان میں سے کیسوں کے بچے یتیم ہو جائیں گے۔“ افسوس!

افسوس کی کوئی بات نہیں۔ کیونکہ ہم انھیں پھر یتیم خانے میں داخل کر دیں گے آپ شاید نہیں جانتے کہ ہمارا یتیم خانہ گزشتہ ایک سو سال سے قائم ہے اور بڑی کامیابی سے چل رہا ہے۔

## حسن کی قیمت

ایک مشہور و معروف مصور نے ایک حسینہ کی تصویر بنائی۔ اس حسینہ کے خد وخال میں اتنی نزاکتیں اور جسم میں اتنی قوسیں تھیں کہ تصویر دیکھتے ہی ہر شخص اسے خرید لیتا اور اپنے سینے سے لگا لیتا۔ اور جب یہ تصویر ایک بین الاقوامی نمائش میں پیش کی گئی تو اسے اعلیٰ درجہ کا حسن قرار دیا گیا۔ اور وہ تصویر ایک بھکاری

کی مٹی جو آج بھی سڑکوں پر ایک ایک پیسے کی بھیک مانگتی پھرتی ہے!

## حسین کون ؟

”نہیں نے چکڑے سے پوچھا۔ دنیا میں سب سے زیادہ حسین کون ہے؟“  
 اس نے کہا جاند۔ ”میں نے ایک سچے سے پوچھا؟ سب سے زیادہ حسین کون ہے؟“ وہ بولا  
 ”دوبہ“ میں نے ایک طوائف سے پوچھا۔ ”سب سے زیادہ حسین کون ہے؟“ وہ بولی  
 ”گامب“ میں نے ایک تھے سے بچے سے پوچھا۔ ”سب سے زیادہ حسین کون ہے؟“  
 کہا ”دودھ!“

اور پھر میں نے ایک پانگل سے پوچھا: ”تباؤ تمہارے خیال میں سب سے زیادہ  
 حسین کون ہے؟“ اس نے ہنس کر کہا۔ خود میں۔

## حسینہ کی نگاہیں

حسینہ نے درخت کی طرف دیکھا تو درخت پر کھول کھول اٹھے حسینہ نے ایک  
 کار کی طرف دیکھا تو اکریش میں کاروں کا زرخ دوگنا ہو گیا۔ حسینہ نے ایک پتھر کی طرف دیکھا  
 تو وہ سنگ مرمرین کر محل میں جالنگا۔ اور حسینہ نے شراب کی بوتل کی طرف دیکھا تو اس  
 کی پرستش شروع کر دی گئی۔

لیکن حسینہ نے جب ایک انسان کی طرف دیکھا۔ تو اس انسان کو اس دن  
 نے بھانسی پر لٹکا دیا۔

## بیبا در عاشق

ایک میاں بیوی ایک عاشقانہ فلم دیکھ کر آئے اور گھر آکر دونوں فلم کے  
 ہیرو ہیروئن کی طرح عاشقانہ مکالمے کرنے لگے۔

”اے بیبا“ ”پیارے! یہ جاند اور اشارے گراہ ہیں کہ میں تمہاری خاطر

اپنی جان تک دیدوں گا۔“

بیوی نے کہا: ”پیارے! میں تمہاری خاطر سارے سماج کو ٹھکرا دوں گی اور تمہارے پاس آجائوں گی۔“  
اور پھر دونوں نے بیک آواز کہا: ”یہ کالمے نوشاوی سے پہلے کے ہیں۔“

## قحط کا مقابلہ

مشرقی غذائی قحط پڑ گیا۔ معززین شہر نے بڑی تیزی سے غلے کے اسٹاک سرے لوگوں میں بٹا کر رکھ گئی۔ اناج کا دانہ دانہ بلیک مارکیٹ میں ملنے لگا۔ فٹ پائنتوں پر چلتے پلتے قاتر کش اچانک گر پڑتے۔ اور دم توڑ دیتے۔ ہاتھ دعاؤں کو اٹھتے مگر نقصان سے ٹک کر رہ جاتے۔

اور پھر شہر کے بڑے حاکم نے صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک طبیعی کمیٹی بنائی۔ اور اس کمیٹی میں جتنے ممبر لگے گئے وہ سب غلے کے بلیک مارکیٹ تھے۔

## بے روح فقرے

ایک معزز آدمی نے اپنے گھر کے اندر ایک ہنامیت خوبصورت قریم میں مندر جو ذیل ماٹو لکھ کر لٹکا رکھا تھا۔

”سچ ایمان آدمی جہنم میں جاتا ہے۔“

”امانت میں خیانت کرنا گناہ ہے۔“

”کسی کا حق چھیننا بزدلی ہے۔“

اور جس آرٹسٹ نے یہ ماٹو لکھا تھا، وہ اپنی اجرت حاصل کرنے کے لئے عمر

میں بے وقار رہا۔  
شہر کے کتے

شہر کے دو معززین کلب میں بیٹھے نوشی میں مصروف تھے۔ ایک معزز

بہترے ہر آنے ہوئے کہا۔

”اے اگر میں جا ہوں تو شہر کے تمام کتے تم پر چھڑ سکتا ہوں۔“

دوسرا معزز بولا۔

”مگر کتے لاؤ گے کہاں سے؟“

”میں شہر کے تمام کتے خرید لوں گا۔“

”وہ تو پہلے کہا خرید چکا ہوں۔“

”کس لئے؟“

”تم پر چھوڑنے کے لئے۔“

## الو کھا مریض

شہر کے مشہور و معروف ڈاکٹر چرمدیری کے مطب میں ایک مٹا کٹا مریض، جس

ہوا اور ڈاکٹر کے قریب پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔

”ڈاکٹر صاحب! میں آپ انسان کی ہر بیماری کا علاج کرتے ہیں۔

”آپ نے ٹھیک مناس ہے۔“

مریض بولا: ”ڈاکٹر صاحب! مجھے ایک ہناسیت خوشاک اور گہنہ مرض ہے۔ آپ

میرا علاج کر دیجئے۔“

ڈاکٹر نے: ”فرمائیے، کیا مرض ہے آپ کو؟“

ریسن کر ہٹے گئے مریض نے ڈاکٹر کے منہ پر ایک گھونٹہ بہایا، میز پر پڑا ہوا ڈاکٹر

کا ہیٹ اٹھایا اور ہنسنے ہوئے یا ہر چلا گیا

## سائنس دان

سائنس دان اچھلتا کودتا ہوا اپنی لیبارٹری نے اچانک یا ہر نکل آیا اور جوش

مست میں اپنے تختے سے بچے کے دولوں کن، حوں کو پکڑ کر بولا: ”تھے! تھے! تھے! تم علی گڑھ

خوش ہو کے میں نے آخر وہ حیرت انگیز چیز ایجاد کر لی ہے۔

بچہ بولا: ”کیا چیز؟“

سائینس دان نے کہا: ”ایک ایسی چیز جس سے میں دنیا کے ہر آدمی کو ایک سینکڑ  
میں مار سکتا ہوں۔“

بچہ خوش ہو کر بولا: ”تو ڈیڑھی! پہلے مجھے مار کر دکھاؤ اس چیز سے۔“

پتھر۔

ایک پتھر ہر روز گدھے پر سوار ہو کر مدرسے جایا کرتا تھا۔ ایک دن حب معمول  
حب وہ گدھے پر سوار ہو کر جا رہا تھا۔ تو گدھے نے کہا —

”کیوں جی، آپ ہر روز مدرسے میں کیا کرنے جاتے ہیں؟“

پتھر بولا: ”میں لوگوں کو علم سکھانے جاتا ہوں۔“

گدھا بولا: ”علم سیکھنے سے کیا فائدہ ہوتا ہے؟“

پتھر نے کہا: ”علم سیکھنے سے عقل آجاتی ہے۔“

گدھا کہنے لگا: ”تو پھر ماسٹر جی! مجھے بھی عقل سکھا دو۔“

پتھر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا: ”نہیں، اگر میں نے محقق عقل سکھا تو پھر سواری  
کس پر کروں گا؟“

لیڈر

اسبج کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے لیڈر نے نہایت جذبات انگیز لہجہ میں کہا: ”پیارے

حاضرین! میری زندگی کا واحد مقصد عوام کی خدمت کرنا ہے۔ میرا ہر قدم عوام کے مفاد

ہم کے لئے اٹھتا ہے! میں نے جتنی قربانیاں کیں وہ صرف آپ لوگوں کے لئے کیں اور مجھے

فخر ہے کہ میں عوام کی تمناؤں کا عکس بن گیا ہوں۔ کیا آپ میں سے کسی کو بھی میرے اس

خلوص پر رشک ہے؟“

ماضی میں سے ایک شخص اٹھا اور بولا "ہاں مجھے شک ہے۔"  
یہ سن کر بیڈر نے اس شخص کو اسٹیج پر بلایا اور اپنے ساتھ والی کرسی پر بٹھا دیا۔

## کلرک

کلرک کی بیوی نے ساتویں بچے کو جنم دیتے وقت دروسے کر رہے ہوئے کہا۔  
"آہ بچے بڑھتے جا رہے ہیں مگر ہماری تنخواہ انہیں بڑھ رہی ہے۔"  
کلرک نے اپنی بیوی کو تسلی دیتے ہوئے کہا "ہاں مگر بچے بھگدان دیتا ہے اور  
تنخواہ دفتر دیتا ہے۔"

## وکیل

عدالت میں ایک وکیل بطور ملزم پیش کیا گیا۔ جج نے اس سے کہا: ہنرمند  
افسوس کی بات ہے کہ آپ نے قانون داں ہو کر بھی قانون توڑا ہے۔  
ایک وکیل نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "مائی لارڈ، قانون توڑنے سے  
پہلے میں نے قانون کی کتاب اچھی طرح پڑھ لی تھی اور یہ تسلی کر لی تھی کہ اس قانون  
شکنی کے توڑنے سے کونسا قانون موجود ہے۔"

## گداگر

ایک پڑھا لکھا گداگر گداگروں کا لیڈر بن گیا۔ چونکہ اس کا زیادہ تر وقت  
گداگروں کی تنظیم اور ان کے حقوق کی حفاظت پر صرف ہونے لگا، اس لئے گداگروں  
کی طرف سے اس کا ماحول مزہوظیفہ متروک کر دیا گیا۔ ہر گداگر اس وظیفہ کے سلسلے میں ہر چہنے  
ایک روپیہ ادا کیا کرتا

ایک مرتبہ گداگروں کے لیڈر سے کسی نے پوچھا "اتنا دیا یہ اچھا ہوا کہ تم سے گداگر کی  
چھوٹ گئی۔ اور اب تم ایک معزز شہری بن گئے ہو۔"



وہ زہر تلے قببہ کے ساتھ بولا گداگری کہاں چھوٹی ہے ؟ میں ابھی تک بھیک مانگتا ہوں پہلے راہگروں سے مانگا کرتا تھا اب گداگروں سے مانگتا ہوں ۔

یڈیٹر

اختیار کے ایڈیٹر سے اس کے ایک دوست نے پوچھا ۔

”کیا یہ صحیح ہے کہ تمہاری معلومات بے حد وسیع ہیں ؟“

ایڈیٹر غر سے بولا : ”ہاں“

دوست نے پھر پوچھا ”اور کیا یہ بھی صحیح ہے کہ تمہیں دنیا کی خبروں کا علم

رہتا ہے ۔“

”ہاں“

”معاذ کرتا تمہیں دنیا بھر کی خبروں کا علم ہے ۔ مگر اپنے بارے میں ایک

چھوٹی سی خبر کا بھی علم نہیں ؟“

وہ کہہ : ”

”وہ یہ کہ تمہارے سر کے بال اڑ گئے ہیں“

بڑھئی

بڑھئی نے ایک کرسی بنائی اور بازار میں جا کر بیچ دی ۔ وہ روپے کچھ بیکار  
میں آ بیٹھ گیا ۔ امانت کے وقت دوکاندار نے ڈبلٹی ماری جس پر بڑھئی کو تڑاؤ آ گیا ۔ اس نے  
دوکاندار کو برا بھلا کہا : دوکاندار نے اسے گالی دی ، بڑھئی نے منہ مار کر دوکاندار کا دانت  
تڑا دیا ۔ بڑھئی کو گرفتار کر لیا گیا ۔ کئی جہینے اس پر مقدمہ چلایا اور آخر عدالت نے اسے  
چھ ماہ کی سزا دے دی ۔

جس دن بڑھئی کو سزا کا حکم سنایا وہ اسن بڑھئی کی بنائی ہو کر سسی  
بر بھیجا تھا ۔

چوہدر

ایک چورمات کو کسی کے گھر میں داخل ہوا، جس کمرہ میں داخل ہوا وہاں اندھیرا تھا۔ مگر لعل کے کمرہ میں روشنی ہو رہی تھی۔ اور اندر سے میاں بیوی کی باتیں کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میاں کہہ رہا تھا: "پیارے آج تو ہر گھر میں روشنی ہو رہی ہے سارا شہر جاگ رہا ہے۔ اس لئے آج کہیں نقب نہیں لگا سکا۔"  
بیوی بولی: "اس کا مطلب ہے، آج تم خالی ہاتھ لوٹ آئے، کوئی بھی چیز چرہ کر نہیں لائے؟"

میاں بولا: "نہیں نہیں، ایک گھر میں تھوڑا سا مرق ملا۔ تو ایک گھر میں میرے ہاتھ لگ گئے۔" جو ساتھ والے کمرہ میں میز کی دواڑ میں دھکے آیا ہوں۔"  
میاں بیوی کی یہ گفتگو سن کر پہلے چور نے میز کی دواڑ کھولی۔ اور گھڑی اٹھا کر مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

شاعر

شاعر کو خدا کے حضور میں پیش کیا گیا۔ خدائے پوجیہ "شاعر! تم چونکہ ہمارے خواب آزاد منش بندے ہو اس لئے تم خود ہی بتاؤ کہ تم جنت میں رہنا پسند کرو گے یا دوزخ میں؟"

شاعر بولا: "جہاں سامعین کی تعداد زیادہ ہو  
چنانچہ خدائے اسے دوزخ میں بھیج دیا"

تربیت گاہ

نیتہ کی ماں غصے کے آبا سے سے جھجھک کر رہی تھی۔  
"نیتہ! کیا یہ بچے کا عادی ہو گیا ہے، اگر تم نے اس پر صدمہ تو کھلی چھٹی دے"

رکھی ہے۔

منجھ کے آبلے کہا۔ بکو اس کرنی بہو تم۔ تم ہی اسے اٹو کا بیٹھا بنا رہی ہو۔ منجھ کی ماں نے کہا۔ اولاد منجھاری ہے۔ لنگلے کی اولاد بھی لنگلی بنے گی۔ اور کیا بنے گی؟ منجھ کے ایکے کہا۔ اور تم کو نئے شریف تاندا ہی سے آئی ہو۔ تمھارا باپ بھی تو چور اچکا ہی تھا!۔

اور دونوں کا منجھا ایک کونے میں بیٹھا ہوا یہی گالیاں سن رہا تھا اور وہی سی ڈنٹ کر رہا تھا۔

## آئینوں کا فرق

اپنی بیوی کو خدا آدم آئینے کے سامنے کھڑے دیکھ کر شوہر نے بڑے متنازعہ ہنچے میں کہا۔ ”پیاری! آج تو تم راجہ اندر کے اکھاڑے کی پری معلوم ہو رہی ہو۔“ بیوی نے طعنے دیتے ہوئے کہا۔ ”کل تو تم کہہ رہے تھے کہ تم چڑیل ہو۔ ڈاؤن ہو۔“ کل تم میرے سامنے کھڑی تھیں۔ مگر آج آئینے کے سامنے کھڑی ہو۔

## بے نیاز جوڑا

سرکار کی طرف سے منادی کرائی گئی۔ ملک کی آبادی خطرناک حد تک بڑھ رہی ہے۔ اس لئے سرکار ملک کے ہر میاں بیوی سے اپیل کرتی ہے کہ وہ کم سے کم بچے پیدا کیا کریں۔

ایک جوڑے نے بازار میں چلتے چلتے یہ منادی ایک کان سے سنی اور دوسرے سے اڑادی۔ سمجھو نہ ان کے ہاں گزشتہ تین سال سے ایک بھی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا۔

## بیوی کا سبھا گہ

بیوی آئندوں، بچکیوں اور سکیوں کے درمیان کہہ دی تھی۔ میں کہتی ہوں

اس گھر میں اگر تو میرے بھاگ ہی پھوٹ گئے۔ آخر یہاں آکر مجھے کیا ملا؟“  
 بیچے شرک پر سے ایک خرابے والے کی آواز آئی۔ ”پاڑ کر اس!“

## سجگوان کا فیصلہ

مندر میں سجگوان کرشن کی مورنی کے سامنے ایک عورت آنکھیں بند کئے پرانے  
 کر رہی تھی۔ اسے ملے منہ ہر! میرے خاوند کو بددعا کی گئی تاکہ وہ دوسروں کے بہکاوے  
 میں نہ آیا کرے۔“

سجگوان کی مورنی جیسے بول رہی تھی۔ ”ابھی دس منٹ پہلے ہی تیرا خاوند میری  
 ہیے ہی کہہ گیا۔“  
 تعلیم کا مقصد

ایک خدا ترس اور تنگ وکیل صاحب ہر روز ایک طوائف کے ہاں بیٹے اور  
 رات گئے لوٹ آتے۔ میں نے ایک دن ان سے پوچھا ”آپ ہر روز طوائف کے پاس  
 کیوں جاتے ہیں؟ ایک مذہب آدمی کے لئے یہ بات ہذا حین نامناسب ہے!“  
 وہ گردن اگڑا کر بولے! ”میں اس سے تہذیب سیکھتا ہوں۔“

## بیٹے کے باپ

طوائف کے تنفر سے مصمم بیچنے والے ایک دن ماں سے پوچھا ”ماں یہ ہر روز  
 ہمارے گھر میں اتنے آدمی کیوں آجاتے ہیں؟“  
 طوائف نے ایک سرواہ بھر کر کہا۔

”بھیا! میں خود ان آدمیوں کو یہاں بلاتی ہوں۔ تاکہ تم پہچان سکو کہ ان میں  
 سے تمہارا باپ کون ہے؟“

## رتنگین مقولے

جو لوگ طوائف سے نفرت کرتے ہیں طوائف ان سے بھی نفرت نہیں کرتی۔

جس سماج میں محبت کرنا جرم ہو وہاں قہر خانے کھولنا کوئی جرم نہیں۔  
 طوائفوں کے لاسٹنوں سے جو رقم وصول کی جاتی ہے وہ اخلاق سدھارنے  
 والی سبھاؤں پر خرچ کی جاتی ہے۔

## زکام

ایک مرتبہ ایک بڑے آدمی کو زکام ہوا۔ سات دن تک رات و نعلی ڈاکٹر اس  
 کا علاج کرتے رہے، احتیاط، پریز، اور علاج پر سات سو روپے خرچ ہو گئے، جب  
 اسے زکام سے اتفاق ہوا تو اس نے اپنی صحت یابی کی خوشی میں ایک بہت بڑی  
 دعوت دی، شہر کے بہت سے معززین دعوت میں شریک ہو گئے، دعوت، آرکسٹرا  
 اور فیکروں کو خیرات پر ایک ہزار روپیہ لکھ گیا۔

## قسمت کا دعویٰ

ایک دن بڑے آدمی نے ایک جیوتسھی کو بلا کر پوچھا  
 ”کیا تم بتا سکتے ہو کہ کل ہمارے ساتھ کیا ہو گا؟“  
 جیوتسھی نے تاروں کا حساب لگا کر بتایا۔  
 ”ہاں جناب! کل آپ کو دس ہزار روپے اچانک مل جائی گے۔“  
 اور دوسرے دن بڑے آدمی کا کٹنا مر گیا، جو دس ہزار روپے میں بیمہ شدہ تھا۔

## بتیلی کا تماشا

چھوٹے آدمی سے کسی نے کہا۔

”غیر وہ!“

وہ غیر گیا، اس کے بعد چھوٹے آدمی سے کہا گیا

”چلو۔!“

وہ چلنے لگا۔ پھر کیا گیا  
 ”لوٹ آؤ۔“

وہ واپس آگیا  
 اس سے پوچھا گیا۔ ”تم نے میرے حکم کی تعمیل کیوں کی؟“  
 چھوٹے آدمی نے کہا۔

”اگر میں یہ جانتا ہوتا کہ میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کیوں کی؟ تو آپ کے  
 حکم کی تعمیل ہی کیوں کرتا؟“

## گالیوں کا نرخ

مجھ کو آدھن ہانتا کا پنتا ایک سیٹھ صاحب کے پاس آیا اور گھبراتے  
 ہوئے بولا۔

”آپ نے مجھے پانچ روپے دیئے تھے تاکہ میں جا کر گیتے کو ایک گالی دے دوں“  
 ”ہاں دیئے تھے!“

”تو میں اسے کالی دے آیا ہوں۔ اور اس نے جواب میں مجھے دو گالیاں  
 دی ہیں۔“

”ہاں! میں نے اسے دس روپے دیئے تھے، انھیں کالی دینے کے لئے۔“

## اپڈیشن کا اثر

جلے میں ایک بہت بڑا دووان برہمی اپڈیشن دے رہا تھا۔

وہ آدمی بہت بڑا ہے جو صدقہ دل سے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیتا ہے۔

چھوٹے آدمی نے یہ اپڈیشن سنا اور قریبی تعالے میں جا کر اپنے تمام سابقہ گناہوں کی  
 رپورٹ دے دی۔ اور تعالہ نہ دار نے اسے پکڑ کر جیل میں بھروسہ دیا۔

## کیوں؟

چھوٹے آدمی کو سرکار کی طرف سے عظیم فکار کا خطاب دے دیا گیا۔  
 چھوٹے آدمی کو ایمرؤں کے کلب کا اعزازی ممبر بنا دیا گیا۔  
 چھوٹے آدمی کی تعریف میں بڑے بڑے اخباروں نے مضامین شائع کئے۔  
 چھوٹے آدمی کا شہرہ سارے ملک میں ہو گیا۔  
 کیوں؟ کیونکہ وہ اب چھوٹے آدمیوں سے نفرت کرنے لگا تھا۔

## چور

ایک چھوٹے آدمی نے دوسرے چھوٹے آدمی کی قمیص چرائی۔ دوسرے نے  
 پہلے کی پگڑی چرائی۔ پہلے نے دوسرے کا جوتا چرایا۔ دوسرے نے پہلے کی دھوٹی  
 چرائی۔ پہلے نے دوسرے کا تھنڈ چرایا۔ دوسرے نے پہلے کی . . . . .  
 مہفتہ بھر بعد دونوں ایک دوسرے کا لباس پہنے پھر رہے تھے۔

## دعا قبول

ملک میں زبردست قحط پڑ گیا تو چھوٹے آدمی نے صدقِ دل سے دعا مانگی  
 ”مہنگوان! بارش بھیج دے تاکہ ہم موت سے بچ جائیں!“  
 مہنگوان نے دعا قبول کی اور موسلا دھار بارش بھیج دی۔  
 اور بارش میں چھوٹے آدمی کا مکان گر گیا اور چھوٹا آدمی اس کے نیچے دب کر  
 مر گیا۔

## بچھو ملا

رات کو چھوٹے آدمی کے گھر ایک چور گھس آیا۔ چھوٹے آدمی کی آنکھ کھل گئی

گئی اور اس نے چہرے کہا۔ ”کیوں بھیا کچھ ملا؟“  
 چور نے کہا۔ ”کچھ بھی نہیں ملا۔ مگر ہاں ایک سبز ضرور ملا۔“  
 ”کیا۔؟“  
 ”یہی کہ تم مال و دولت سے محروم ہوا دہی عقل سے!“

## ایک ماتمی خط

ایک تجارتی قلم کے مالک کو صبح ڈاک سے ایک خط ملا۔  
 میرزا کاٹھن کاٹھن کاٹھن! میں نہایت افسوس کے ساتھ آپ کو یہ اطلاع  
 دینا چاہتا ہوں کہ آپ کے پرانے اور گہرے دوست مسٹر سرچیت کل رات انتقال  
 کر گئے۔ ان پر اچانک موتیہ کا حملہ ہوا اور وہ باوجود فوری طبی امداد کے عاثر  
 ہو سکے۔

آپ کا

شام تاقہ برادر حقیقی سرچیت

فرم کے مالک نے خط پڑھ کر میز کے نیچے پھینک دیا۔ اور اپنے خزانچی کو آواز دیا کہ  
 ”منیم جی! ذرا دیکھنا مسٹر سرچیت کے نام سہارے کتنے روپے نکلتے ہیں۔  
 رزق دینے والے

ایک طوائف خدا کی بہت زیادہ قائل بنتی۔ برابر اس کی عبادت کیا کرتی تھی  
 ایک دن میں نے پوچھا۔

”اوی تو طوائف ہو کر خدا کی عبادت کرتی ہے سچھ کیا پڑی ہے خدا کی؟“  
 وہ بولی۔

سامنے بابا! میں نے جس وقت بھی خدا سے دعا مانگی ہے، اسی وقت اس نے  
 کوئی دیکھ کر لگا لگا کر بیچ دیا۔ اس نے رزق دینے والے کی عبادت کرنی ہی چاہی ہے



# مادرِ ہتویدیش

ہرچیزوں کا تھا نیدار

ہرچیز خاگردلوں کی ہنگامی مینگ میں ہرچیز لیڈر غصے کے مارے جمباگ اڑا  
ہوئے بول رہا تھا "میں... میں... اس بدشاہ تھا نیدار کا خون پی جاؤں گا جس  
نے ہمارے ہرچیز خاگردلوں کی توہین کی ہے۔ تم مجھے آگیا دیدو تو میں اس کا سر کاٹ کر  
اس ہرچیز ہتوید کے چمچے پر لٹکا دوں گا۔ بھائیو! ہم اور تم غریب ضرور ہیں، لیکن ہم اپنی  
غیرت اور خودی کو فروخت نہیں کر سکتے۔ میں اس تھا نیدار کو عدالت کے کٹہرے میں  
جا کر کھڑا کر دوں گا۔ تم سب "مقدمہ نمبر" کے لئے ایک ایک روپیہ نکال دو۔ میں کل  
ہی اس کے خلاف دعویٰ دائر کر دوں گا۔"

مقدمہ نمبر میں پچاس روپے اکٹھے ہو گئے لیڈر کو سونپ دیئے گئے ہرچیز  
لیڈر میٹنگ سے اٹھ کر سیدھا "وائٹ شاپ" پہنچا اور ان روپوں سے وہیلی اور اس کے  
لوازمات خرید لئے۔

رات کو ہرچیز لیڈر اور تھا نیدار دونوں مل کر ایک دوسرے کی صحبت کے  
بام پل رہے تھے۔  
مصرعہ پر گرہ۔

کافی دیر میں وہ شاعر آہنی میں الجھ پڑے، شکافی ویز تک سبکدوش مباحثہ کرنے کے

لبر ایک شاعر کو اشتعال آگیا اور اس نے دوسرے شاعر کے منہ پر تھپڑ لگا کر کہا: "یہ میرا مصرع طرح ہے۔"  
دوسرے شاعر کے فوراً جوابی تھپڑ لگاتے ہوئے کہا: "اور یہ میں نے غزلیں لگائی ہے۔"

### شیر اور بکری

ایک بار کا ذکر ہے کہ ایک کلرک اور اس کا افسر دونوں دوست بن گئے۔ دونوں اکثر اکٹھے دیکھے جاتے کہیں کلرک اپنے افسر کی نوکھی پر ڈنکھانے چلا جاتا اور کبھی افسر اپنے کلرک کے کواڈر پر پہنچ کر ڈنکھاتا۔ دونوں ایک ساتھ وہی کیا کرتے تھے۔ کافی ہاؤسوں میں سفیادوں میں، کلیوں میں، تھیٹروں میں حتیٰ کہ کبھی کبھی شکار کے لئے کبھی اکٹھے ہی جنگل میں جانا کرتے کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ اس کلرک میں بھی شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی کیسے پی رہے ہیں۔  
بڑی دیر کے بعد کھلا کہ کلرک کی بیوی انتہائی حسین تھی۔

### سبکدوش چاری رپورٹ

صوبائی اسمبلی میں ایک وزیر نے اعداد و شمار کی ایک رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا: "گزشتہ سال صوبے میں اینٹی کرسٹینا مہم بڑے زور شور سے چلائی گئی۔ اس مہم کے نتیجے میں آٹھ چڑاسی برخواست کئے گئے، پندرہ کلرک معطل کئے گئے، تین جو غیر افسروں پر حجبانے کئے گئے اور دو بڑے افسروں کو فارنگ دی گئی۔"

اسمبلی کے ممبر نے باغ و بانہ کہا: "اور آپ کو کیوں گرفتار نہیں کیا گیا۔ جبکہ آپ بہت بڑے سبکدوش چاری ہیں۔"

وزیر نے فوراً کہا: "کیونکہ مجھے اسمبلی میں رپورٹ پیش کرنی تھی۔"

ایک عاشقانہ تحفہ

ایک صاحب ایک عزم پر عاشق ہو گئے عشق اپنے ہرے شباب پر بیچ گیا

جب تک وہ روزانہ ایک دوسرے سے مل نہ لیتے، پس نہ رات نہ دن محبوب اپنے عاشق کو ہر روز کسی پر کسی جگہ پر پہنچنے کا وقت دے دیتی تھی۔ کبھی انڈیا گیٹ، کبھی چاندی چوک، کبھی بدھا گارڈن، کبھی یوسف سرائے اور کبھی کسی ستیا ہال میں اور عاشق اپنے دل کے ہر انفرادی محبوب کو کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچ جاتا۔ ہر روز مختلف پسینے بدل بدل کر لمبوں کے انتظار میں لٹک ہار کر لمبوں کے اندر دھکم پیل کرتا ہوا بالآخر مقام محبت تک پہنچ جاتا۔

ایک مرتبہ جب وہ اسی طرح لٹکا ہارا محبوب کے پاس پہنچا تو محبوبہ بڑا۔۔۔  
رومانٹک موڈ میں تھی۔ جذبہ عشق سے چور چور ہو کر بولی "پیارے میرا تیرا چاہتا ہے  
آج تمہیں کوئی تحفہ لے دوں۔ تباؤ کیلے دوں؟"  
عاشق بولا ایک بائیکل لے دو۔

## جیوتشی

ایک آدمی نے جیوتشی کو اپنا ہاتھ دکھایا۔ جیوتشی نے بڑے غور و خوض سے اس کے ہاتھ کی لکیروں کا موازنہ کیا اور پھر بولا "تمہارے ہاتھ میں عجیب تضاد دکھائی دیتا ہے۔ ایک طرف تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری موت عنقریب واقع ہوئے والی ہے لیکن دوسری لکیر کہتا ہے کہ تم موت سے بچ سکتے ہو۔"

شخص مذکور بڑا پریشان ہوا اور بولا "ذرا غور سے دیکھو، قسمت میرے ساتھ بدل رہی کیوں کر رہے گی؟ کیا کوئی ایسا پائے نہیں ہے کہ میری موت ٹل جائے؟"  
جیوتشی نے کہا "ایک ہی پائے ہے کہ آپ کسی شخص کو قتل کر دیں تو مزید کئی سال تک زندہ رہ سکتے ہیں۔"

شخص مذکور نے عجیب سے چاقو نکالا اور جیوتشی کو قتل کر دیا۔  
مورٹی کا پھر ششما چار۔

ایک بہت بڑا سرکاری افسر رشوت لینے کا بری طرح عادی تھا لیکن اس کے

ساتھ ہی وہ خوف خدا کا بڑا قائل تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی کوشش کے ایک حصے میں اپنے لئے ایک چھوٹا سا مندر بھی بنوا رکھا تھا۔ جہاں وہ اداس کا پر لویا اور روزانہ پوجا کیا کرتے تھے۔ ایک چھوٹی سی پتیل کی مورتی ان کی پوجا کا مرکز تھا۔

ایک مرتبہ کسی شخص کا کہیں اس کے ہتھے چڑھ گیا۔ وہ شخص بھی بھاگوان کا بڑا بھگت تھا۔ اس نے اپنے کہیں کے سلسلے میں افسر مذکور سے کہا: ”آپ جو کچھ فرمائیں گے میں آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔“ میرا کہیں ٹھیک کر دیجئے۔“

”افسر نے پوچھا کیا دو گے؟“

”جو مانگو گے۔“

”اچھا، تو میرے گھر کے مندر کے لئے چھ فٹ لمبی اور ایک من بھاری بھنگو ان کی مورتی بنوا کر دیدیجئے۔“

چند دن بعد ہی مورتی۔ اس کے مندر میں سنبھاپت ہو چکی تھی۔

لاکھ طوطے کو پڑھایا۔

ایک بہت بڑے فیکٹری اونر نے اپنی تقریب طبع کے لئے ایک طوطا خریدا اور اپنی کوشش کے میں گیٹ کے پاس اس کا پنجر لٹکا دیا۔ اس نے طوطے کی خوب پرورش کی کھانے کو پیتے اور پینے کو شراب دیا کرتا تھا۔ طوطا بے حد پیارا تھا۔ فیکٹری اونر نے اس طوطے کو ایک فقیر بھی سکھا دیا کہ جب بھی اس کو بھی سے باہر نکل کر دفتر کی طرف جائے لگوں تو تم یہ فقرہ کہا کرنا۔ ”اب کب لوٹو گے؟“

چنانچہ طوطا یہ فقرہ سیکھ گیا اور ہر روز جب سیٹھ جی باہر جانے لگے طوطا بے ساختہ کہہ اٹھا ”اب کب لوٹو گے؟“ فقیرا سیٹھ جی انتقال کر گئے۔ جب ان کی ارحی کو بھی سے باہر نکلنے لگی تو طوطے نے بے ساختہ کہا۔ ”اب کب لوٹو گے؟“

## حاتم طائی دہلی میں

چند دن جوئے، حاتم طائی دہلی میں آیا۔ کیمونیکا س کے پاس دہلی کے پوسٹ آفس سے سیکڑوں خط پوسٹ کے گئے تھے کہ کبھی دہلی میں بھی قدم رنجہ فرمائیے یہاں کے باشندے آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔

چنانچہ حاتم طائی کو ایک دن جم آگیا اور وہ دہلی میں آگیا۔ اسے راستے میں جو بھی حاجت مند ملا اس نے اس کی حاجت پوری کر دی۔ بھیکاری کھڑک مزدور، بچے دکاندار وکیل، حتیٰ کے ایک رشتہ خوار فسر کو بھی اس نے دس ہزار روپے دے دیئے۔ کیمونیکا سے اپنی بیٹی کی شادی پر شامدار چیز دینا تھا۔ ہوتے ہوتے یہ خبر سارے دہلی شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی کہ حاتم طائی شہر میں آیا ہوا ہے اور وہ دونوں ہاتھوں سے دولت لٹا رہا ہے۔ چنانچہ سارے باشندے اپنا کام کا چھوڑ کر حاتم طائی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ وہ حاتم طائی کو شام تک ڈھونڈتے رہے۔ مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ آخر اخبار کے ایک ایڈیٹر نے اس کا پتہ چلا لیا اور اسے معلوم ہوا کہ خینارو پیسہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ وہ سبھی ہانٹ چکا اور اس کے پاس روٹی کھانے کے لئے بھی پیسے نہیں بچے۔ چنانچہ اس نے الٹر کے نام پر ایک ایک راہگیر سے بھیک مانگی تو پولیس اسے اندھا دگد اگرسی کے قانون کے تحت گرفتار کر کے تھانے لے گئی۔ اور وہ اس وقت تھانے میں قید ہے۔

## کالی داس کہاں رہتا ہے

ایک دن کا ذکر ہے ایک ریڈیو سٹیشن نے فیصلہ کیا کہ مہاکوی کالی داس کا ڈرامہ شکستہ "ریڈیو سٹیشن سے براڈ کاسٹ کیا جائے۔ جب ڈرامہ براڈ کاسٹ کے لئے بالکل تیار ہو گیا تو وہ افسر جو ڈرامہ پروگراموں کا اسٹارچ تھا دوڑا دوڑا سٹیشن ڈائریکٹر کے پاس آیا اور گھبرا کر بولا: سر اس ڈرامے کے کنٹریکٹ پر مصنف کے دستخط

سرد لے رہی ہیں۔ لیکن کال داس جی کا ایڈریس ہی نہیں مل رہا ہے کیا کیا جائے؟ اسٹیشن ڈائریکٹر بھی قدرے گھبر گیا اور بولا: ”ہاں رولز کے مطابق مصنف کی اجازت کے بغیر ڈرامہ براڈ کاسٹ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن بھائی میرے اہکالی داس تو انتقال فرما چکے ہیں۔“

افسر مذکور بولا: ”پھر تذاویز مشکل ہے۔“ رولز کے مطابق یا تو وہ انتقال دہ کرتے اور یا اب ان کا ڈرامہ براڈ کاسٹ نہیں ہو سکتا۔“

اسٹیشن ڈائریکٹر نے ایک منیٹ کے لئے توقف کیا اور پھر ایک دم اسے اسٹیشن سوچ گیا۔ کنٹرول کیٹ فارم لے کر اس کے ”تجھے دستخط کر دیئے“ کا لیدیا اس پر بولا: ”اب تو ڈرامہ براڈ کاسٹ ہو سکتا ہے؟ اسٹیشن ڈائریکٹر نے کہا: ”ہاں لیکن اس کی راکٹیٹ میں کاچیک کرن وصول کرے گا۔“

”اس کا حل میں سوچ لیں گے۔ پہلے ڈرامہ براڈ کاسٹ بس کر لو۔“

### مجھے بھی بیچ دیجئے۔

سارا جی نوادری کی ایک مشہور دکان میں ایک صاحب داخل ہوئے جو تھوڑے سے لنگڑا کر چلتے تھے۔ وہ دکان میں گھوم پھر کر مختلف نوادری دیکھتے رہے اور ان کی قیمت پر چھپتے رہے۔ آخر ان کی نظر ایک آئینے پر جا پڑی۔ آئینوں نے دکاندار سے پوچھا: ”اس آئینے کی کیا قیمت ہے؟“

دکانی لاکھ روپے۔

”دکانی لاکھ؟ گا کہ نے حیرت سے پوچھا: ”ایک آئینے کی قیمت دکانی لاکھ؟“

”جی جناب۔“ یہ وہ آئینہ ہے جس میں ملکہ نور جہاں اپنا چہرہ دیکھا کرتی تھیں۔ دوسری میز پر ایک گلاس رکھا تھا۔ گا کہ نے اس کی قیمت پوچھی تو دکاندار

نے کہا۔ ”یہ گلاس پانچ روپے کا ہے۔ کینڈا اس میں مثلشاہ جہانگیر شراب نوش فرمایا کرتے تھے۔“

اس پر گاہک نے بہت سنجیدگی سے کہا: ”آپ مجھے بھی اس دکان پر رکھ لیجئے اور مجھے بطور تمیہ رنگ کے بیج دیجئے گا۔“

## ہنومان کی واپسی

ایک روز کا ذکر ہے کہ یوں پتر ہنومان مختلف ممالک کی سیر کرنے کرتے ہندوستان آ پہنچا۔ اس نے سب سے پہلے بالی اور سنگریہ کا ادب پتہ دریا منت کیا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ دونوں یونائٹڈ فرنٹ پارٹی میں ایک ساتھ کام کر رہے ہیں اور اپنی مندری بنانے کی فکر میں ہیں۔ اس کے بعد وہ آلو پرست پر گیا: تاکہ سنجیونی بونی کے کچھ تپے حاصل کرے۔ لیکن اسے وہاں جانے سے روک دیا گیا کہ وہاں تو جڑی بوٹیوں کی ریسرچ کے لئے ادارہ کھولا گیا ہے۔ اور وہاں سے بوٹیاں توڑنا قانوناً منع ہے۔ مایوس ہو کر وہ اجودھیا پہنچا تو اسے بتایا گیا کہ وہاں باڑہ آہنکا ہے ڈوب جانے کا خطرہ ہے۔ وہاں کی فیکٹریاں تک پانی میں ڈوب گئی ہیں۔ ٹھیک بار کر وہ دہلی آ گیا۔ جہاں اس نے رام اور ستیا کی کھوج شروع کی کسی نے کہا رام اور ستیا فلاں مندر میں رہتے ہیں۔ کسی نے کہا انہیں فلاں مندر میں رہتے ہیں۔ اس نے ہر مندر کے ہر رام اور ستیا کے سامنے اپنا سینہ چیر کر دکھایا۔ جس کے اندر رام ”لکھا ہوا تھا۔ مگر کسی رام اور ستیا نے بھی اسے نہیں پہچانا کہ یہ واقعی ہنومان ہے۔“

آخر ہنومان مایوس ہو کر دہلی سے اٹھا اور تنکا کے ہوائی اڈے پر جایا اترا اور وہاں بغیر سپورٹس کے لشکریں داخل ہونے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔

مخاورے جو غلط ہو گئے۔

• بیل کے بھاگوں چھٹیکا لڑنا۔

• لیکن آج کل کوئی چیز چھٹیکوں میں رکھی ہی نہیں جاتی، ریفریجریٹر میں رکھی جاتی ہے جس سے بیل کے بھاگ مستقل طور پر پھوٹ چکے ہیں۔

• لنکا میں جو پیدا ہوا بادلی گزکا!

حالانکہ خود لنکا کے وزیر اعظم کا قد صرف دو گز کا ہے۔

• ناچ نہ جائے آنکھ ٹیڑھا۔

آج کل کوئی ڈانس ریا یا بہانہ نہیں کر سکتی۔ کیونکہ ناچ گھر ٹیڑھے بنائے ہی نہیں جاتے۔ اگر ٹیڈ کی سائنس بے حد ترقی کر چکی ہے۔

وہ دونوں برہمن تھے۔

ایک قبیلے میں دو برہمن رہتے تھے۔ ایک برہمن ان پڑھ تھا لیکن امیر رہتا۔ امیر تھا اور عیار تھا۔ جیسا کہ اکثر امیروں کی خصلت ہوتی ہے۔ اس کے گرد ہر وقت اور ہر موقع پر عقیدت مندوں کا ہجوم رہتا تھا جو اس کی جمجولی روپوں پیروں سے بھر دیتے تھے۔

دوسرا برہمن غریب تھا لیکن گریجویٹ تھا۔ اسے دھرم کے نام پر لوٹ کھسوٹ کرنا برا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے امیر برہمن کے خلاف پراپیگنڈہ شروع کر دیا۔ اور لوگوں کو یہ سمجھانے لگا کہ دھرم — بے ایمانی اور لوٹ کی اجازت نہیں دیتا جس طرح یا امیر برہمن کر رہا ہے۔

امیر برہمن کو اس کے اس پراپیگنڈے سے بہت اندیشہ محسوس ہوا اور ایک



دن اس نے غریب برہمن کو بلا کر کہا۔ ”دیکھو اتم بھی برہمن ہوا اور میں بھی میرا اور تمھارا خون کا رشتہ ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں ”تمھاری کچھ مدد کروں۔“  
 یہ کہہ کر اس نے غریب برہمن کو پانچ سو روپے ماہانہ سہانے ہاں اکاؤنٹنٹ کی آسامی پر ملازم رکھ لیا اور دونوں برہمن ہنسی خوشی رہنے لگے۔

### دعمرم کا رکھشک

شہر کے بہت بڑے مندر میں شہر کے بہت بڑے بڑے معززین جمع تھے یہاں وہ مندر کلمٹی کے پردھان کا چٹاؤ کرتے آئے تھے۔ کئی تقریروں کے بعد سٹیڈ ڈھینگر چند جی کا اتفاق رائے سے پردھان جن لیا گیا۔ تالیوں کی گونج میں سٹیڈ ڈھینگر چند جی کو بھول مالاؤں سے لا دوایا گیا۔ سٹیڈ جی نے جراتی تقریر میں سب کا شکریہ ادا کیا اور سرنیاڑھ کا کرکھگدا ان کی موتی کے سامنے دعدہ کیا کہ وہ دعمرم کی رکشا کے لئے اپنی جان تک فدا کر دیں گے۔

جب پردھان جن مندر سے باہر تشریف لائے تو ایک پولیس پارٹی نے انھیں ایف بی کی اسمگلنگ کے جرم میں گرفتار کر لیا۔

### حضرت عیسیٰ مسیح

شک کے بائیں منٹ پاتھ پر دو آدمی آپس میں لڑتے رہے۔ دونوں کے ہاتھوں میں تیز چاقو چمک رہے تھے۔ جس سے وہ ایک دوسرے کو زخمی کرنا چاہتے تھے۔  
 ایک صاحب انھیں لڑتے دیکھ کر تیزی سے ان کی طرف لپکے اور ان دونوں کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک ایک پر توڑے کر چلے گئے۔ دونوں نے پر توڑے کی طرف دیکھا۔ اس پر لکھا تھا:

”ڈاکٹر بیجیم سنگھ سر جی“۔  
 ”ہمارے کلینک میں رخصت کی مرسم پٹی کا بہترین انتظام ہے۔“

سیدھے سادے جواب  
 ”آپ دوسرے سینیٹر اگر ہیریوں کے ساتھ جلی کیوں نہیں گئے؟“  
 ”مجھے گھر میں نقد ڈاکا سا کام تھا۔“  
 ”آپ دریا میں چھلانگ لگا کر خودکشی کرنے گئے تھے، لوٹ کیوں آئے؟“  
 ”پانی ٹھنڈا تھا۔“  
 ”آپ نے اپنی محبوبہ کے نام جو ”لوئیئر“ لکھا تھا اسے پہنچانے کے لئے خود اس کے گھر کیوں گئے تھے؟“

”ڈاک کا شکٹ خریدنے کے لئے پیسے نہیں تھے۔“  
 ”میں نے آپ کو اپنے جنم دن پر ڈنر کا دعوت نامہ بھیجا تھا۔ آپ تشریف کیوں نہیں لائے؟“

دعوت نامے پر تاراج درج نہیں تھی۔  
 ”آپ نے اس بھاری عورت سے کیوں عشق کرنا شروع کر دیا، جیب کہ آپ کی اپنی بیوی انتہائی ”خوبصورت“ تھی؟“  
 ”کیونکہ میری بیوی نے ایک موٹے مجھے سے شخص سے عشق شروع کر دیا تھا۔“

تین ادھوری خبریں  
 (۱) اٹلی میں ابھی ابھی ایک ایسی عورت کا انتقال ہوا ہے جس کی عمر ایک سو  
 تیس سال تھی۔ خبریں لکھا گیا ہے کہ اس کی درازی عمر کا راز یہ تھا کہ اس نے ساری

زندگی کسی مرد کے ساتھ جنسی تعلقات قائم نہیں کئے تھے۔

۲۔ ڈاکٹروں نے ایک کا دل دوسرے کے سینے میں فٹ کرنے کے لئے چھڑا دیوں پر تجربے کئے۔ ان میں سے پانچ تجربے ناکام رہے اور وہ جانبر نہ ہو سکے۔ لیکن چھٹا آدمی جس کے سینے میں ایک عورت کا دل کیا گیا وہ اب تک زندہ ہے۔ مرد مر گیا۔ عورت زندہ ہے۔

۳۔ ایک امیر ترمین آدمی نے پچاس سال کی عمر میں ایک وصیت لکھ کر رک دی کہ جب وہ انتقال کر جائے تو اس کی ساری جائیداد ایک دوصو آئسٹرم کو دی جائے۔ لیکن جب وہ اٹھانوے سال کی عمر میں فوت ہوا تو اس وقت اس صدمہ تک دیوالیہ ہو چکا تھا کہ اس کے کفن کے لئے کئی مچلے سے چندہ جمع کرنا پڑا۔

## دو بھوکے

ایک بلی نے کہا: "میاؤں! چھوٹے جراب دیا۔" لیکن میں بے حد بھوکا ہوں۔ پہلے مجھے کچھ کھلانے کوں کر دو۔"

بلی نے ڈبل روٹی کے دو ٹکڑے لاکرا سے دیئے۔ جسے چربا کھا گیا۔ اس کے بعد بلی چرے کو کھا گئی۔

## ڈرکس سے ہے؟

میں اس سیاست دان سے کبھی نہیں ڈرتا جو اپنے دشمن سے دشمن کا سا سلوک کرتا رہے۔ بلکہ میں تو صرف اس سیاست دان سے ڈرتا ہوں جو دشمن کے ساتھ دوست کا سلوک کرتا ہے اور اسے دشمنی کرنے کے قابل نہیں رہنے دیتا

## لازم و ملزوم

میں نے ایک سیاست داں سے پوچھا۔  
 ”تم نے ڈھٹائی کہاں سیکھی؟“  
 ”وہ بولا سیاست سے۔“  
 ”اور سیاست کہاں سیکھی؟“  
 ”ڈھٹائی سے!“

## دوست

گلی میں ایک بچہ کھڑا درہا تھا۔ ایک پاگل نے اسے اٹھایا۔ اور اس کے سامنے  
 زور زور سے ہنسنے لگا۔  
 بچہ بھی زور زور سے ہنسنے لگا۔  
 بچے کی ماں بھاگی بھاگی آئی اور بچے کو چھین کر لے گئی۔  
 بچہ پھر رونے لگا۔  
 پاگل بھی رونے لگا۔  
 بیرمل تامہ

ایک بار اکبر بادشاہ نے بیرمل سے کہا۔  
 ”بیرمل! کل رات یہیں خواب میں ایک پاگل دکھائی دیا۔ جو کہنے لگا میں بیرمل  
 ہوں۔“  
 بیرمل بادشاہ کی اس چھپی چوٹ کو بھانپ گیا مگر ضبط کر کے بولا۔  
 ”تو حضور نے کیا کیا؟“

بادشاہ بولا۔

”میں نے اس کو اپنا وزیر بنالیا۔“

یہ سب نے فوراً کہا۔ کینخت بڑا عقلمند تھا۔ حضور کو بھی بے وقوف بنالیا

کو آیا خدا :

ایک پاگل نے ایک راہ چلتے آدمی کو زیرِ کشتی پکڑ لیا اور آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ دیکھو، وہ آسمان پر جڑا رہا ہے۔ یہ خدا ہے یا کوئی ہے ؟  
اس آدمی نے کہا۔

”کوئی ہے ؟“

پاگل نے اسے چھوڑ دیا اور کہا۔

”جاؤ بھاگ جاؤ۔ تم میں میری طرح پاگل معلوم ہوتے ہو۔“

پاگل بننے کے آزمودہ طریقے

۱۔ ہڈیاں لڑائی سے عشق شروع کرو۔ جو انتہائی خوبصورت ، اور انتہائی جاہل ہو۔

۲۔ صبح اٹھتے ہی سچ بولنا شروع کر دیجئے۔ انشاء اللہ شام تک ضرور پاگل ہو جائیں گے۔

حق بحق دارر سید

فٹ پاتھ ہر ایک بے کاری کی موت رافع ہو گئی۔ اس کی ٹوڑی میں سے ڈیڑھ

ہزار روپیہ نقد نکل آیا۔ لوگوں نے وہ روپیہ معزز شہر کے حوالے کر دیا تاکہ وہ اسے مفاد عامہ کے لئے خرچ کر دے۔

دوسرے دن معزز شہر نے وہ تمام روپیہ شہر کے بھیکاریوں میں بانٹ دیا۔ اور روپیہ پھر گوداریوں میں پہنچ گیا۔

## اشتہار باز

علاقے کے دو گروہوں میں لڑائی ہو گئی۔ شہر کے ایک معزز نے بیچ بچاؤ کرانا چاہا۔ تو اسے بھی دو چار لافٹیاں لگیں۔ اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ جب اسے اٹھا کر ہسپتال لے جائے گئے تو اس نے اچانک آنکھ کھولی اور کہا۔  
”ٹھہر جاؤ مجھے فی الحال ہسپتال منت لے جاؤ۔“  
”کیوں؟“

”پہلے اخبار کے فوٹو گرافر کو جاؤ تاکہ وہ میرا فوٹو لے کر کل کے اخبار میں چھاپ دے۔“

# دلی جو ایک شہر ہے

دہلی کا آداگون

مجھے جہن دہلی گئی بار بار جڑی اور کئی بار آبا دہولی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دہلی کو اجڑنے اور آباد ہونے کا پرانا چیکا ہے۔ وہ اجڑنے کے لئے آباد ہوتی ہے اور آباد ہونے کے لئے اجڑتی ہے۔ یعنی آواگون گی تخیلوری میں یقین رکھتی ہے۔ بار بار جنم لیتی ہے۔ بار بار مرنے سے۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ بار بار اسی گھر میں جنم لیتی ہے جہاں سے اسکی ادنیٰ بھٹی توم بھی روح وہی نام، وہی مقام — صرف چولابدل لیتی ہے۔ بلکہ کئی بار تو چولاسی وہی ہوتا ہے۔ صرف اسے ڈرائی کھین کر لیتی ہے، اس کا رنگ بدل دیتی ہے، اس پر نئے پھول اور بیل بوٹے کاڑھ لیتی ہے۔ شاید اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لئے یا نئے نادر شاہ کو ترغیب دینے کے لئے کہ دیکھو میں کتنی پگڑش ہوں۔ آؤ اور میرے حسن کو لوٹ لو۔ میری مانگ اجاڑ دو کیونکہ میں اجڑنے کے لئے ہی پیدا ہوئی ہوں۔ میری بہادر میری خزاں ہی کا عکس ہے۔ مجھے اجاڑ دو، لوٹ لو، مار دو

کیونکہ میری موت ہی تھی۔۔۔ زندگی کا پھول کھلتا ہے۔

## دہلی۔۔۔ ایک اٹھارہ سالہ دو شیزہ

آج کی دہلی ایک ایسی دو شیزہ کی طرح ہے جس پر جوانی ٹوٹ ٹوٹ کر آتی ہے اس سے آنکھ ملانے کے لئے سورج دہلی تا کی سی آنکھ چاہئے اور ہر شئی دشوار میں سما سنا تفرق میں ورنہ ایمان بدلتا ہے یہی ایک سکڑ نہیں لگتا۔ ایک بار جو دہلی آ گیا وہ اس کی زلزلت کے جال سے نکل نہ سکا اور جوا بھی تک دہلی نہیں آیا۔ وہ دور بیٹھا اس کے فراق میں آہیں بھر رہا ہے اور کون جانتا ہے کہ وہ ایک آہ ایسی لمبی بھرے کہ خود بخود کھینچ کر دہلی تک آ جائے۔ اور دہلی ویسے اسٹیشن پر پہنچ کر پوچھے: کیوں جھاب کیا دہلی میں ہے؟“

اور اسے جواب ملے: ”معاف کیجئے مجھے فرصت نہیں“ اور کسی سے پوچھ لیجئے۔“

## کسان سے سمگلر تک۔

اگر آپ بھی دہلی نہیں آئے ہیں تو کسی نہ کسی بہانے جلدی ہی آ جائیں گے کیونکہ دہلی آنے کے کوئی بہانے ہیں۔ آپ کسی منظر ہرے میں شامل ہو کر آ جائیں گے تاکہ پارلیمنٹ کے سامنے آکر منظر ابھر کر سکیں جس کے ارد گرد عام طور پر دقت بہہ لگی رہتی ہے۔ وزیر اعظم کی کچھن کے باہر بھوک ہڑتال کرنے کے لئے آ جائیں گے۔ لگاؤں میں بھوکوں مر مر کر دہلی میں توکری کرنے کے لئے آ جائیں گے کیونکہ یہاں کے جنا بگار بھیکاریوں کے کشکولی میں پانچ دس پیسے کے سکے ڈال کر احساس گناہ کم کرنے کے بہت شوقین ہیں اور اگر آپ کے پاس دولت زیادہ ہے تو آپ دہلی کے اسٹار کا ہوٹل میں چائے پینے کے لئے آ جائیں گے۔ جہاں پانچ روپے فی کپ چائے ملتی ہے۔ اور جہاں کے ببر مغل شہزادے لگتے ہیں۔



معلوم ہوتے ہیں۔ اور اگر کوئی بہانہ نہ ملے گا تو آپ کوئی دکانی چیز سمگل کر کے دہلی لے آئیں گے گھڑیاں، اسونا، اندج، کپڑے، لوہیاں، عورتیں، کیونکہ دہلی اس گلیروں کی بہت چھیتی منڈی ہے۔ جہاں گھڑی سے لے کر لڑکی تک ہر چیز بغیر رسید پرچہ کے منہ مانگے داموں تک جاتی ہے۔

غرض آپ کسی بھی بہانہ سے آئیں گے، جلد بایدیر دہلی ضرور آئیں گے اور یہ یہیں کے ہو کر رہ جائیں گے۔ شادی کر رہے۔ بچے پیدا کر رہے گے، بچے پھر لکھ جی ہو جائیں گے یا صرف بچے دونوں حالتوں میں دہلی آپ کو برداشت کرے گی۔

### اجنبی باشندوں کی بستی

دہلی میں داخل ہونے کے کئی راستے ہیں۔ اور ہر راستے سے ہر روز ہزاروں لوگ دہلی پر حملہ کرنے کے لئے داخل ہوتے ہیں اور پھر دہلی کے کوچہ و بازار میں یوں پھیل جاتے ہیں کہ دہلی ہی کے باشندے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ایک اجنبی حملہ آور اور دہلی کے مستقل باشندے میں نیز کرنا اشتباہی مشکل ہے۔ آپ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ایک بہاری چھوٹا "جو دہلی کے ایک ہوٹل میں برقی مائیکرو ہے۔ آٹھ سال سے دہلی میں مقیم ہے۔ یا آج صبح ہی بدایوں کے اڈے پر اترا ہے یا کافی ہاؤس میں جو سیاہ رنگ کا مدراسی جینلیں۔ سیاہ رنگ کا سوٹ پہنے سیاہ رنگ کی کافی پی رہا تھا۔ سفر ٹل سکڑ ٹریٹ میں گذشتہ دس سال سے کلر کی کر رہا ہے۔ یا آج ہی مدراس میں سے سوار ہو کر دہلی میں کلر کی کر کے آیا ہے۔ اور یا اجیری گیٹ سے جس تانگہ بان کے تانگے پر آپ سوار ہو رہے ہیں وہ ۱۹۷۱ء میں یہاں تانگہ بانی کرنے۔ آگیا تھا۔ یا سہارن پور میں اس کا چینی کا ٹرپ تھا جو کسی درجہ سے چل نہ سکا اور یہ دہلی میں یا تانگہ چلانے کے لئے ایک ہی ہفتہ چلے آیا ہے۔

دہلی کے باشندوں اور باہر سے آنے والوں میں امتیاز کرنا کیوں مشکل ہے؟ اس نئے کہ موجودہ دہلی کا نہ کوئی اپنا کچر ہے نہ لباس ہے نہ زبان جس سے یہ پتہ چل سکے کہ یہ دہلی والا ہے اور یہ کھلکے والا اور یہ لگھمنو والا۔ دہلی کی کسی سڑک پر اگر دو آدمی چل رہے ہوں تو آپ یہ جان کر حیران ہو جائیں گے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی زبان نہیں جانتے۔ ایک نے کوٹ پتلون پہن رکھا ہے تو دوسرا دھوئی کرتے میں ملبوس ہے۔ ایک نے کوٹ پتلون کے اوپر گاندھی ٹوپی پہنی ہوئی ہے تو دوسرے نے کھدر کی اپکین۔ اور پانچ بجائے کے اوپر سیٹ لگا رکھی ہے۔ ایک ابھی ابھی ہوٹل سے پھل چاول کھا کر نکلا ہے تو دوسرے نے پرائیڈ اور چھپا چھپا لٹری فرمائی ہے اور ستم یہ کہ دونوں ہی اپنے آپ کو دہلی کا باشندہ کہتے ہیں۔

### حدود اربعہ کہاں ہے؟

دہلی کا حدود اربعہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ ریاضی اور جغرافیہ کا کوئی قارمولا دہلی پر لاگو نہیں ہوتا۔ دہلی ریاضی اور جغرافیہ کو پس پشت ڈال کر آگے نکل گئی ہے۔ کہتے ہیں کچھ قدرتی حدود ہوتی ہیں، جیسے دریا، پہاڑ، نہریں سے کسی مقام کا حدود اربعہ معلوم کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ دہلی میں دریا نہیں ہے، پہاڑ بھی اور نہریں لیکن دہلی نے قدرت کی لگائی ہوئی ان بندشوں کی پروا نہیں کی۔ اور تیز رفتار سیاح کی طرح ان کے اوپر سے دھنماتی ہوئی گزر گئی۔ آج کل یہ دریا، پہاڑ اور نہریں دہلی شہر کے اندر گئی ہیں، یہ دہلی کو قید نہیں کر سکیں بلکہ دہلی نے انہیں قید کر لیا ہے مثلاً بھاری جتنا دہلی شہر کے اندر میں بہہ رہی ہے جیسے پولیس کے گھرے میں کوئی سہا ہوا مجرم۔ دہلی کے گئی پہاڑ جو کہیں اپنے سر اٹھائے کھڑے رہتے تھے، اب دہلی کے باشندے ان پر سے موٹریں لاریاں اور سائیکلیں گنڈا کر دیں لے جاتے ہیں۔ جیسے یہ

پہاڑوں میں جگہ ان کے زرخیز غلام ہوں۔ سارے پہاڑوں کے چھوٹے چھوٹے جھٹے ہیں گئے ہیں اور دہلی والوں نے ان کا نام پہاڑ گنچ، پہاڑی دھیرج، بعد جلد پہاڑی، آئندہ پرست رکھ چھوڑا ہے اور یہ پہاڑ قدرتی پہاڑوں کی بجائے پہاڑی چھوکرے معلوم ہوتے ہیں جو برتن مانجنے کے لئے دہلی میں آگئے ہیں۔

دراصل جب سے دہلی آزادو سہرستان کا دارالخلافہ بنی ہے۔ آزاد اور بے پاک ہو گئی ہے اور کسی الخطر و مشورہ کی طرح چاروں کھونٹ انعام کیلیاں کرنی پھر رہی ہے۔ اس لئے اس کی حدود بدل جاتی ہیں۔ اگر ایک ہفتہ پہلے اس کی مغربی حد پشیل نگر نامی کالونی میں تھی۔ تو ہفتہ کے ختم ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے پنڈ چلتا ہے کہ اب پشیل نگر سے آگے ایک اور کالونی نمودار ہو گئی ہے۔ جواب دہلی کی مغربی حد کہلاتی ہے۔ مشرقی حد میں پہلے جتنا دس تھی۔ اس کے بعد شاہدرہ بن گئی۔ اور اب شاہدرہ والے سرواہ بھر کر کہتے ہیں کہ اب ہم مشرقی حد نہیں رہے کیونکہ ستاروں سے آگے ایک اور کالونی کا جہاں بس گیا ہے۔ غرض دہلی کی حدیں ٹوٹی تھیں اور نئی ٹوٹی رہتی ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دہلی میں شیطاں آگے ہے جیسا کہ آفتوں کو چاروں طرف پھیلاتا چلا جا رہا ہے اور کچھ عجیب نہیں کہ ایک دن ہم یہ خبر سنیں کہ دہلی کی ایک حد مکملتہ ہے اور دوسری حد سری نگر ممکن ہے، انفطر سے ہندوستان نام کا ملک غائب ہو جائے۔ اور دہلی نام کا ملک نمودار ہو جائے۔ کیونکہ ہندوستان سمٹ رہا ہے اور دہلی بڑھ رہی ہے۔ دہلی ایک جسم ہے جس میں ہندوستان کی روح داخل ہوئی جا رہی ہے۔ جسم اور روح کا یہ اتصال مڑ بچڑی ہے یا کامیڈی۔ اس کا فیصلہ ہم آنے والے مورخ پر چھوڑتے ہیں۔

## ایک نہیں پانچ دہلیاں

بہت سے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ دہلی صرف ایک ہے۔ انہیں یہ غلط فہمی

دور کر لینا چاہئے۔ کیونکہ دہلیاں پاچے ہیں، پرانی دہلی رنجی دہلی، سترنا دہلی دہلی  
 چھپاؤنی دہلی۔ دہلیاؤں دہلی ادران میں سے ہر دہلی دوسری دہلی سے الگ مزاج رکھتی  
 ہے۔ ہر دہلی دوسری دہلی کی سرکس معلوم ہوتی ہے۔ پرانی دہلی اپنے آپ کو خاندان کی  
 اس بڑی بی کی طرح سمجھتی ہے جس کی کمر میں چابیوں کا گچھا لٹکتا رہتا ہے اور جوابے  
 سامنے خاندان کے سارے افراد کو سچ سمجھتی ہے اور منہ میں پان کی گھنٹی دبائے "پدم  
 سلطان بود" کے نرے لگائی رہتی ہے۔ اور رنجی دہلی خاندان کی وہ ماڈرن  
 لڑکی ہے جو چابیوں کے گچھے کی بجائے کلائی میں پرس جھلاتی ہوئی اپنے آپ کو یورپ  
 وٹرن کہتی ہے منہ میں "چونگ گم" اپنے آپ کو انڈیا کی "ہنر ہنس" سمجھتی ہے اور  
 پرانی دہلی سے الگ کرائی ہوئی کسی مکھی کو ناک پر نہیں بیٹھنے دیتی۔ اور "سترنا دہلی  
 " اپنے آپ کو وہ حسینہ سمجھتی ہے جو اپنی عشرہ فرازیوں کے ساتھ یہاں آئی اور دل حشاک  
 پر حملہ کر کے فاتح بن گئی کبھی مرہیں پان دیا یعنی ہے کبھی چونگ گم اور کبھی گنڈیریاں اپنے  
 آپ کو دہلی کی ناک سمجھتی ہے۔ مگر سرکار اس پر ہمیشہ ہتھیاریوں سے بھاری رہتی ہے جو دہلی  
 دہلی کی پوزیشن اس جلا وطن کی سی ہے جو اب بھی اپنے آپ کو تخت و تاج کا دارلرست  
 سمجھتی ہے۔ اور اپنی رعایا سے دور رہی رہنے میں اپنی بڑائی سمجھتی ہے اور دیوانہ  
 دہلی اس بے بس و دہشیزہ کی طرح ہے جس کا بیاد زبردستی ایک ریجے شخص سے کر دیا گیا  
 ہو۔ جس کے نام کا وہ صحیح لفظ بھی نہیں جانتی۔ لیکن گھونگٹ اوڑھے "جی ورتا دھرم"  
 نبھا کے جا رہی ہو۔

ان پانچوں دہلیوں میں صرف ایک چیز مشترک ہے اور وہ یہ کہ ہم حاکم ہیں  
 سہارنہ ہا حاکم کے سامنے سارا ہندوستان سرحد کا ہے۔ ہم اس دہلی کے مالک ہیں  
 جو ہمالیہ سے اس کنارے تک رائج کرتی ہے۔ دہلی کا ہر باشندہ اپنے آپ کو راجہ  
 محسوس کرتا ہے۔ اپنی دگوں میں شاہی خون دوڑتا ہوا محسوس کرتا ہے چاہے اسے

آسٹریلیا کا گندم ہا کھانے کو ملے ۔

## دہلی کی بسیں ۔

دہلی شہر کے اندر ڈی، ٹی، سی بسیں چلتی ہیں جہاں فوں کو ڈھونڈنے کا کام کرتی ہیں ایک علاقے کے لوگوں کو اٹھا کر دوسرے علاقے میں پھینک آتی ہیں اور دوسرے علاقے کے لوگوں کو تیسرے علاقے میں۔ دہلی کا ایک انسان اگر دوسرے انسان سے جڑا ہوا ہے تو ان بسوں کی بدولت۔ اگر ایک دن کے لئے یہ بس سرویس ختم ہو جائے تو محبہ اپنے عاشق سے نہیں مل سکتی۔ طالب علم اپنے پیچڑ سے نہیں مل سکتا۔ قرضخواہ اپنے مقرض تک نہیں پہنچ سکتا تاکہ اپنے ملازم کے بھرمیں تڑپتا رہے۔ اور کلرک اپنے افسر کی جبر کیاں کھلنے سے محروم رہ جائے۔ حتیٰ کہ آٹا پر ماتما سے نہیں مل سکتی جب تک بس اڑھو کرا سے پر ماتما تک نہ پہنچا دے۔

غرض یہ بسیں دہلی کے پچھلے بھڑوں کا "دھال" کراتی ہیں۔ دہلی بہت سے "بھڑو" ٹکڑوں کا ایک مجموعہ ہے۔ یہ ٹکڑے ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ اگر یہ ٹکڑے ہمیشہ الگ تھاگ رہیں تو دہلی نام کا شہر ہندوستان کے نقشے پر نظر نہ آئے۔ دہلی کو ایک وحدت اکیا کاٹی۔ ایک شہر کی حیثیت اسی وقت ملتی ہے جب ڈی، ٹی، سی بسیں ان بھڑو ٹکڑوں کا ایک دوسرے سے دھال کراتی ہیں۔ اس اعتبار سے دہلی کی بسیں ایک ایسے "ایجنٹ" کی طرح ہیں جو طالب دہلی کو ایک دوسرے سے ملا دیتا ہے۔ اور اپنی دلائی گھڑی گزرتا ہے۔

لیکن یہ بسیں صرف ایجنٹ ہی نہیں ہیں۔ صرف اپنی دلائی "ہی گھڑی نہیں کرتیں صرف عاشق کو محبوبہ سے نہیں ملا نہیں بلکہ خود بھی مجنوں کی طرح ناز و خروش دکھاتی ہیں۔ محبوب کے دیدار کے پہلے آپ کو بس کے دیدار کے لئے تڑپنا پڑتا ہے بس ایک

طرح کی میلی ہے۔ جس کے مجزوں اس کے انتظار میں سوکھ کر کاشا ہر جاتے ہیں۔ ایک عینوں نے تو مجھے یہاں تک بتایا کہ وہ دہلی کے ایک میں سناچے پیدا ہوا تھا یہیں پر ماں کا دودھ نہ پنی پی کر بڑا ہوا۔ یہیں پر مونگ پھلیاں کھا کھا کر جوان ہوا میں کے انتظار میں ہی مطالعہ کرتے کرتے گریجویٹ ہو گیا۔ میں کھڑے کھڑے اس نے شادی کی۔ یہاں تک کہ اب بوڑھا ہو گیا ہے۔ لیکن ابھی تک بس نہیں ملی جس پر سوار ہو کر وہ اپنے باپ کے پاس پہنچ جائے اور اسے یہ خوشخبری سنا دے کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ لیکن دہلی کا ہر محنتوں اتنا صابرو مشا کرتیں ہوتا کہ اپنی ساری عمر بس کے انتظار میں گزار دے۔ چنانچہ وہ ایک کرچھپٹ کر، پٹرک کر، دوڑ کر ابھاگ کر بس کا لٹا قب کرتا ہے اور اس نامحقوق محبوب کو کسی نہ کسی طرح پکڑ لیتا ہے۔ اور جب بس سے اتر کر گھر پہنچتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عینک کا ایک شیشہ ٹوٹ گیا ہے، تیلون گھنے پر سے پھٹ گئی ہے جب کسی بلیڈ سے کٹ چکی ہے۔ اور ہاتھ سے خون بہہ رہا ہے۔ اور گھر جانے کی بجائے اسے ہسپتال مانا جا رہا ہے۔ لیکن آہ! ہسپتال جانے کے لئے بھی بس کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔

اس ذلت و خوارگی کے باوجود جب صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے تو دہلی کے ہر بسا شاپ پر میلوں میں قطاریں لگ جاتی ہیں۔ دہلی کی آدمی کا وہی ان قطاروں میں سمٹ کر کھڑی ہو جاتی ہے اور پھر رات گئے تک بسوں میں بیٹھ کر یوں کی طرح بھر کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دی جاتی ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق دہلی کے باشندے اپنی آدمی عمر بسوں کی نذر کرتے ہیں اور باقی آدمی عمر بسوں کے متعلق سوچ نہیں کرتے کہتے ہیں۔ ایک صاحب کا بیان ہے کہ اس نے گزشتہ چھ ماہ سے اپنے بچوں سے بات نہیں کی، کیونکہ صبح وہ بس نہ ملنے کے خوف سے صبحی گھر سے روانہ ہو جاتا ہے۔ اس وقت بچے سوئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور جب رات کو دیر سے بس ملنے کے سبب

مگر بچپن ہے تو بچے بھی سوچے م۔۔۔

دہلی کی بسیں عہدِ حاضر کی سب سے بڑی ٹریڈی ہیں جو انسان کی عمر بھر تک کو سمجھ کر کھائے جا رہی ہیں۔

## دہلی کے بائیکل اور سکوٹر

دہلی بابوؤں اور بائیکلوں کا شہر ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بابوؤں نے بائیکلوں کو جنم دیا۔ کئی کہتے ہیں بائیکلوں بابو پیدا کئے مگر میری رائے ہے کہ یہ دونوں جڑواں پیدا ہوئے مگر بابوؤں اور سائیکلوں کو دہلی سے نکال دیا جائے تو دہلی بیوہ ہو کر رہ جائے اور گورنمنٹ آف انڈیا ماتھے پر دو ہنڑ مار کر کہے۔ اب کیا فائدہ جینے کا۔ یہ حقیقت ہے کہ بائیکل اور بابو کی برکت ہی سے انڈیا کی عظیم سی پبلک چل رہی ہے۔ ہر روز صبح بائیکلوں اور سکوٹروں کے غول کے غول گلی کوچوں سے ٹکل ٹکل کر سڑکوں پر پھیل جاتے ہیں۔ جو بابوؤں کو اپنے کندھوں پر سوار کئے بھاگ رہے ہوتے ہیں۔ اگر دہلی کی سڑکوں پر بائیکل چل رہے ہوں تو سمجھ لیا جائے کہ ہندوستان کی حکومت چل رہی ہے ورنہ نہیں۔ سرزمینِ ہندوستان پر حکومت کی باگ ڈور بائیکلوں کے ہاتھ میں ہے۔ کیونکہ اگر بائیکل نہ ہو تو بابو دفتر نہیں جاسکتا اور جب دفتر نہیں جاتا تو ہندوستان کا وزیر اعظم تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہے اور بار بار کھڑکی سے دیکھتا رہتا ہے کہ کوئی بائیکل آئے تو وہ حکومت کا کاروبار چلائے۔ شاید دنیا کی کوئی سلطنت بائیکل کی اتنی محتاج نہیں رہی جتنی موجودہ ہندوستان کی گورنمنٹ آف انڈیا

میرا خیال ہے اس مرتبہ اگر دہلی اٹھری تو صرف اس بنا پر اچڑے گی کہ بائیکل نیکٹریاں بائیکلیں بنانا بند کر دیں اور بابو لوگ یہ شعر پڑھتے ہوئے دہلی سے ٹکل جائیں۔

ہے اب اس معجزہ میں قحط غم سائیکل اسد

ہم نے یہ جانتا کہ دہلی میں رہیں آس پر چڑھیں

بابو اور سائیکل دونوں جڑواں پیدا ہوئے ہیں۔ اس نے  
دونوں کے فضائل اور مسائل بھی ایک دوسرے سے بے حد مشا رہیں۔ سائیکل اڑتا  
ترسین سوار رہا ہے۔ اور بابو ایک ارزاں ترسین ملازم ہے۔ سائیکل پر آپ جتنا  
برجبر لاد دیجئے اُت نہیں کرتی۔ بابو پر جتنی فائلیں لاد دیجئے اُٹھتا ہے۔ آپ سائیکل کی  
مرمت نہ کریں تو بھی کام چلتا رہتا ہے۔ بابو کے انجن پر بھی چاہے جتنے ڈھیلے ہو چکے  
ہوں کام کرتا رہتا ہے۔ سائیکل کچھ نہیں کھاتی، فتوڑی سی ہوا بھر دو چل پڑے گی  
بابو بھی کچھ نہیں کھاتا۔ صرف اس کے دماغ میں یہ ہوا بھر دو کہ وہ بابو ہے اپنے دفتر  
کا بادشاہ۔ بابو چلتا رہے گا۔ سائیکل کو فتوڑی سی گریں چاہئے۔ بابو کو دو روٹیاں  
اور چٹنی چاہئے زیادہ عیاشی کرے گا تو دفتر کی کنٹین میں چائے کا ایک کپ  
پی لے گا اور پھر تروتازہ ہو کر اپنی سائیکل کو اٹھا کر نا منگی شکر کے فلمی بول گنگنا تا  
ہوا چل پڑے گا۔ وہ اپنی سائیکل کو بیوک کار کہتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے اپنے  
آپ کو سلطنت کا اصل بادشاہ سمجھتا ہے۔ سائیکل پر بیٹھا ہر تو ہمیش قیمت کا روں  
کو حقارت سے دیکھ کر آگے نکل جاتا ہے۔ دفتر کی کرسی پر بیٹھا ہر تو بڑے سے بڑے  
سیٹیو کو ٹیپکا کر کہتا ہے۔ سیٹیو صاحب! اس وقت میرے پاس ٹائم نہیں  
ہے، کل آتا۔“

دہلی کا بابو اپنی اپنی سائیکل کی فطرت خوب سمجھتا ہے اور اسے ہر سانچے  
میں ڈھال لیتا ہے بابو کی طرح سائیکل بھی بڑی لچکلی فطرت رکھتی ہے۔ بابو کبھی آگے  
اپروہلین کی طرح چاہتا ہے، اس کے پیچھے فائلیں باندھ لیتا ہے۔ کبھی آٹے کی بوری  
رکھ لیتا ہے کبھی گھر کے سودا ساحت کی گھڑی باندھ لیتا ہے۔ اور کبھی جب چھٹی کے



دن تفریح کے لئے نکلتا ہے تو اسی اپنی واحد وفادار بائیکل پر اپنے تین چاندیوں اور بیوی کو لا کر سارا دہلی شہر گھماتا ہے۔ اور پھر ٹرے غز سے اپنی بیوی سے کہتا ہے "سنے کی ماں! چاہے تم میرا ساتھ چھوڑ جاؤ لیکن یہ بائیکل میرا ساتھ کبھی نہیں چھوڑے گی۔ یہ تم سے بھی زیادہ وفادار حیدر ان سائمنٹی ہے اور سدا سہاگن ہے۔ بائیکل اور یا بوبی جوڑی مستقل اور پائیدار ہے۔ اور گورنمنٹ آف انڈیا کا سہاگ اسی جوڑی پر قائم ہے۔

## دہلی کے تانگے

دہلی میں تانگے بھی چلتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ چلتے تھے کیونکہ آج کل توڑ حسرت سے کھڑے دیکھتے رہتے ہیں کہ کبھی جن سڑکوں پر وہ مغل شہزادوں کی طرح گردن اٹھائے چلا کرتے تھے ان پر کار میں اسکوٹا اور بس چل رہی ہیں۔ سڑکوں کی مغل سلطنت ان سے چھین چکی ہے۔ اور اگر کبھی کبھار کوئی تانگہ سڑک پر چلنا ہوا دکھائی دے بھی جائے تو یوں مشرا مشرا کر ایک ایک کر سہم سہم کر گئی کتر کتر کر چلتا ہے کہ کہیں کوئی نوکیلا کر بچاؤ نہ لے کہ سلطنت کا معزول شہزادہ جبار ہے۔ "راؤنڈی سنے تانگے کے تعلقات ٹوٹ چکے ہیں۔ لیکن ان تعلقات کا احساس بھی نہیں ٹوٹا۔ اور احساس کا نہ ٹوٹنا ہی سب سے زیادہ دردناک ہے۔ احساس کے بغیر تانگے کو مکمل "زوان" حاصل نہیں ہو سکتا۔

وہ ہے کی مشین نے تانگے کو بھپاڑ دیا ہے۔ پٹرول اور انجنی اسے بہت پیچھے چھوڑ گئے ہیں جس سے تانگے میں احساس کمتری پیدا ہو گیا ہے۔ اس نے دہلی کی بڑی بڑی سڑکوں پر نکلتا چھوڑ دیا ہے۔ اور چھوٹی چھوٹی سڑکوں گلیوں، کوچوں کے اندر ٹھمتا جا رہا ہے۔ دہلی کی زندگی اتنی تیز ہو گئی ہے۔ اور اتنے

دور دور کے علاقوں تک پھیل گئی ہے کہ بے چارہ تاننگہ اس تیز رفتار زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس لئے وہ صرف اُن تنگ و تنار کیب اور سپاندر علاقوں میں محدود ہوتا جا رہا ہے۔ جن میں داخل ہو کر چند ماشین اپنی زمین کھیتی ہے مگر لوہے کی مشین کا کوئی اعتبار نہیں۔ کب اپنی عارضی زمین کا لبادہ بچاؤ کر بیٹیک دے اور تاننگہ کو اپنی سلطنت کی آخری پناہ گاہوں سے باہر نکال دے اور محکمہ آٹا و قندیمبہ، دہلی کے آخری تاننگے کو اٹھا کر لال قلعے کے اندر ایک کونے میں محفوظ کر کے رکھ دے۔ تاکہ غیر ملکی سیاح آکر اس "ہندوستانی عجوبہ" کو دیکھیں۔ اور اس کا فوٹو کراہیہ کے لائف میگزین میں تقریر کے لئے شائع کیا کریں۔

دہلی کا تاننگہ کبھی رئیس کی سواری سمجھا جاتا تھا۔ رئیسوں نے کاریں خریدیں تو تاننگے نے عوام کی سرپرستی قبول کر لی لیکن اب عوام بھی اسے دغا دیتے جا رہے ہیں اور وہ بھی تاننگوں کی بجائے بائیسکلوں کو ترجیح دینے لگے ہیں۔ کیونکہ وہ بائیسکلوں سے بھی وہی کام لینے لگے ہیں۔ جتنا تانگوں سے لیا کرتے تھے یعنی بائیسکلوں کو باربر سواری کے لئے بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ تاننگے کی طرح بائیسکلوں پر بھی گھڑکی چار چار سواریاں بٹھا لیتے ہیں اور تانگوں سے شرط باندھ لیتے ہیں کہ آؤ میں لگا کر دیکھ لو اہم نم سے پہلے منزل مقصود پہنچ جائیں گے۔

غرض دہلی کے تاننگے اپنے آخری دن جوں توں کر کے کاٹ رہے ہیں اور عام خیال یہ ہے کہ وہ شاید اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں ایک بار پھر رئیسوں کی سواری بن جائیں گے۔ اور کبھی کبھی کوئی رئیس زادہ منہ کا مزا بدلنے کے لئے مطلقاً کا کر نہ یا چکن پین کر دہلی سر پر لگائے پان کی گھوڑی منہ میں دبائے۔ شام کو تاننگے پر پہنچے۔ اور لوگ باگ ایک ایک کر اسے یوں حیرت سے دیکھیں جیسے

بچے سڑ میں گھومتے ہوئے سرکس کے ہاتھنی کو دیکھتے ہیں۔

## دہلی کی کاریں

دہلی کی سڑکوں پر کاریں گھومتی ہیں اور پارلمینٹ کے ممبران بھی لیکن راہ چلتے لوگوں کو دونوں کی اہمیت کا احساس نہیں ہوتا کہ سڑک پر کوئی کار جا رہی ہے۔ یا ممبر پارلمینٹ، کیونکہ جب کوئی چیز عام ہو جائے تو اس کی اہمیت کم ہو جاتی ہے دہلی میں کاریں اور ممبران پارلمینٹ دو بہت عام چیزیں ہیں۔ اس لئے جب وہ سڑکوں پر چلتے ہیں تو صرف انھیں ہی یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ کار ہے یا پارلمینٹ کا ممبر ہے۔

جب کوئی کار والا سڑک پر چلتا ہے تو مزہ جانے گیوں اسے بار بار یہ خیال آتا ہے کہ یہ سڑکیں اور پٹرول پمپ صرف اسی کے لئے بنائے گئے ہیں اور باقی ہر جو لاریاں بسیں، یا ٹیکسیں سکوتر وغیرہ چل رہے ہیں۔ کالے رنگ کے "ریڈانڈین" ہیں۔ اور بد قسمتی سے ڈیموکریسی نہ ہوتی۔ تو انھیں ان سڑکوں پر چلنے کی ممانعت کر دی جاتی۔ جن پر کاریں چلتی ہیں۔ چنانچہ کار والا ان کی طرف ناک سکود کر دیکھتا ہے اور بڑبڑا کر کہتا ہے "اے اے اے"۔ دیکھتا نہیں، کار آ رہی ہے۔ راستہ چھوڑ دے یوں سڑک پر چل رہا ہے، جیسے تیرے باپ دادا کی ملکیت ہے، ہٹ جایا دور چالان سکروادوں گا۔ جانتا بھی ہے ٹریفک پولیس کا سپرنٹنڈنٹ میرے داماد کا۔ معافی ہے۔" اسی چند سال پہلے دہلی میں صوفیوں کے پاس کوٹھی ہوتی تھی۔ لیکن ہمارے دیکھتے دیکھتے کوٹھی کی شرط اڑ گئی، اور اب تو اس آدمی کے پاس بھی کار ہے، جس کے پاس صرف دو کمروں والا کوارٹر ہے۔ میں نے ایک ایسے آدمی کے پاس بھی کار دیکھی ہے۔ جو خالتی کے شعر غلط پڑھتا ہے۔ اور ایک ایسا آدمی تو تھی

کاروں کا مالک بنے چند سال پہلے ایک تئز پر روٹیاں لگانے کا کام کرتا تھا۔ حتیٰ کہ ایک پہلوان کے پاس بھی کار ہے اور وہ صبح اکھاڑے میں جاتا ہے تو کار پر سوار ہو کر جاتا ہے دہلی میں بھاننت بھاننت کی کاریں گھومتی ہیں۔ ان کے رنگ ساڑوزن، شکل و صورت میں فینسی ڈریس شوا کا سا منظر دکھائی دیتا ہے۔ یہاں اسی کاریں بھی چلتی ہیں جن پر لوگ گھاس لادنے ہیں اور اسی کاریں بھی جو در سے جیٹ ہوائی جہاز معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ سب کاریں ہی کہلاتی ہیں۔ چاہے کسی کے پاس کار کے لئے گجراج تنگ نہ ہو مگر وہ اسے گھر کے باہر شکر یا گلی میں یوں کھڑا کر لیتا ہے جیسے کار نہ ہو کوئی گائے بھینس ہو۔

### دہلی کی حسیناؤں ..

دہلی کی حسیناؤں یوں گھومتی ہیں، جیسے جنگل میں شیر گھومتے ہیں۔ دہلی پر ان کا راج ہے۔ جہانگیر نے شراب کے ایک پیالے پر اپنی سلطنت نذر جہاں کر دی تھی، دہلی کے موثر دن جہانگیر صرف کافی کے ایک پیالے پر سلطنت بچھا کر دیتے ہیں۔

دہلی کی بیشتر حسیناؤں دہلی کے کھینٹوں سے نہیں اگتیں بلکہ باہر سے درآمد کی جاتی ہیں۔ دہلی کی اور بھیل حسیناؤں اقلیت میں ہیں۔ اور یہ چھوٹی اقلیت بھی اب ہو لگا کر رائل فیملی میں شامل ہو رہی ہے۔ درآمد شدہ حسیناؤں کے پہلے پہلے طلالتی رخسار غصہ سے لال پڑ گئے تھے۔ لیکن حملہ آور زیادہ موثر دن ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ اس لئے قدیم حسیناؤں نے معمولی سی مزاحمت کے بعد ہتھیار ڈال دیے اور پھر آستہ آستہ خود بھی موثر دن حسیناؤں کے سانچے میں ڈھل گئیں اور جنگل پر راج کرنے میں حملہ آور حسیناؤں کے ساتھ ساتھ ہی جا رہی ہیں۔

ایک مورخ نے اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: "ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ سامراجی حملہ آوروں کے کلچر کو یہاں کے اصلی باشندے اپنا لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک دن ایسا آتا ہے جب اصل باشندے بھی حملہ آور اور سامراجی حاکم معلوم ہونے لگتے ہیں۔"

آزادی کے بعد دہلی ایک کاسموپالیٹن شہر بن گیا ہے۔ اس لئے یہاں کی حینائیں بھی کاسموپالیٹن قسم کی حینائیں بن گئیں ہیں۔ جنگال کی جادو کرنے والی کالی، لمبی زلفیں، سندھ کے پرہیزگار رنگ زاروں میں کھلی ہوئی ولایتی سگریٹ کے پھول لگا کر، جب مدراسی برہمن زادوں کی سائولی سڈول اور رقص کرتی ہوئی میڈلیوں پر، پنجاب کے سنہرے منکئی کی طرح مشوخ و شنگ چمکیلے رخساروں پر خلوار قمیص کا سایہ ڈالتی ہیں تو یورپ کی ٹیلگوں آنکھوں اور بھورے کٹے ہوئے بالوں پر بھی جینوں سوار ہو جاتا ہے کہ بنارس سی سٹریپس کر بازار میں نکلیں اور آتش مشوق میں کاسموپالیٹن حرارت پیدا کر لیں اور جدھر یا زارے گزریں کشتوں کے پتے لگا دیں اور حسن کو عالمگیر بنادیں اور عاشقوں کو "کنفیوژ" کر دیں کہ جگا، شیرے تو کہاں شیرے کس پر شیرے کہ کاکو کی پتھر ملی حسینہ اور کشمیر کی گلنار میر ہوئی دونوں بیک وقت دل کو کھینچ لیتی ہیں۔ اور یہی نہیں سوچنے دیتی کہ دل کس کے حوالے کریں۔ پانچ منٹ پہلے ایک جا پانی گرایا جو دل لے گئی یعنی اب اسے کس منہ سے کہیں حضور! ایک افغان زادی ہم سے دل لینے کا مطالبہ کر رہی ہے۔ براہ کرم ہمارا دل بڑھا دو کہ ۔

یہاں عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

دہلی میں حینائوں کی تعداد کتنی ہے؟ اس کے متعلق کوئی اعداد و شمار نہیں ملنے۔

حکمران مرم شمار ہی اس سلسلہ میں خاموش ہے۔ کیونکہ رولز کے مطابق، حسن شماری کے خلاف نقشن میں شامل نہیں۔ لیکن عام اندازہ یہ ہے کہ حسیناؤں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ایک مستقل قسم کے "شُرک گرد" عاشق کا حلقہ یہاں ہے کہ وہ ایک شُرک پر گزشتہ دس برس سے حسن شماری کر رہا ہے، لیکن ہر روز اس شُرک پر چھتر فی صدی نئی حسیناؤں نمودار ہو جاتی ہیں۔ نہ جانتے وہی حسیناؤں بھیس بدل کر سامنے آ جاتی ہیں یا کسی چھپے ہوئے ریزرو شاگ میں سے نیا مال نکال کر مارگریٹ میں بھیب دیا جاتا ہے۔ اس لئے تعداد کے اضافہ کی صحیح رفتار کا اندازہ لگانا بے حد مشکل ہے۔ خطرہ یہ ہے کہ ایک دن ایسا آجائے گا جب دہلی شہر کی ہر صنعت "ازک" حسینہ سے جچی ہوگی اور ہر حسینہ لاکھوں دل اپنے پرس میں چھپائے پرس جھلاتی نظر آئے گی اور اس وقت شایدا ان کی شمار کرنا نسبتاً آسان ہو جائے گا۔ کیونکہ حسن کی شگرمی میں ہر عام رجحان پھیل رہا ہے کہ لباس کی موڈرن، تنکیوں اور پچھلی تراش خراش ہی کو حسن کی بنیاد بنا دیا جائے اور لباس ہی کو ایک ایسا فنل سورج بنا دیا جائے جس سے چکا چوند میں، نین نقش کے سمیچے چھوٹے موٹے ستارے اور جھل جھلکی عشق کے لئے پراکھ بہت جانکاہ اور آزمائشی دور ہے کہ لب درحنا کی قدیم نزاروں میں لباس سے ڈنڈی مارنا شروع کر دی ہے۔ اور بے جا رے عاشق حیران ہیں کہ اس ڈنڈی سے دل کی قدر قیمت کو سچائی یا حسین سوداگروں کی اس نئے بازی میں غفلت و جان نثار کر ہر مان لیں۔

دہلی کی حسیناؤں کی لیڈر شپ ریویورسٹی کی لڑکیوں کے ہاتھ میں ہے کیونکہ وہ دل لینے کے منت سے ڈھنگ ایجاد کرتی رہتی ہیں۔ اگر کسی شام کو ریویورسٹی کی ایک حسینہ جو گئے ٹنگ کا لمبا کرتا زیب تن کر کے میدان کارنار میں اخترا تی ہے تو دوسری شام کو دہلی کی تمام حسیناؤں جو گئیں بنی ہوئی نظر آتی ہیں اور ابی تیری

شام پوری طرح ختم نہیں ہوئی کہ یونیورسٹی کی کوئی حسینہ جو گیا لباس اتار کر تنگ چٹون پہن لیتی ہے۔ جیسے وہ حسینہ نہ ہو بلکہ اسی کورس کی چاق و چوبند گفٹ سوار ہو۔ چنانچہ چونکہ شام دہلی کے سلم ایریا میں رہنے والی رام جی داس کلرک کی میٹرک پاس بیٹی ٹائپسٹ کا کام کرتی ہے۔ نزدیکی ٹیلیویشن کو تنگ چٹون تیار کرنے کا آرڈر دے آتی ہے کہ فیشن بدل گیا ہے اور حسیناؤں نے کوئی "ٹرائی کلا" لباس پہنا شروع کر دیا ہے۔

دہلی کی حسیناؤں کی کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی۔ ان کی زلفوں کی طرح اس کہانی کے بھی کئی سچے، کئی ختم، اور کئی شاکل ہیں۔ لیکن میں صرف ایک بات کہہ کر اسے ختم کرتا ہوں، دہلی کی حسینائیں وہ لیلیائیں ہیں جو مجنوںوں پر جان نثار کرنے کی قائل نہیں ہیں۔ صرف کبھی کبھار ایک آدھو خرد کشتی کی خبر آجاتی ہے جسیناؤں کی تعداد کے اعتبار سے خود کشیوں کی یہ تعداد کٹے سی نمک کے برابر ہے۔

## دہلی کے عاشق

دہلی کے عاشقوں کی سب سے بڑی شریلیٹی یہ ہے کہ ان کی اپنی کوئی آواز نہیں ہے۔ وہ صرف دہلی کی حسیناؤں کی گنبد کی صدائے بازگشت ہیں۔ اگر آپ چاہیں کہ دہلی کے کسی عاشق کو الگ کر کے دیکھیں تو آپ کو مایوسی ہوگی۔ کیونکہ وہ کسی نہ کسی حسینہ کے درپے میں تنکے کی طرح اٹکا ہوا نظر آئے گا اور وہ تنکا دو پٹے کے بغیر آپ کو لا درت نظر آئے گا۔ وہ پٹہ ہی اس کی سہتی کی ضمانت ہے۔ اور اگر آپ اسے دو پٹے سے الگ کر کے دیکھنا چاہیں گے تو وہ یوں لگے گا جیسے سگر میٹ کی راکہ زمین پر گر گئی ہے

دہلی میں عاشقوں کی تعداد حسیناؤں سے کئی سرگنا زیادہ ہے۔ تعداد

اس بے شک اضافہ نے عشق کا معیار گرادیا ہے اور عاشق لوگ اس گرے ہوئے معیار کو نہیں دیکھ سکتے۔ کیونکہ عشق اتنا دھماکتا ہے۔ مجھے ایک عاشق کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ حسن کا تقاب کرنے کے لئے ہر روز یا ٹیکسیکل پر پندرہ پندرہ میل کا سفر کرتا رہا اور آخر ایک دن جب اس کی محبوبہ نے دُور محبت میں اس سے پوچھا: "پیارے میرا جی چاہتا ہے کہ تجھ پر کچھ کھچاؤ کر دوں۔ بول کیا مانگتا ہے؟"

جواب میں عاشق کے منہ سے بے ساختہ نکلا: "پیارے! مجھے ایک سکڑے دو۔" محبوبہ سے اب زیادہ دیر با ٹیکسیکل نہیں چلائی جاتی۔

دہلی کا عاشق حساب کتاب کا عاشق ہے۔ وہ عشق کو با ٹیکسیکل اور سکڑے توڑتا ہے۔ وہ بے حد چوڑا ہو کر دیکھتا ہے کہ حسینہ کے حسن کی کیا قیمت ہے۔ وہ کافی کے کتے کپ پلا چکا ہے۔ اور اس کے بدے میں اسے کتنی مسکراہٹیں مل چکی ہیں۔ اگر محبوبہ کی طرف سے مل ہوئی مسکراہٹوں کی تعداد کم ہے تو عاشق کا ناوک شدید دل چور چور ہو جاتا ہے۔ اور وہ محبوبہ پر بے وفائی کا الزام لگا دیا ہے۔ اگر زیادہ ذکی اہل پس ہو جاتا ہے تو مسکراہٹیں کم ہونے کے غم میں ٹھنڈی آہیں بھرتا ہے۔ راتوں کو تارے گنتا ہے۔ اور فلمی گیت گنگاتا ہے اور کافی کے بلوں کے غیر متوازن بھٹکاس طرح پورا کرتا ہے کہ ٹرہیا بلیڈوں کی بجائے گھٹیا بلیڈ استعمال کرتے لگتا ہے۔ بلکہ کسی بار تو ہفتوں شیو نہیں کرتا۔ اور اگر وہ حال ہو کر یہ شعر پڑھے رقت انگیز میں ہجہ میں لگاتا ہے۔

اک بے وفا سے پیار کیا، اے گئے کیا کیا

خود کو ذلیل و خوار کیا اے گئے کیا کیا

دل کے عاشقوں کی ایک اور بلند قسم بھی ہے جو حسن کا مول تول

نہیں کرتی، بلکہ اپنے عشق کا مولی تول کرتی ہے۔ اس قسم کے عشق میں کافی کے پیالے



نہیں لئے جلتے اور مزد کیا جاتا ہے کہ حسن کے تقاب میں کار کا کتنا پٹرول ضائع ہوا۔ بلکہ صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ عاشق کو سوشل اور اقتصادی طور پر کہیں ہٹا کر نہیں سمجھا جا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی میں مکاؤں کے کرائے کی طرح حسیناؤں کا ریٹ بھی بڑھا دیا جاتا ہے۔ بلڈنگ کا کرایہ جتنا زیادہ ہو گا۔ بلڈنگ کی سماجی حیثیت اتنی ہی زیادہ بڑھے گی۔ اور بلڈنگ کی حیثیت بڑھنے کے ساتھ ساتھ بلڈنگ کے مالک کا مرتبہ بھی بڑھے گا۔ اس قسم کے گھر بھی نکمہ نشہ دیکھنے والے مالک مکان قسم کے عاشقوں نے جہاں عشق کا مارکیٹ ریٹ بہت بڑھا دیا ہے وہاں محبوباؤں کے دماغ بھی بگاڑ دیئے ہیں اور عشق کے مفہم کو چھٹک بیلنس کی سالانہ رپورٹ بنا دیا ہے۔ آپ کے پاس کار ہے یا ناگہ۔ یا آپ صرف کسی پبلک پارک میں ایک آنے کی منگ چلی ہیں سے محبوبہ کا دل دھج رہا ہے؟ کار ناگہ اور منگ چلی میں جتنا فرق ہوتا ہے، اسی فرق کی بنیاد پر عشق کیا جاتا ہے اور ان چیزوں کو پرکھنے کی کسویٰ صورت حسیناؤں کے پاس ہے۔ اسی لئے میں نے کہا ہے کہ دہلی کے عاشق کے پاس اپنا کچھ نہیں ہے جو کچھ ہے حسیناؤں کے پاس ہے۔ دہلی کے عاشق حسیناؤں کے دوپٹے کے تنکے ہیں۔ اس تنکے کو الگ کر کے دیکھیے تو نہ کار کی حیثیت باقی رہتی ہے نہ بائیکل کی۔ نہ پتے اور بادام کی نہ منگ چلی کی۔ غریب اور امیر دونوں کے عاشق مول تول کا فکا رہیں۔ اور یہ مول تول محبوباؤں کے اختیار میں ہے۔ عاشقوں کے اختیار میں تو صرف چند روپے تنگ۔ اسٹار ہیں جنہیں پڑھ پڑھ کر وہ اپنے شب دروز بگاڑ رہے ہیں۔ اس کے باوجود سمجھتے ہیں کہ وہ فیس اور رائجے کی روایات کے وارث ہیں۔

دہلی کے عاشقوں کی ایک اور قسم بھی ہے جن کے پاس کوئی محبوبہ نہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کے پاس اپنے عشق کی کئی مفروضہ کہانیاں موجود

ہیں۔ اور وہ محفلوں میں اکلیوں میں ریڈیو رانوں میں اپنی ان محبوباؤں کے دلفریب قصے بیان کرتے رہتے ہیں جو ابیل پیدا نہیں ہوئی اور اگر پیدا ہو چکی ہیں تو عاشقوں کے نام پتے اور شکل سے آگاہ نہیں مجھالیے ہی ایک عاشق سے ملاقات کا سٹر حاصل ہے۔ وہ راہ چلتی ہر تیسری حسینہ کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ اس پر مرنی ہے۔ اور آج کل دو بچوں کی ماں بن چکی ہے۔ فلاں مرنیوں جیسے دانتوں والی حسینہ میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی اور اس نے میرے ساتھ ساری عمر گزارنے کا عہد کیا تھا۔ لیکن اس کی ایک چھوٹی ٹیسی بے وقوفی پر میں نے اسے دھتتا بنا دیا۔ اپنی بے وقوفی اور میری بے نیازی کے باعث ابھی تک شادی نہیں کر سکی۔ اور فلاں نیلیگوں ساڑھی اور آنکھوں والی حسینہ مجھے اعنا کر کے تاج محل تک لے گئی تھی۔ لیکن جب میں نے کہا کہ میرے پاس شادیوں کی طرح اتنا روپیہ نہیں ہے کہ تمہارے لئے ایک تاج محل بنوا سکوں تو اس کا دل ٹوٹ گیا۔ اور آج کل تاج محل کی بجائے ایک چھوٹے سے کوارٹر میں رہتی ہے اور کلرک کی نیچے پیدا کرنے والی ٹائپ مشین بنی ہوئی ہے۔

ان عاشقوں کی عمر کے متعلق جب کسی حسینہ کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب سب حدود سے آگے بڑھ گئی ہے اور ان کی خود کشی کا خطرہ ہے تو ان میں سے کوئی حسینہ رحم کھا کر ان کی طرف بڑھتی ہے اور کہتی ہے کہ "اب" سب قصے تمام ہوئے۔ اب شادی کر لو۔"

جس پر وہ جوابیت آگیا مہیٹ اور بے بسی کے عالم میں "ہاں" کہہ دیتے ہیں اور کسی بینڈ پارٹی کا ایڈریس پر جتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جو ان کے فرضی عشق کے ماتم اور حقیقی شادی کی خوشی کی دھن بچا سکیں۔

اسی گم مامی خوشیوں میں شرکت کرنے کا مجھے بس غر حاصل ہو چکا ہے۔

## دہلی کے مکان

دہلی میں صرف دو قسم کے انسان رہتے ہیں۔ مالک مکان اور کرایہ دار ایک انور قسم میں ہے۔ جزا مکان کہلاتی ہے اور خدا کی طرح ہر جگہ موجود ہے فٹ پائنتوں پر تھڑوں پر، بارکوں میں، پلوں کے نیچے، پلوں کے اوپر، برآمدوں میں کھنڈروں میں مگر یہ صفتی قسم ہے۔ خدا کی طرح مکان سے بے نیاز ہے۔ حقیقی قسمیں دو ہی ہیں۔ مالک مکان اور کرایہ دار۔

مالک مکان — مکان بناتے ہیں۔ اپنے لئے نہیں بلکہ کرایہ داروں کے لئے دہلی میں جو مکان بنتا ہے اس میں کرایہ داروں کے مزاج اور عناد کی کوائنٹوں کی طرح چن دیا جاتا ہے۔ جن مکانوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ ان کے متعلق مالک مکان سمجھتا ہے بیکار پیسہ ڈلو یا مکان کے نقشے ہی میں کرایہ داروں کے چہرے اور جیب فرٹ کر دی جاتی ہے۔ بلکہ اکثر اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ مکان کے لئے ابھی سینٹ کی منظر بھی نہیں آئی کہ اس پر کرایہ داروں کا ہر ڈلگ جاتا ہے۔

دہلی میں ایسے مالک مکان بالکل گدھے سمجھے جاتے ہیں جو کرایہ دار نہیں رکھتے اور شکوہ کہ دہلی میں گدھوں کی تعداد بہت کم ہے۔ مجھے ایک ایسے ہی گدھے رئیس کے بارے میں معلوم ہے کہ اپنی کونٹھی میں کرایہ دار رکھنے کا سخت مخالفت ہے۔ لیکن اس کی بیوی اسے ایک سو روپیہ ماہانہ گریڈ میٹ ہے ایک چڑا سنی نے اپنا مکان اپنے بیٹے اور بہنو کو کرایہ پر دے رکھا ہے۔

## چاٹ والے سے ممبران پارلیمنٹ تک :

دہلی کے مکان۔ انسانوں کے لئے نہیں، کرایہ کے لئے نہائے جاتے ہیں۔ جگہ



کے گرد و گولہ کے پہل کی طرح ٹھہرتے ہیں۔ اگر یہ داروں کی جتنی اقسام ہیں۔ اتنی ہی اقسام کے تغیر سے آرٹ ہیں۔ آرٹ — غرضی چیز ہے۔ گراہے بنیادی چیز ہے۔

یہاں کے مکان چار قسم کے ہیں۔  
 (۱) قدیم مکان (۲) نئے نکلے اور کوشیاں (۳) عوامی مکان (۴) مسلم ایریا کی جعبہ تیریاں۔

## دہلی کے قدیم مکان۔

مکانوں کی قیسم پرانی دہلی میں پائی جاتی ہے۔ انہی مکانوں کی گلیوں کے بارے میں ذوق نے کہا تھا۔ ع

کون جائے ذوق اب کی گلیاں چھوڑ کر

یہ گلیاں اتنی تنگ و تاریک اور بھول بھلیاں قسم کی ہیں کہ ان سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ ہی نہیں۔ اس لئے انہیں چھوڑ کر جانا آسان نہیں۔ ذوق نے ٹھیک کہا تھا۔ ان سے باہر نکلنے کا واقعی کوئی راستہ نہیں۔

قدیم طرز کے یہ مکان اس زمانے کے انسانوں کی گہری اور قریبی محبت کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے اتنے قریب ہیں۔ اتنے جڑے ہوئے ہیں کہ ایک مکان کا یا چندہ اپنی چھت پر کھڑا ہو کر دوسرے مکان کی چھت پر کھڑے ہوئے یا چندے کا دوسرے سے مل کر ڈوسٹ کا سکتا ہے۔ ایک دوسرے کا سگریٹ سوسا سکتا ہے۔ غصہ آئے تو ہاتھ بڑھا کر تھپڑا سکتا ہے۔ ان مکانوں کی عورتیں اپنے گھروں سے نکلے بغیر ایک دوسرے کو گالیاں اور کوسنے دے سکتی ہیں۔ وال بڑی ایکس چنج کر سکتی ہیں۔ اپنی چھت پر کھڑے کھڑے تفریقیت تک کر سکتی ہیں۔ غرض یہ قدیم طرز کے مکان دو انسانوں کے دھماکے اور فریب کا سمبل ہیں۔ اور زبان حالی سے کہہ رہے ہیں

۱۔ دنیا بھر کے لوگوں کو قریب آجاء۔ کیونکہ قربت ہی تمہارے دکھوں کا علاج ہے نہ صرف علاج ہے بلکہ خود بھی ایک دیکھ ہے۔ اس لئے دیکھیں ہونا چاہئے ہوتا ایک دوسرے کے مکانات کو اپنا قریب لے آجاء مردوں کو مورچے بنانے میں اور عورتوں کو سیاہ کرنے میں سہولت ہو جائے۔

یہی جذبہ وصال و قربت ہے کہ اگر ان میں سے ایک مکان بھی گرے تو وہ بیدار دوسرے مکان پر گرے گا۔ اور دوسرا مکان تیسرے پر۔ اور اس طرح ایک مکان کے گرنے سے ایک سا تین چار مکان گر جاتے ہیں۔ جیسے بچھڑے ہوئے اہل محبت ایک دوسرے پر بوسے ثبت کر رہے ہوں۔

اور چونکہ یہ قدیم مکان ہیں۔ اس لئے عام طور پر گرتے رہتے ہیں۔ اگر چنانچہ اگر نا بد شگون سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہ دہلی کے قدیم کلچر کی یادگار ہیں۔ انہیں محفوظ رکھنے کے لئے برابر اینٹیں اور پلستر لگائے جاتے ہیں۔ اس کلچر کو محفوظ کرنے کے سلسلہ میں فراموش بھی نہیں جاتی ہیں اور ہر سال مکان گرنے سے بہت سے لوگ طبع کے نیچے آکر شہید ہو جاتے ہیں۔

جب یہ قدیم مکان طبع بن جائیں گے۔ دہلی کا قدیم کلچر بھی طبع بن جائے گا اور انشا اللہ وہ دن بہت جلد آ رہا ہے۔

### کوٹھیاں اور منگلیے

مکانوں کی دوسری قسم کو ٹھیاں اور منگلیے ہیں۔ ان کی طرز تعمیر میں یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ ان میں مصری، ایرانی امریکی، فرانسیسی، روسی، جاپانی، افریقی روح نظر نظر آئے۔ مگر ہندوستان ہرگز نظر نہ آئے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی روح مفلس ہے اور یہ کوٹھیاں اور منگلیے امیر لوگ بناتے ہیں۔ اور وہ نہیں چاہتے کہ ان پر مفلس ہندوستان کا

سایہ پڑے۔ اس لئے وہ اپنی کوٹھیاں ہنسل عوام کی چشم بد سے دور شہر سے یا ہر بنواتے ہیں۔ اگر ان کا بس چلے تو وہ اپنی کوٹھیاں شہر کے باہر ہی نہیں ہندوستان کے بھی یا ہر تعمیر کر دیتیں۔

عوام سے دور شہر سے باہر کوٹھیاں بنوانے کا رجحان آہستہ آہستہ اتنا زیادہ بڑھ گیا ہے کہ شہر کے باہر کوٹھیوں اور جنگلوں کا ایک اور شہر بن گیا ہے اور یہ بڑے لوگ بہت پریشان ہیں کہ اب کیا کریں۔ وہ اس دوسرے شہر سے بھی باہر جنگلوں کی طرف بڑھ رہے ہیں تاکہ عوام سے دور اور فطرت کے نزدیک جا سکیں۔ لیکن وہ جوں جوں جنگلوں کی طرف بڑھ رہے ہیں شہر ان کا پیچھا کر رہا ہے۔ چنانچہ اب دہلی کے ارد گرد جنگل اور پہاڑ عام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ جنگل اور پہاڑوں میں کوٹھیاں اور جنگلے نمودار ہو گئے ہیں۔ فطرت غائب ہو گئی ہے۔ افلاس اور سرمایہ کی رسی نے فطرت کو روند ڈالا ہے، مار ڈالا ہے۔ فنا کر دیا ہے۔

ان کوٹھیوں میں وہی لوگ رہتے ہیں جو دہلی (بلکہ ہندوستان) پر راج کرتے ہیں۔ کار، بل ڈاک، ہرے ہرے لائن، برقی قہقہے، معنوروں کے قیمتی شاپکار، ریشم و کچھاب، دودھ اور چاندنی میں دھلی ہوئی عورتیں، ڈرائیو، پٹنگ روم، رینزنگ روم، ڈیننگ روم، ڈرائیو روم، چیمبر، روم، ڈانس روم، انگریزی میں منہنا، روتنا، لٹنا، عشق کرنا۔ غرض راج کرنے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے۔ وہ سب ان کوٹھیوں میں جمع کر لی جاتی ہیں۔ ان سب نعمتوں کے لئے روپیہ کہاں سے آتا ہے؟ یہ رائل فیملی کے شہزادے ہی جانتے ہیں۔ کیونکہ یہ ان کا "ٹریڈ سیکرٹ" ہے۔

ہاں! دہلی میں ایک افواہ ضرور پھیلی ہوئی ہے۔ کہ یہ سب نعمتیں وہی لوگ ہی کرتے ہیں جن سے یہ شہزادے بھاگ بھاگ کر جنگلوں کی طرف بڑھتے اور کوٹھیاں بناتے

جابر ہے ہیں۔

یہ کہ مٹیاں اور بچے کرایہ پر مل جاتے ہیں، لیکن ان میں صرف وہی کرایہ دار رہتے ہیں جو خود بھی مائل غنلی سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ ان کا کرایہ بھی شاہی ہوتا ہے کہتے ہیں ایک بار ایک سرکاری افسر نے جن کی تنخواہ ایک ہزار روپے ماہانہ تھی، ایک کوٹھی ایک ہزار روپے ماہانہ کرایہ پر لے لی وہ اپنی تنخواہ کرایہ میں دے کر کوٹھی کے باہر بیٹھ گیا۔ اور ہر راہ چلتے کے سامنے ہاتھ پھیلا کر کہنے لگا۔ بابا! خدا کے نام پر ایک پیسہ دے دو۔ بھوکا ہوں۔“

لیکن شام تک اسے بھوک میں ایک پیسہ تک نہ ملا کیونکہ ہر راہ چلتے گئے یہی سمجھا۔ ایسا سوڈو بونٹا آدمی بھوکا رہی نہیں ہو سکتا۔ مذاق کر رہا ہے۔

## عوام کے مکان

دہلی عوام کا شہر ہے۔ اس لئے ان کے مکان بھی بڑے ہیں ان کے مکانوں کی وہی ساخت ہے جو عوام کی اپنی ساخت ہے۔ عوام بھوک کے مارے ہیں۔ اس لئے ان کے مکان بھی یوں دکھائی دیتے ہیں جیسے صدیوں سے بھوک ہڑتال پر ہیں۔ عوام کے مکان عوام کے کلچر کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی تعمیر کے وقت بھی عوام کے کلچر کا خاص دھیان رکھا جاتا ہے۔ ایک کمرہ ایک رسوائی۔ ایک باغ۔۔۔ مگر نہیں۔ باندروم کا کام رسوائی سے بھی لیا جاسکتا ہے اور بس۔ اس سے زیادہ کی عوام کا کلچر اجازت نہیں دیتا۔ اگر کسی عام آدمی کے پاس ایک کی بجائے دو کمرے ہوں تو اس کی بیوی یہ کہہ کہہ کر اس کی نیند حرام کر دیتی ہے کہ یہ دوسرا کمرہ کرائے پر اٹھا دو۔ ہماری ضرورت سے زیادہ ہے۔ اور کچھ نہیں تو اس کرایہ سے بچوں کی نیکریں اور قمیصیں ہی بن جائیں گی۔



عوام شائستہوں کے انبیائی ہیں، اس لئے ان کے مکان بھی شائستہوں کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان مکانوں کے صبر و قناعت شکست ہے۔ حرص و ہوا کا ادھر کبھی گڑ نہیں ہوتا۔ اکڑوں اور جموں کا غرور انھیں جمعیت تک نہیں گیا۔ ایک پادشاہ سپدرہ عوامی کنبوں کے لئے کافی ہے۔ ایک غسل خانہ میں دس دس گھوڑے استھان کر لیتے ہیں ایک ہی کمرے میں چار پائیاں، کرسیاں، ریڈیو سیٹ، انگلیشی، جوڑے کتا ہیں برتن ہر چیز سما جاتی ہے۔ کیونکہ عوام کی تعمیر ری رہے کہ دل بڑا ہونا چاہئے مکان نہیں۔ دل بڑا ہے تو اس میں کرسیاں بھی رکھی جاسکتی ہیں اور پانی کی بالٹیاں بھی۔ کئی لوگوں نے تو اپنے دل میں بچپن کے لئے پلے گراؤنڈ تک بنا رکھے ہیں۔ جسے دیکھ کر وہ خراک کا شکر بجا لاتے ہیں۔ جس نے انھیں صرفہ سیٹ عطا نہیں کیا۔ ورنہ وہ اسے کہاں رکھتے۔

عوام کے ان مکانوں کی ایک اور کھچول خصوصیت یہ ہے وہ یہ کہ ان مکانوں کے ناموں میں شکایت اور جھوٹ روا نہیں رکھا گیا یعنی عوام نے اپنے مکانوں کے "شیش محل"، "بریم بھون"، "قصر احمد"، "آرام محل"، "عشرت کدہ" جیسے شائستہ نام نہیں رکھے۔ بلکہ ان کے مکانوں کے نام منہ سوں پر رکھے گئے ہیں۔ بلاک نمبر ۱ کو ارٹ نمبر ۱۰۔ چوبیس نمبر، اٹھائیس نمبر، پچاس نمبر۔ ان سیدھے سادے، غیر پیچیدہ ناموں سے عوام کو ایک قائد یہ ہوا کہ عوام کو سب اپنے نام رکھنے کی ضرورت نہیں رہی یعنی اگر کسی کا نام گنیشام لال ہے تو اسے گنیشام لال کے نام سے نہیں پکارا جاتا۔ بلکہ یہ کہا جاتا ہے، "اٹھارہ نمبر والا یا نفا"۔ کہا تھا، "پائیس نمبر والے کی بیوی اس کے نیچے کا خلاف چرا کر لے گئی ہے"۔ ہم نے پائیس نمبر والے سے اس کی شکایت کی تو آٹھ نمبر والا باہر نکل آیا اور اس کی بے جا حمایت کرنے لگا۔ یعنی عوام کا کوئی نام نہیں رہا۔ مکانوں کا نام ہی باقی رہ گیا ہے عوام

اب اپنے مکان کے نام ہی سے پہچانے اور پکارے جاتے ہیں۔ عوام اب نشان نہیں رہے مکان ہو گئے ہیں۔ عوام اور مکان میں بعید مبادیٹ گیا ہے۔ اور "تو من شدم، من تو شدم" کے مصداق ایک دوسرے میں ضم ہو گئے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے آتما، پرمانما میں مل جاتی ہے اور عوام کے کلچر کی وہ بلند ترین منزل ہے جہاں سے عناصر صرف ایک آدھ اپنا آگے دھنکے۔

## سلم ایریا کی جھوٹریاں

دہلی میں سلم ایریا کی جھوٹریاں ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ ان کا کوئی طرز تعمیر نہیں۔ یہ خود رو پودوں کی طرح اٹھتی ہیں اور خود بخود مرجھا جاتی ہیں۔ یہ عام طور پر گردے والوں، ٹیشی علاقوں اور جھاڑ جھنکاڑ کے پاس بنائی جاتی ہیں۔ بظاہر یہ دہلی کے ماننے پر داغ معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اس داغ کے بغیر دہلی کا ماتھا مکمل نہیں ہوتا۔ اس لئے جب دہلی کے ماتھے کو صاف کرنے کے لئے ایک جھوٹری عرائی جاتی ہے تو نئی جھوٹریاں جنم لے لیتی ہیں۔ دہلی کے مہذب حکام کا خیال ہے کہ جب تک ان جھوٹریوں میں رہنے والوں کو ختم نہیں کیا جائے گا۔ یہ جھوٹریاں ختم نہیں ہو سکتیں۔ لیکن جھوٹریوں والے چونکہ سماج کی تہذیب کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں اس لئے وہ ختم نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ تہذیب کی کوکھ کو بانجھ کرنا کس کے بس کا روگ نہیں۔

یہاں وجہ ہے کہ تہذیب کے ٹائٹلڈے ان جھوٹریوں کو ہمیشہ زندہ رکھتے ہیں۔ انہیں "پانی، بجلی اور تالیاں مہیا کرتے ہیں، انہیں دوشروں کی فرست میں شامل کر لیتے ہیں، ان کے خلاف آواز اٹھاتے رہتے ہیں تاکہ یہ غلامت قائم رہے، زندہ ہے۔ کیوں کہ جمہوریت کو زندہ رکھنے کا یہی نقصان ہے

# خط لکھیں گے...

آنریبل ادگھاٹن سنگھ جی کے نام

وزیر صاحب قبلہ!

کل آپ نے جوتیوں کی دوکان کا ادگھاٹن کرتے ہوئے ایک شعر پڑھا تھا۔

جب بھی کسی نے محبوب کا نام لیا

ہم نے دل اور جگر دونوں کو تھا لیا

ایک حسین شعر کو آپ نے صرف اس لئے ذرا کر ڈالا۔ کیونکہ آپ وزیر تھے

اگر آپ آپریشن کے وزیر ہوتے تو بے شک آپ شعر و ادب کا ستیا ناس کر سکتے تھے

لیکن آپ کو یہ یاد نہیں رہا کہ آپ تعلیم کے وزیر ہیں۔ آنریبل ادگھاٹن سنگھ جی آپ

اپنے مافکے کی طرف خاص و حیان دیجئے کہ آپ کس محکمے سے متعلق ہیں۔

میرا خیال ہے آپ نے گزشتہ مہینے چارپائیوں کی دوکان کا ادگھاٹن کرتے

دقت میں یہی غلط شعر پڑھا تھا اور ایک چٹ فٹ کمپن کی میننگ میں بھی یہی غلط

شعر ارشاد فرمایا تھا۔ کیا آپ کو کوئی اور غلط شعر نہیں آتا؟ میرا مطلب ہے کہیں

کہیں ایک آدھ صحیح شعر بھی پڑھ دیا کیجئے اور اگر یہی غلط شعر ہی پڑھنا ہے تو اس

میں وقتاً فوقتاً مغزوں میں تھوڑی تبدیلی اور اصلاح کر لیا کیجئے، یعنی ہمیشہ دل و دھڑک رہا رہنا کیجئے۔ کہیں پھیپھڑا بھی تنہا لیا کیجئے۔ آخر دوسرے اعضا غلے کیا منظور کیا ہے۔ سب کے ساتھ سوشلزم رہتے۔ سنا ہے آپ سوشلزم کے بڑے حامی ہیں اس انکوائری کمیشن کا کیا بنا جو آپ کی نا جائز اولاد کے سلسلے میں گھر کیا کیا تھا؟ بائی دی دے! یہ بتائیے کہ آپ وزیر بننے سے پہلے کیا کام کرتے تھے؟ کیا یہ افراد صحیح ہے کہ آپ نا جائز مشراب کی بمبئی چلائے ہوئے ایک بار گرفتار ہو گئے تھے۔ لیکن بعد میں تشریف دہری کمیشن کے چیرمین بنادے گئے تھے۔ ماضی کو آپ کا بار نہیں تھا۔ اپنا "حال" کیوں بگھا دیا اور غلط شعر پڑھنے لگے۔ لیکن قسمت کے دھنی ہو آریسل! غلط شعر پڑھی سامعین سے وار کی تالیاں بجوا لیتے ہو۔

## نوجوان بھکارن کے نام

رام کل ڈارلنگ

میں نہیں جانتا تمہارا نام رام کل ہے یا چپا کلی۔ کیونکہ بھکارن کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ وہ نام سے جنہیں کام سے پہچانی جاتی ہے اور "ڈارلنگ" میں نے تمہیں اس لئے لکھ دیا کیونکہ رام کل کچھ اچھا نہیں لگتا۔ پھیکا پھیکا سا لگتا ہے "ڈارلنگ" کا لفظ صرف تمہاری تخیل کے لئے لگایا ہے۔ جیسے لوگ اپنے نام کے ساتھ نقاب، سرسار چودھری، اشری یا مہارشی لگا کر اپنے نام میں جان پیدا کرتے ہیں۔

رام کل! میں یہ بھی نہیں جانتا کہ تم کہاں سے آئی ہو۔ ہو سکتا ہے۔ تمہارا سلسلہ نسب بھی کسی سرسار، چودھری یا نقاب سے ملتا ہو۔ کیونکہ اس دنیا کا ہر انسان کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی "رائل فیملی" سے متعلق رہا ہے۔ ہمارے محلے کا محلوائی اپنے چاہ کو سورج جیسی خاندان سے جوڑتا ہے، عین ممکن ہے تمہاری پروادی بھی کسی شہزاد کی

محبوب رہا ہو۔ میں ایسے کئی سفید پوش چودھریوں کو جانتا ہوں جو یا تو کسی نہ کسی رام کلی کے بطن سے نمودار ہوئے یا کسی نہ کسی حسین اور جان رام کلی کے بطن سے آئے۔ والے چودھریوں کو نمودار کر لے مکا با عیش اپنے۔

بے حجب نسب کی تکلیف دہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں رام کلی ٹھار لنگے کہ جس پٹر کے نیچے چند ماہ پہلے تم رہی بیسرا کرتی تھیں وہاں سے تم ایک دم گم ہو گئیں لیکن اب کے جب تم پھر کوئی دھو تو تنہا رہی گود میں ایک ننھا سا بچہ بھی تھا مستقبل کا ایک اور ننھا بیکاری۔ سچ سچ بتاؤ تم کسی راج محل میں چلی گئی تھیں بسو سائے کا کوئی شہزادہ، کوئی چودھری، کوئی سرواڑھیں شاہی نسل کی بد نصیب بیکاری سمجھ کر لے گیا تھا اور تمہارے بطن سے ایک راجکار پیدا کرنے کے بعد تمہیں پھر اس بچے کے نیچے پھینک گیا ہے۔ تاکہ تم اپنے پٹر کے ساتھ جڑ جاؤ۔ معلوم ہوتا ہے رام کلی! راکل فیملی ابھی تک نہیں بیوی۔ ان کی رگوں کا ہوتا رہے لے آج بھی کبھی کبھی محل اٹھتا ہے۔

بیرکیت تمہیں بیٹا مبارک ہو۔ بڑا ہو کر بھی بیکاری بن جائے گا۔ نسل کوئی بھی ہو رام کلی! اسے قائم رہنا چاہئے کم از کم اس کی وجہ سے خاندان کا نام تو زندہ رہے گا۔ گداگری کی رسم تو جاری رہے گی۔

گھر کے چوہے کے نام۔

برخوردار نو دشمن عزیزی چوہے!

جے بہاری بٹی کی (جو کسی بٹے کے ساتھ بھاگ گئی ہے) اور بچہ اس جے کے میں تم سے ایک خانگی قسم کی شکایت کرتا جا رہا ہوں کہ میری بیوی کی تازہ ترسی اطلاع کے مطابق اب گھر میں پانچ چوہے آچکے ہیں اور ان سبھوں کو تم لے آئے ہو۔

دیکھو عزیز! میں تم کو اپنے پاک سمیٹتا ہوں اور تم میرے گھر میں یوں رہو گے  
 ہو جیسے میری جائیداد پر تمہارا آبائی حق ہے۔ تم چینی کی پلیٹ توڑ دو، صابن کی ٹمبیہ  
 اٹھا کر باہر گلی میں پھینک دو، میز پریش کتر ڈالو، کتابیں کھا جاؤ۔ پھلوں سے ناشتہ  
 کرو، مرغی سے ڈنر یا آلوؤں سے لंच۔ میں نے کبھی اس کا برا نہیں مانا۔ بلکہ ہمیشہ  
 یہ سوچ کر مصافحہ کر دیا کہ اولاد نالائق ہو تو اسے گھر سے باہر نہیں نکال دیتے۔

مگر میری اس رد و ادا رسی اور حقیقت کا تم نے غلط مطلب نکال لیا اور تم میرا  
 گھر برباد کرنے کے لئے چار مزید مشنڈے لے آئے ہو۔ نتیجہ یہ کہ اب میرا خرچہ چار گنا  
 بڑھ گیا ہے۔ اے تا خلعت! میں تمہیں تو اس لئے سب رواشت کر رہا تھا کہ ایک آدھ چوہا  
 گھر میں ضرور رہنا چاہئے، اس سے ذرا گھر کی رونق اور درائسٹ قائم رہتی ہے۔ گھر  
 میں چوہا نہ ہو تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے زندگی میں کوئی چیز کم ہے اور پھر تمہاری وجہ  
 سے مجھے ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ چور ہمارے گھر آنے سے گزرتے تھے۔ کیونکہ رات  
 کی گہری تاریکی میں جب ہمارا گھر سو جاتا ہے تو فوراً بیدار ہو جاتے ہو اور گھر بھر  
 میں اچھیل کود، کھڑکھڑاد توڑ پھوڑ کرتے رہتے ہو۔ چور ان آوازوں کو سن کر اپنے  
 پاؤں لوٹ جاتے ہیں کہ جب گھر میں ایک چور پہلے سے موجود ہے تو ہماری گنجائش  
 کہاں ہے۔

لیکن اے بد بخت! تم نے اسے ہماری کمزوریوں پر محمول کیا۔ ہمیں اتنی عقل  
 نہیں آئی چرائع خانہ صرت اکھڑتا چوہا ہوتا ہے، پانچ پانچ چوہے نہیں ہوتے۔ پہلے  
 سارے گھر پر صرت تمہاری منابلی تھی۔ لیکن اب جائیداد کے چار وارث اور پیدل ہو گئے  
 میں تمہیں اتنا حق نہیں سمجھتا تھا کہ اپنی سلطنت میں غیر ملکیوں کو دخل دینے کی  
 اجازت دے دو گے۔ فرض کرو، کل کلاں یہ چاروں چوہے ٹھکر تمہیں ہیں اس گھر  
 سے بھاگادیں تو کہاں جائو گے نالائق۔

بہذا میں تمہیں متنبہ کرتا ہوں کہ اس خط کو تا دیکھو اور ان چاروں غیر ملکیوں کو نکال دو۔ ورنہ تمہیں بھی پوریا بستر اٹھا کر چل دینا ہوگا۔ میں بل کو مٹا کر پھرے آؤں گا۔ چرہ دان کا استعمال سنجیدگی سے شروع کر دوں گا۔ تمہیں صرف دو دن کی مہلت دی جاتی ہے۔ مستقبل جاؤ، ان چاروں چہروں کو دھو کے سے بھسلا کر پڑوسی دھنی رام کے گھر لے جاؤ۔ وہاں میرے گھر سے زیادہ بھل آتے ہیں۔ کیونکہ اس کا بہنوئی ایک فقیرانہ ہے۔

## نہال چند ڈاکے کے نام۔

نہال چند جی !

یہ تم نے کیا غضب کر دیا کہ کسی مس پر میرا کی چٹھی میرے گھر پہنچ گئی ہے۔ کھول کر پڑھا۔ (یہ میری بد اخلاقی تھی) تو وہ کہنت "لو میٹر" نکلا۔ لفظ برا یڈر سیس نکلا، فقیر چہر کا۔ تم سمجھے یہ فکر تو سو کا خط ہے۔ لفظ عطر کی خوشبو میں سا ہوا تھا۔ بھلے آدمی! نام سنیں پڑھا جانا تو کم از کم لفظ سونچا ہے۔ لیکن یہ خط فکر تو سو کا نہیں ہو سکتا۔ تمہاری معلومات میں اس لفظ کے لئے یہ عرض کر دوں کہ فکر تو سو کا نام الفت نہیں لگتا، اسے تو مامی خط ملے ہیں یا قرص خراہوں کے۔ یہ حرکت کہ تم نے صرف مس پر میرا اور فقیر چند کے عشق ہی کو رسوا نہیں کیا، محکمہ ڈاک و تار کو بھی رسوا کر دیا۔

اور نہال چند، اس المیے کا ایک اور پہلو بھی ہے کہ اگر مس پر میرا کا خط میرے پاس پہنچ گیا ہے۔ تو ہو سکتا ہے کہ میرا کوئی خط تم مس پر میرا کو دے آئے ہو۔ یا اس کا سہارا فقیر چند کو دے آئے ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ میری بیوی کا خط ہو۔ جو مجھے طلاق کی دھمکی دے کر میرے چل گئی تھی۔ میں اس کی گالیوں بھرے خط کا انتظار کر رہا ہوں

اب وہ گالیاں میرے بجائے فقیر چند کو مل گئی ہوں گی۔ مجھے فقیر چند اب میرے بارے میں کیا سوچنا ہوگا۔ اس کے دل میں میری جو عظمت ہوگی وہ خاک میں مل چکی ہوگی،

ہائے ظالم نہال چند! تم نے سب کچھ بنڈل کر دیا۔ مس پر بھیا فقیر چند، فکر تو نسوی سرب کے راز فاش کر دیئے۔ اے اندھے! اپنی عنایت کا منبر کیوں نہیں ٹھیک کرا لیتے؟

مس پر بھیا کا "لوٹیر" اٹھیں تاکہ میرے پاس ہے۔ میرے لئے وہ بیچارہ فقیر چند کے لئے کبیر ہے تاہم محبوب نہ ملنے پر نہ جانے اس بچارے پر کیا سمیت رہی ہوگی کل بے اختیار میرا ہی جاں نثار صدق کر بہ خط فقیر چند کر دے آؤں۔ لیکن عقل نے سمجھایا اس سے عاشق کی رسوائی ہوگی۔ خرا مخواہ نام ہو جائے گا۔ میں ذاتی طور پر عشق کی رسوائی کا قائل نہیں ہوں۔

اس لئے نہال چند! یہ تمہارا اخلاقی فرض ہے کہ مجھ سے وہ خط لے جاؤ اور فقیر چند کے حوالے کر آؤ اور ہاں، یہ بات نوٹ کر لو کہ اگر آئندہ مس پر بھیا کا کوئی خط تم نے میرے گھر دیا تو وہ اس کی اطلاع مس پر بھیا اور انسپکٹر جنرل ڈاکخانہ جانتے دو لوں کر دے دوں گا۔

پا چھی غنڈے کے نام۔

کل سیٹھ لوطی چند جی (بھاری کی فنوٹک اور پرچون والے) قبکایت کر رہے تھے کہ پا چھی مجھ سے خفا ہو گیا ہے۔ حالانکہ میں اس پر نرا انداز ایک لاکھ روپیہ صرف کر چکا ہوں۔ لیکن اب وہ مجھے چھوڑ کر سیٹھ گودڑ چند جی (کھدریشم رنگ والے) کا غنڈہ بن گیا ہے۔ یازن یازن میں انہوں نے اشارہ دیا۔ کتاب وہ کسی اور غنڈے



کی تلاش میں ہیں۔ جہان کی جان و مال کی حفاظت کر سکے اور پانچویں کو بھی سر باز نہ لگا  
کا مڑا حکم کیا سکے۔

پانچویں دادا! میں نہ کوڑ چند ہوں نہ گوڑ چند۔ اس لئے مجھے تم سے شکایت  
نہیں ہے۔ لیکن ایک نکتہ تم پر ضرور دروغ افحاش کرنا چاہتا ہوں کہ تم نے اچھا سٹیج بدل  
کر غلطی کی۔ اس سے تمہارے کردار پر ناحق ایک دھبہ آگیا۔ لوڑ چند ہو یا گوڑ چند  
تمہارے لئے دونوں برابر ہیں۔ دونوں ایک ہی غزل کے دو تانے ہیں۔ تمہیں تو  
خدمت کرنا ہے۔ کسی کی کر لو۔ دونوں کے لئے تم بازار کی عین ہو۔ ایک فروخت  
عین تہیں ان میں سے کوئی بھی خرید لے تمہیں اس سے کیا۔ ہ مگر پانچویں  
۔۔۔ غنڈے کے کردار کی بے بندی یہ ہے کہ وہ ایک بار جسے مالک کہہ دے اسی کا  
دخا دار بن کر رہے۔ تم ذرا سوچو، کتنے تک اپنا مالک نہیں بدلتے اور تم تو انسان ہو۔  
اور پھر یہ بھی تو نہیں کہ گوڑ چند کے پاس جا کر تم کوئی ایسی شے اور اچھوٹی خدمت  
انجام دو گے جو لوڑ چند کے ہاں انجام نہیں دیتے تھے۔ ؛ نہیں پانچویں دادا! تمہارا  
کام ہر جگہ ایک جیسا رہتا ہے یعنی جیب میں چھپا رکھنا، سٹیج کے مخالفوں کو ڈرانا  
دھمکانا، مالک کی تابعدار نازیبا حرکتوں پر اسنی قوت اور شوکت کا پردہ ڈالنا  
اور موقع ملے تو ایک آدھ مخالفت کا سرانار کر گنڈے نالے میں پھینک دینا تمہیں یاد ہو  
کہ ایک بار سٹیج لوڑ چند کے الیکشن جلسے میں تم نے سٹیج جوڑ چند کے تین چار حمایتیوں  
کے دانت توڑ ڈالے تھے۔ اب تم اسی سٹیج جوڑ چند کے غنڈے بن کر لوڑ چند کے  
حمایتیوں کے دانت توڑ دو گے۔ تمہارے بنیادی رول میں کیا فرق پڑا پانچویں! ذرا سوچو  
ذرا سوچو۔ اس میں لوڑ چند یا گوڑ چند کی رسوائی نہیں، تمہاری رسوائی ہے۔ آئے  
والے مورخ تمہارے بارے میں کیا لکھیں گے کہ پانچویں نے چند شکوں کی خاطر غنڈ  
نسل کا ایمان بیچ دیا۔

اس لئے میری ماز تو لوٹ آؤ۔ لوٹ آؤ سٹیج تو مڑ چنک کے پاس لوٹ آؤ مگر تو مڑ چنک کا دزن بھی مع تو نہ ایک کو قتل ہے اور گو تو چنک کا دزن بھی مع تو نہ ایک کو قتل ہی ہے۔

## پڑوسی منگل چند کے نام

پیارے منگل چند جی

تم سے ایک بات کہوں برا تو نہیں مانو گے !

تم ہر روز میرے ہاں تشریف لے آتے ہو اور میری میزبانی کے اخلاق سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہو۔ ناجائز فائدوں کی ایک مختصر سی فہرست ملاحظہ فرمادو۔  
(۱) میرے سگریٹ پھونک جاتے ہو۔ کبھی کبھی الیش ٹرے بھی میز پر الٹ دیتے ہو۔  
(۲) میرے رسالے اور کتابیں اٹھا کر لے جاتے ہو اور اول تو لوٹاتے نہیں اور اگر لوٹاتے بھی ہو تو زخمی حالت میں۔

(۳) تم چائے کا مطالعہ کرتے ہو اور وہ بھی دودھ اور چینی کی۔ اس مہنگائی کے زمانے میں۔

(۴) اپنی وقت گزاری کے لئے تم میرا قیمتی وقت برباد کر جاتے ہو۔  
(۵) تم دنیا کی بے ایمانیوں کا روتا روٹتے ہو۔ جو میرے لئے کوئی نیا انکشاف نہیں ہے۔

(۶) کبھی کبھی مجھ سے ادمعاری بھی مانگ لیتے ہو جو ہیشہ ادمعاری رہتا ہے۔  
یہ خط مکتبیں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ میں زبان کا بزدل اور تحریر کا شیرازنگ ہوں۔ شاید میرے اس خط کی تحریر سے تم مستقبلِ جاؤاد آئندہ ان حرکتوں سے باز آجیاؤ اور اگر تم واقعی برامانی گئے تو یسے ! بے شک آجیا کرو۔ میں تنہا ہی خاطر

انچا اخلاق شرک کر دوں گا۔ اطمینان رکھو۔

گھائل نامراد آبادی کے نام۔

قلبہ گھائل صاحب!

میں نے اکثر آپ کا کلام سنا ہے۔ پڑھا ہاں کل نہیں۔ کمیونک آپ کا کلام پڑھنے کے قابل نہیں صرف سننے کے قابل ہے۔ خدا نے آپ کو گلا نہیں جلتنگ عطا کیا ہے۔ اگر شاعر کی بجائے قوال بن جاتے تو زیادہ نچر رہتے۔ اس سے جہاں شاعری آپ کی دستبرد سے محفوظ رہتی، وہاں قوالوں کے قبیلے کی ساکھ اور تعداد بھی بڑھ جاتی۔ اسے آپ کے شعر کہنے بے معنی ہوتے ہیں۔ لیکن آپ کا گلا کتنا معنی خیز ہوتا ہے آپ کا گلا نہیں ہے ڈکٹری ہے۔

کل ایک اور شاعر نے آپ کی تذلیل کرنے کی خاطر مجھے بتایا کہ آپ دراصل خود شاعری نہیں کرتے بلکہ دوسروں سے لکھواتے ہیں۔ یہ تو انتہائی ناشائستگی ہے۔ گھائل صاحب! کبھی کبھی خود بھی شعر لکھا کیجئے۔ جب بے معنی شعر ہی لکھنا ہیں تو خود لکھنے میں کیا حرج ہے؟ کوشش کر کے دیکھیے تو سہی۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ آپ اس سے بھی زیادہ بے معنی شعر لکھ سکتے ہیں۔ تخلیق چاہے کسی بھی ہر اپنی ہوتی چاہئے۔

اور ہاں، وہ جو آپ کی ایک کلاسیکل اپکن ہے، اسے اب بدل نہیں ڈالئے۔ وہ بھی اب آپ کے اشعار کی طرح بے معنی ہو چکی۔ خواہ ہے کہ آپ کے پردادا خباب قاتل نامراد آبادی نے بھی یہی اپکن پہن کر شہنشاہ جارج پنجم کے دربار ڈیلی میں تصدیق پڑھنے کے لئے رُبوب مت قرائی تھی۔ لیکن قلبہ گھائل! اب تو شہنشاہی دور ختم ہو گیا ہے۔ ڈیموکریسی آگئی ہے۔ کوئی ڈیموکریٹک اپکن پہنا کیجئے شاعری

نہی اچکن تو اچھی ہوئی چاہیے۔

## شری باگڑ بلا سنگھ کے نام ڈیر باگڑ بلا جی

یہ معلوم کر کے کہ آپ ممبر اسمبلی بن گئے ہیں۔ میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ جہاں تک مجھے یاد دہشتا ہے آپ میٹرک میں فیل ہوئے تھے تو اشتعال میں اگر شہدستان ہی سے ہجرت کر گئے تھے اور شاید افریقہ میں بیڑا زنی کی دکان کرتے رہے اور پھر جب آپ کے پاس دس پندرہ لاکھ روپے جمع ہو گئے تو ہندوستان سے انتقام لینے کے لئے وطن لوٹ آئے۔ سچ مچ آپ نے ممبر اسمبلی بن کر اپنے میٹرک فیل ہونے کا خوب انتقام لیا۔ یہ ساری خطا یوٹیورسٹی کی تھی۔ کاش! وہ آپ کو میٹرک پاس ہونے کا مرنے کاٹ دے دیتی تو آج ہماری ڈیوٹی کر لسی کا چشتر نہ ہوتا جو آپ کے ہاتھوں ہوا۔

سنائے آپ نے اپنے الیکشن پر ایک لاکھ روپیہ خرچ کر ڈالا۔ بظاہر یہ کافی گھٹیا حرکت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جس کے پاس پندرہ لاکھ روپیہ ہر وہ اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا ہے۔ اہل ثروت کی اپنی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ لیکن ڈیر باگڑ بلا مجھے جو چیز میسوب محسوس ہوئی وہ یہ ہیں کہ آپ ممبر اسمبلی کیوں بن گئے۔ بلکہ یہ کہ آپ کے تین نقش کافی بے بنڈے ہیں۔ حسن ذہن نہ سہی حسن جسم ہی ہوتا تو ممبر اسمبلی بننے میں کوئی خاص ہرج نہیں تھا۔ مثال کے طور پر اپنی آنکھوں کو لیجئے۔ آپ کی کل ملا کر ڈیڑھ آنکھ ہے۔ کم از کم دو آنکھیں تو سالم ہوتی۔ چاہئیں۔ آپ کی ناک اگر پوری ہو تو آلو کا پکڑا معلوم ہوتی ہے۔ کاش! آپ پلاسٹک سرجری سے اس کی تراش خراش کرا لیتے تو آپ مخالفت امید دار کی ضمانت ضبط کر دے سکتے تھے اور جس پر پکڑنے چہرے پر آپ کی اداسی اور کچھ پانگہ دار بھی ہمارے رے ۱۰ سے

دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مناسب غذا نہ ملنے سے دھڑکی چمچ گئی ہے اور کچھ بے سہم جھپٹا دیاں اور دھڑکھڑ سے اگ آئی ہیں اور جناب یاگرٹا صاحب! میں آپ کی توند کے متعلق کوئی تشبیہ پیش نہ کروں گا کیونکہ وہ تشبیہات کی حد سے بہت آگے نکل گئی ہے معاف کیجئے میں یہ نہیں کہتا کہ آپ دیر سے تانی یاگرٹا کارپ کیوں نہ ہرے؟ سیاست کے لئے بدن کا حسن نہیں، اومانع کا حسن چاہئے لیکن آہ آپ کو تودہ بھی میسر نہیں، اچھا بتاؤ ذرا، ملی موریا کون تھا اور اس نے شادی کیوں نہیں کی تھی؟

میرے اتفاقاً کا براہمت ماننا۔ مجھے دراصل ابھی ابھی جلی پر سخت غصہ کیا تھا۔ کیونکہ وہ ہمارا دودھ پی گئی اور میں اپنا غصہ کسی نہ کسی پر نکالتا چاہتا تھا۔ جلی سے مجھے بے کا خیال آگیا اور پھر یاگرٹے کا ادویوں یہ غصیلا خط آپ کو لکھ ڈالا۔ ورنہ بیمار نہ! بلایاں تو دودھ پی ہی جاتی ہیں۔ ہم ان کا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟ آپ اس خط کو پڑھ کر روی کی ٹوکری میں پھینک دیجئے۔ اپنے ربکا رڈ میں محفوظ مدت کر لیجئے۔ ورنہ آنے والی نسلیں بڑھی دکھی ہوں گی کہ ہمارے آیاؤ اجداد کو کیسے خط لکھ جاتے تھے۔

بالو بدری لال کے نام  
اے لورڈ ویرن کلرک

میں ہر روز دیکھتا ہوں کہ تم اپنی چھپت پر کھڑے ہو کر ایک لڑکی کو اشارے کرتے رہتے ہو۔ سچ بٹاؤ، کیا تجھیں اس سے عشق ہو گیا ہے؟  
دیکھو بیٹا! عشق بری بلا ہے۔ اس سے گھر برباد ہو جاتا ہے اور تمہارے پاس تو ابھی گھر بھی نہیں ہے۔ کرائے کی ایک ذلیل سی کوٹری میں رہتے ہو۔ میں جانتا ہوں کہ

تم اپنی دوسروں کی تنخواہ میں گھر کے پانچ افراد کو پالتے ہو۔ تنہا ہی بائیکل کی ٹروپ پر بندرہ چکر لگے ہوئے ہیں۔ تمہارے جوتے سفینوں پالش سے محروم رہتے ہیں پرسوں تم نے اپنی چھوٹی ٹیبن کوؤنڈے سے پٹیا نفا کیونکہ وہ بغیر فیس کے سکول جانے سے انکار کر رہی تھی۔ تنہو کا بیڈ تم اکثر ٹروسی سے مانگتے دیکھ گئے ہو وغیرہ وغیرہ یعنی تم انسان نفوڑے ہو، صرف وغیرہ وغیرہ ہو۔

ایسے عالم اقلاس میں اے بدری لال! محفیں عشق کی سو جھی ہے۔ اے عشق کی بجائے بائیکل کی تھی ٹیوب ہی خرید لیتے یا کسی سٹیج گوجر چند کے گھر پیدا ہوتے۔ پندرہ پچھروں کے ساتھ محبوبہ کے لب درخسار کی باتیں کرتے ہو شرم نہیں آتی! اس لڑکی کا کیا ہے اس پر تو شباب ٹوٹ پڑا ہے۔ جس نے اسے مضطرب کر رکھا ہے اور وہ کسی نہ کسی کے گھر کو مبرا د کرے پرتلا ہوا ہے۔ اس نے میری مانتو تو ابھی عشق کو ملتی کر دو۔ میں تو کہتا ہوں بھر بھر کے لئے ملتی کر دو اور نفوڑے سے روپے جمع کر کے شادی کر لو۔ کلرک کا کام شادی کرتا ہے عشق کرتا نہیں۔ عشق کے کاغذ پر ٹاپ کرنے کی کوشش نہ کرو۔ ٹاپ کرنے کے لئے دفتر کی چٹھیاں ہی موزوں ہیں۔ اپنی زندگی کی ٹاپ مشین پر "لو ایٹر" ٹاپ مت کیا کرو کیونکہ تمہاری مشین کی کو الٹی کچرا چھٹی نہیں ہے۔ اپنی مشین کی طرف دیکھو، لڑکی کے قیسم کی طرف مت دیکھو۔

میں اس لڑکی کو بھی سمجھا دوں گا کہ وہ بھی تم پر رحم کرے اور اپنے شباب کا رخ کسی اور طرف موڑ دے۔

دلی چند جی کے نام  
دلی چند!

معاف کرتا، تم انتہائی برا آدمی ہو اور سچائے کس ستم گرے۔ تمہیں میرے

گھر کا ایڈریس دے دیا اور کہہ دیا کہ فکر تو منہ ہی کو بوجھ کرنا ایک بہت بڑا کاروبار ہے۔  
 تم سبھی میں دو تین بار بقول تمہارے میرے درشن "کرنے کے لئے ضرور آجاتے ہو  
 ایک خاندانی لفظ کی وجہ سے مجھ میں شرافت نفس بدو جو اتم موجود ہے لیکن اس کا  
 یہ مطلب نہیں کہ تم میری شرافت کے سینے پر پہاڑ بن کر بار بار رگرتے رہو۔ کاش باتیں  
 معلوم ہوتا کہ تم میرے پاس آکر جو گفتگو کرتے ہو اس کا کوئی مطلب اور مفہوم نہیں  
 ہوتا۔ تم آؤ گویا کے ریشے سے لے کر ہندوستان کی اخلاقی گراؤٹ سے ہوتے  
 ہوئے عرب کی کھجوروں تک کا ذکر کر ڈالتے ہو اور پھر ان میں سے ہر ایک چیز پر  
 اپنی بیش قیمت رائے بھی ضرور دیتے ہو اور پھر اے عالم! یہ تقاضا بھی کرتے ہو  
 کہ میں بھی تمہاری ہاں میں ہاں ملاؤں اور میں ملا دیتا ہوں، یہ صرف میری شرافت  
 عرف بزدلی ہے دھوکے میں مبتلا رہنا

ہائے! اب میں تمہیں کس منہ سے کہوں کہ مجھے آلو کے ریشے اور عرب کی کھجوروں  
 سے کوئی دلچسپی نہیں اگر آلو چیلنگ ہوتے جا رہے ہیں تو اس کے خلاف اخبار میں ایک  
 شکایتی خط لکھ دیا کرو۔ مگر خدا کے لئے مجھے روزانہ اخبار مت سمجھو اور باقی رہی عزت  
 کی کھجور تو عرض یہ ہے کہ تم میرے گھر آنے کی بجائے عراقی عرب کیوں نہیں چلے جاتے  
 وہاں مزے سے جا کر کھجوریں کھاؤ۔ میں تمہارے خلاف کسی مقالے میں رپورٹ نہیں  
 کروں گا کہ یہ شخص کھجوریں کھاتا ہے اسے گرفتار کر لو۔ ایک گزارش اور بھی ہے کہ تم  
 مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش ترک کرو۔ یہ کوشش بیکار جا رہی ہے۔ یعنی تم  
 میرے سگریٹ نوش فرماتے رہتے ہو، چائے کا مطالبہ کرتے ہو اور کل تو تم نے یہ  
 مطالبہ بھی کر دیا کہ پنہ منگواؤ، چائے کے ساتھ بڑا لطفت دیتا ہے۔ تم میری کتابیں  
 اور رسالے اٹھا کر لے جاتے ہو اور اول تو لوٹاتے نہیں اور اگر لوٹاتے بھی ہونہ یوں  
 جیسے پوسٹ مارکم کے لئے کوئی کسی کی لاش حوالے کر رہا ہو۔

۱۔ میرے نصیب جگہ میری بد نصیبی! مجھ پر ترس کھاؤ میرے غریب غاسے۔  
 پر قشریت ضرور لاد لیکن یوں آؤ جیسے ہوا کا جھونکا آتا ہے اور گزر جاتا ہے۔ میرے  
 پڑوس میں ایک اور صاحب مشرچاندی رام رہتے ہیں۔ تم مجھ سے گزر کر اس کے  
 گھر چلے جایا کرو۔ کیونکہ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحے گزرا رہا ہے۔ اپنا مفصلہ حیات  
 پورا کر چکا ہے۔ اگر تم اسے بر کرنا شروع کر دو تو اس پر کوئی اچھا یا برا اثر نہیں  
 پڑھے گا اور تنہا راکام بھی بن جائے گا۔  
 چاندی رام تنہا را منتظر ہے۔

## بلی کے نام

جھوٹے بڑے سب کی مری  
 یہ خط تمہیں مشری رنگبیر داس کے گھر کہتے پر بھیج رہا ہوں کیونکہ سنا ہے، نج  
 کرنے کے بعد جب تم کوئی تمکین اور اور ایک کلوسرنا سمگل کر کے ساتھ لائی تمکین تو  
 رنگبیر داس تمکین پہلا مہیلا کرا اپنے گھر لے گیا تھا۔  
 دیکھو بلی! تمکین یہ معلوم کر کے بہت مسرت ہوگی کہ سہارے گھر میں ایک بہت  
 موٹا تازہ چوہا رہا ہے۔ اس کی قرہی کا سبب سہاری بے بسی اور اس کی دھٹائی  
 ہے۔ اس کے پیٹ میں نہ جلنے کہتے انواع و اقسام کے کھانے پہنچ چکے ہیں۔ مہیں  
 کیا، گوشت، مکھن، دودھ ملانی، پلاؤ، بادام، گھی، ڈبل روٹیاں۔ کیا کیا  
 گزرائیں مری! جو چیز ہاتھ لگتی ہے۔ چٹ کر جاتا ہے۔ ہم تو اس حرام خور کو یوں  
 بال پوس رہے ہیں جیسے وہ سہارا داماد ہو! اور کل رات تو بقول میری اہلیہ  
 محترمہ کے وہ دھکی کی بوتل کے اور گرد بھی گھوم رہا تھا۔ یعنی وہ بادہ خواری پر بھی  
 اترا آیا ہے۔



حضرت مراد اہم اس جو چہ سے تالاں ہیں کیونکہ ایک نومہ جو ہے دانی کی گرفت میں نہیں آتا۔ بے حد ڈپلو میٹ ہو گیا ہے اور دوسرے کھا کھا کر سپینگرسی باز بھی ہو گیا ہے کسی کو خاطر سی میں نہیں آتا۔ انتہائی بد تمیز بن گیا ہے جیسے کہ حرام کا مال کھا کھا کر ہو جاتا ہے اور کل کو اس نے حماقت کی حد کر دی کہ دیوان غالب کو کمتر کے اس کے پرزے پرزے کر ڈالے۔ یعنی وہ اب ناشروں کی طرح مشغول ادب کا بھی دشمن بن گیا ہے۔ ذرا سوچو غالب سے اسے کیا دشمنی؟

اس نے موسیٰ! میں غالب کے نام پر تم سے درخواست کرتا ہوں کہ ہمارے گھروٹ آؤ ہمارے تنہارے تعلقات کافی پرانے ہیں۔ ان تعلقات کے واسطے تمہیں آجائے میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہمارے گھروٹوں نے تمہیں کافی ذہنی اور جسمانی اذیت پہنچائی تھی۔ کیونکہ تم ایک بے گھر بھی ہمارے گھر لے آئیں تھیں اور اس کے ساتھ رنگ رلیاں منایا کرتی تھیں، ہم نے اسے برا سمجھا کیونکہ تم عشق میں اندھ سی ہو کر جو چہ پکڑنا بھول گئی تھیں، ہم تمہیں پینے کے لئے جو دودھ دیتے تم چوری چھپے اس لفٹ کے پلاڈتین ہم نے تمہیں کئی بار سمجھایا کہ یہ مناسب نہیں ہے کہ

تمہیں چاہوں تنہارے چاہنے والے کو کہیں چاہوں

مراد دل پھر دو مجھ سے یہ سودا ہو نہیں سکتا

مگر تم بے حد جذباتی ہو گئیں اور اسی سوال پر ہم میں شکر رنجی ہو گئی اور ایک دن میرے بیٹے نے اس غنڈے بچے کو ڈنڈا مارا تو تم نے بطور احتجاج میرے بیٹے کو اپنے پنجے سے لہو لہان کر دیا اور پھر تم ناراض ہو کر مہاگ گئیں۔ (اور جی کوئی گئی) لیکن موسیٰ! اب میں سمجھتا ہوں کہ عشق ایک ازلی ستائی ہے اور تنہارے عشق میں سہاری مزاحمت غلط تھی۔ تم سبھی معاف کر دو اور لوٹ آؤ۔ وہ موٹا جوہر اور ہم تنہا رہنا انتظار کر رہے ہیں اور اگر اس بچے سے تنہا رہنا عشق اب بھی چل رہا ہو

اے بھی میرا لے آؤ۔ کم از کم اس حرا مخدوم جو ہے کے مقابلے پر تو وہ جتا بہتر ہے کہ وہ عاشق ہے۔ چور تو نہیں ہے۔

طلوے کے نام۔

مشرقی ہیں!

میرا خط پاکر محققین تعجب تو ضرور ہو گا کہ زبان نہ پہچان، لیکن فکر تو مندی نے مجھے خط کیوں لکھ ڈالا؟ لیکن پیارے! میں سماجی ہیرو کی عادی ہوں اور تم سماج میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہو۔ اس لئے تم سے صرف چند استفسارات کرنا چاہتا ہوں تاکہ معلوم کر سکوں کہ انسانوں کے ساتھ تمہارے تعلقات کی صحیح صحیح عینیت کیا ہے؟

مثلاً کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ تم جنگل کے ایک ادارہ بچھپے ہو۔ تم جہاں چاہو جا سکتے ہو جو کھانا چاہو کھا سکتے ہو۔ درختوں کے پھل تمہاری "ڈسپوزل" پر رہتے ہیں۔ تم کتر کتر کر ان کا استیانتاں کر سکتے ہو۔ مگر اس آزادی کے باوجود تم نے انسان کی غلامی کیوں قبول کر لی، کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارا صرف خارجی ڈھانچہ آزاد ہو۔ تمہاری ذات غلامانہ ہو۔ (اس دو غلطے میں پر محققین مشرم آئی چاہئے)

اور پھر تمہارے اندر یہ خاصیت پائی جاتی ہے کہ انسانوں کی آواز کی ہو ہو نقل کر لیتے ہو۔ یعنی تم نقل لو لیس ہو، اور بحیل نہیں ہو۔ تمہارے پاس اچھا کچھ نہیں ہے جو کچھ ہے مانگے کا ہے۔ تم صرف انسانی آواز کا بھونڈا چرب ہو۔ کیا یہ صورت حالات تمہیں پسند ہے؟ کیا نقل لو لیس کی زندگی گزار کر تم خنجر کر سکتے ہو؟ دوسروں کے سہارے زندہ رہنا اگرچہ جہالت تو نہیں ہے۔ لیکن غیرت مندی بھی نہیں ہے۔ اس لئے پیارے اور بحیل بننے کی کوشش کرو۔ کیا سچ بچ خدا نے محققین وہ ذہن عطا نہیں کیا جو خود

سوچنا ہے، خود عمل کرتا ہے۔

اور پھر سنا ہے تم بے وفا بھی ہو۔ جو مالک بنفیس پتہ کھلاتا ہے، تم اس سے آنکھیں پھیر لیتے ہو۔ در اسوجہ، یہ کوئی کسٹرفاء کا کام ہے، جذبات طریقہ تو یہی ہے کہ جس کا کھلاؤ اسی کا گھاؤ۔ یہ نہیں کہ کھلاؤ تو کس کا، لیکن گن کسی کے بھی نہ گھاؤ۔ بلکہ موقع ملے تو ہنجر سے نکل کر کس اور کے گھر بھاگ جاؤ۔ میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمہاری آنکھ کا پانی کیوں مر گیا؟ یا اس میں ازل ہی سے پانی نہیں تھا اور کیا کہیں ہتھار اندر حیا پیدا ہونے کے امکانات بھی ہیں یا بالکل "ہو پ لیس کس" ہو۔

میرے ان استفسارات کے جواب میں صرف ٹیں ٹیں نہ کرنا، بدلتا جواب دینا۔

## کرسی کے نام

اے نامراد حسینہ!

جب سے تم غریب خانے پر آئی ہے، میرا کردار دگرگوں ہو گیا ہے۔ بالکل ایسے جیسے کسی ان پڑھ کے ہاتھ میں پارکر کا سنہری قلم تھا دیا جائے اور وہ کہے "میں تو اب ناول نگار ہوں اور میرے ناول پڑھ کر لوگ ڈکنس کو بھیوں جائیں گے۔"

جب میں بنفیس خرید کر (نیلام گھر سے) گھر لایا تھا تو صرف اس لئے کہ تم سستے بھاؤ مل رہی تھیں، عزت اور عظمت اگر سستے بھاؤ مل جائے تو کون چھوڑتا ہے۔ لیکن گھر لایا۔ تو میرے بچے ایک دوسرے سے دھتکا مشتی کرنے لگے۔ پہرا ایک کہتا تھا کہ کرسی پر بیٹھوں گا، چنانچہ اس سول داریں دد بر خور داریں کی قیصیں بھٹ گئیں، بیوی چھوڑنے کے لئے آئی تو اس کے ماتھے پر ہاکی کا بلّا پڑا اور مہم پٹی کا بلّا ادا کرنے کے لئے خون بہہ نکلا۔

ثابت ہوا کہ عزت اور عظمت بھی ایک طرح کی نیلام میں خریدی ہوئی کرسی ہے

جو پھٹی ہوئی قمیصوں اور مافقے کے بھوکے بدمعاشوں میں خریدی جاتی ہے، رقم بے تاریخ  
عالم میں گردشوں اور بے قیصیوں میں بھاڑی ہیں، بیادوں اور تسمیوں کو جنم دیا ہے، اہل  
کھیتوں میں زہریلی گئیوں سے آبیاری کی ہے، کئی نسلیں، کئی تہذیبیں صرف ہمارے  
نام پر ہمارے گم ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اے حسین و جمیل ستم گر! ہماری کشتی ختم  
نہ ہوئی اور ہم بدستور عظمت اور عزت کی دلربا علامت بنی رہیں۔ — (شیم  
شیم! ہم پر نہیں کر سہی پرستوں پر)

ہمارے آنے سے پہلے میں ایک شریف انسان تھا۔ مگر آہ! میں شاید آج  
آباد اجداد کا آخری شریف انسان ثابت ہوا۔ تم نے میری شرافت کو بھی لہذا  
لفظ سمجھ کر نگلیا۔ کیونکہ جتنی پہلی بار میں تم پر بیٹھا، مجھے یوں محسوس ہوئے۔ لگا  
جیسے مجھے کسی کی جیب کا شن چاہئے، کسی کو گالیاں دینی چاہیں، کسی کو چاک  
مارنا چاہیں اور کچھ نہیں تو اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا چائے کا پیالہ بچے گرا کر توڑ دینا  
چاہئے اور طیش میں آکر لو کر کو آواز دینا چاہئے۔ ”اے حرامی! یہ کپ کیوں توڑ دیا  
باپ کی جاگیر سمجھا تھا کیا؟“

ہر روز جب ایسے ہیپ اور وحشیانہ خیالات ذہن میں آنے لگے تو انھیں  
یاد ہوگا، میں دبیری کی آنکھ بچا کر تمہیں باہر گلی میں پھینک آیا تھا۔ شام کو گھر لوٹا تو  
تم پھر گھر میں براجمان تھیں اور ہماری بیوی صاحبہ تم پر جلوس فرما تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی  
بولیں۔ ”دیکھا آپ کا پڑوسی وہ جو گندہ شرابا دھرماتا بنا پھرتا ہے آج ہماری  
کرسی ہی چرا کرے جا رہا تھا۔ میری نظر لگی تو میں نے اسے وہ علی کئی ستائیں کر اب  
کم از کم چھ مہینے ہم سے بات نہیں کرے گا۔“

اے بدتمیز! دیکھتے تم نے اپنے لٹھیں! میری بیوی بالکل گنہگار تھی تم پر بیٹھ  
کر چٹا بن گئی۔ جو گندہ شرابا دھرماتا تھا اس کی دعوت کسی کانٹے سے

تک جائے تو وہ کاشنے سے بھی مافی مانگ لیتا تھا۔ لیکن ہم تم دونوں پڑوسیوں کے درمیان آئیں تو چھ ماہ کے لئے ہماری بول چال سبکرا دی۔ وہ مجھ سے کچھ کتابیں مانگ کر لے گیا تھا اب وہ نہیں لوٹائے گا۔ پیاری تازنین! یہ تم نے کیا غضب کیا۔ دو اچھے پڑوسیوں میں ہی جھگڑا کرادی کیا یہی تمہارا خاندانی پیشہ ہے، کہ اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی خاطر پڑوسیوں کے درمیان کالی لکیر کھینچ دو، دوستوں کو بھڑا دو، عجائی بہنوں کے لباس تازنار کر دو، مذہبوں، قوموں اور ملکوں کے درمیان رخنے ڈال کر صدیوں تک اگھیں ملنے نہ دو۔ ایک بار پھر شیم شیم! تم پر بھی ہم پر بھی محترمہ! اب میں بے حد پریشان ہوں کہ تم سے کیسے نجات حاصل کروں میں تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتا ہوں۔ لیکن نہ بیوی مانتی ہے نہ بچے اور خدا جمہور نہ بلوائے تو تم میں ہی چاہتا ہوں۔ کیونکہ محلے والے رشتہ دار اور احباب سبھی تمہیں دیکھ کر کہتے ہیں۔ فکر تو سنی عزت دار آدمی ہے۔ کیونکہ اس کے پاس کرسی ہے۔

کبھی کبھی رات کی انتہا تاریکیوں کو چیر کر میں ایک دم خواب کے چرنک اٹھتا ہوں اور یوں لگتا ہے جیسے گھٹیں کوئی چور اٹھا کر لے گیا ہے۔ لیکن آہ! صبح تم پھر موجود ہوئی ہو تم چوروں سے تھوڑے ڈرتی ہو۔ تم تو خود چوروں کی محافظ ہو۔ ! -

## سونے کی ڈلی کے نام

۱۔ سنہرے دس کی شہزادی

نہ جائے تم کہاں ہو، میں نے کسی بار متعین پیغام بھیجے تار بھیجے، ٹیلیفون بھی کیا۔ لیکن خدا کی طرح تمہارا بھی نہیں پتہ نہ ملا۔ ہاں کیا اچھا زمانہ تھا،

جب لوگ سڑکوں پر سونے کی ڈلیاں اچھال دیتے تھے اور کوئی اکٹھا نہیں تھا اور اس زمانے میں تم کبھی کبھی مجھے نظر آجایا کرتی تھیں۔ لیکن اب تو ایسا زمانہ آگیا ہے کہ سونے کی ڈلی چھوڑ، خالی ماحس نیک سڑکوں پر پھینکو تو لوگ اکٹھا لیتے ہیں کہ اس سے بچے ہی کھیلیں گے۔

کبھی کبھی جب خبر آتی ہے کہ فلاں سمگلر کے ہاں سونے کی ڈلیاں پڑی گئیں تو دل بلیوں اچھلنے لگا ہے۔ اور ایک ہو کہ سی اٹھتی ہے کہ کاش میں بھی سمگلر ہوتا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ تمہیں زمین میں دبا کر رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے گھر کی ساری زمین کھود ڈالی۔ لیکن اس کے اندر سے تو ہے کے ذیل سے دو چار جکڑے ہی نکلے۔ پھر کسی نے اطلاع دی کہ محلے کے تاجر سٹیٹ وٹری لائل جی کی آہنی تجوری میں تم نے بدو باسن اختیار کر رکھی ہے۔ چنانچہ تمہیں چراغے کی نیت سے پہنچا تو تجوری کے ساتھ ایک بل ڈاگ بندھا ہوا تھا۔ لہذا لوٹ آیا۔ کتے سے کون جھکڑا کرے۔ یہ کوئی تہذیب کی زبان مقوڑے سمجھتے ہیں۔ لیکن اس بات پر بڑا تعجب ہوا کہ کتوں سے تم نے تعلقات کیوں گہرے بنا رکھے ہیں کیا انسان برے تھے؟

ایک بار پتہ چلا کہ تم بینک کے لاکر میں پڑی ہو۔ میں نے بینک منیجر سے التجا کی کہ لاکر کھول کر مجھے اس سنبھری شہزادی کے دسترن کرا دیجئے۔ پہلے تو اس نے کہا کہ تراشے کہ لاکر کی چابی اس کی مالکن شرمستی پھیا پھیا دیوی جی کے پاس ہے۔ پھر کہنے لگے کہ مالکن کے علاوہ کسی اجنبی کو سونے کی ڈلی دکھانا ہمارے بینک کے قواعد کے خلاف ہے۔ میں نے کہا۔ اتنی حسین شہزادی کو قواعد کی زنجیروں میں کیوں جکڑ رکھا ہے۔ قواعد تو انسانوں کے لئے ہوتے ہیں مگر یہ تو بے جان چیز ہے۔ میرے اس اصرار اور دلیل بازی کو بینک منیجر نے غلط رنگ میں لیا اور مجھے ڈاکوؤں کے گروہ کا

جواب۔ جواب میں ایک لطیف عرض ہے۔

ایک نوجوان نے دوسرے سے کہا: چلو دوست آج ایک فلم دیکھ آئیں: وہ بولا: نہیں دوست! میں نے ڈیڈی سے نہیں پوچھا۔ پہلے نوجوان نے کہا: یار! تم نے ڈیڈی کو بہت لعنت دے رکھی ہے۔ سوال: میں نے اپنا نام نکر تو نسوی رکھ لیا ہے۔ مجھے تو یہ نام بہت ذلیل لگا۔؟

جواب۔ ذلیل نہ ہوتا تو کیا آپ رکھ لیتے۔

سوال: شیر صرف ایک بچہ کیوں پیدا کرتا ہے؟

جواب۔ فصل پلاننگ۔

سوال: میں کسی ایسی بوی سے شادی کرنا چاہتا ہوں جو بولے نہیں، صرف میرے

حکم کی تعمیل کرے۔ کوئی آپ کی نگاہ میں ہے؟

جواب ہاں ہے۔ آپ ایک بائیسکل خرید لیجیے۔

سوال: محبوبہ اور لیڈر میں کونسی چیز مشترک ہے؟

جواب۔ وعدہ شکنی۔

سوال: اگر محبوبہ صرف اردو جانتی ہو اور عاشق صرف انگریزی تو آپ ان

کے عشق کو کیا کہیں گے؟

جواب۔ اینگلو انڈین۔

سوال: میری ایک رشتہ دار خاتون نے پرسوں دسویں رکنی کو جنم دیا ہے

آخر وہ چاہتی کیا ہے؟

جواب۔ گھر میں گر لڑا سکول کھولنا۔

سوال۔ ایک والد اور ایک سسر میں کیا فرق ہے؟

جواب۔ کچھ نہیں۔۔۔ دونوں ایک دوسرے کا غلط ترجمہ

ہیں۔

جواب۔ دفتر میں ادور ڈانم۔

سوال۔ میں راشن پتی بھون خریدنا چاہتا ہوں۔ بے سودا کرا دیجئے۔

جواب۔ کرا دوں گا۔ لیکن مالک مکان کا ایڈریس نہیں مل رہا۔

سوال۔ شریف آدمی کی پہچان کیلئے۔؟

جواب۔ جو چور سے کہے۔ بجایا! خالی ہاتھ لوٹنے پر تم سے ساقی مانگتا ہوں۔

سوال۔ دہن کے حسین خواب کب ٹوٹتے ہیں۔؟

جواب۔ جب وہ راشن ڈپلے کے کیو ۵۷۷ میں جا کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

سوال۔ میں نے اسے کہا: "خوش کرو گی" تو اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور

کہا۔۔۔۔؟

بتائیے اُس نے کیا کہا ہو گا۔

جواب۔ یہی کہ سوری! آپ لیٹ ہو گئے۔

سوال۔ زندگی میں پریشانی کا علاج کیا ہے۔

اسگنگ یا خدا کی عبادت؟

جواب۔ اسگنگ کے بعد خدا کی عبادت۔

سوال۔ وہ خواب میں ہاں کہہ دیتی ہے، بیداری میں نہ کر دیتی ہے۔ بتائیے وہ

کون ہے؟

جواب۔ آپ کی بیوی۔

سوال۔ بچہ اپنی ماں کو کیا کہتا ہے؟

جواب۔ دودھ کی ڈیری۔

سوال۔ میں نے شادی کی تو بیوی کو دیکھ کر یوں لگا، "بیسے لاری کا کٹ نکلا ہے۔"

اس ٹکٹ پر بٹے کتنا انعام ملے گا؟

جواب۔ تین بچے۔

سوال۔ دور حاضر کی اولاد اپنے والدین کے بارے میں کیا سوچتی ہے؟



وال: اگر چور لیڈر بن جائے تو سب سے پہلا کام کیا کرے گا؟  
اب: چوروں کی ٹریڈ یونین بنائے گا۔

وال: بھکاری کو دان پیسے دیتے وقت دانا کا ہاتھ کا پتہ کیوں ہے؟  
اب: کسی دھندے میں پونجی لگاتے وقت ریسک (Risk) کا احساس تو ہوتا ہی ہے۔

وال: اگر کوئی بد دیانت شخص دیانت دار بن جائے تو اسے کیا کہیں گے؟  
اب: خود کشی۔

وال: جب خدا ہر وقت میرے دل میں رہتا ہے، تو بتائیے میرا اور خدا کا کیا  
رشتہ ہے؟

وابد آپ - مالک مکان

خدا - کرایہ دار

وال: کیا جنت میں بھینسیں ہوتی ہیں؟

واب: کیا آپ کا پروگرام وہاں بھی ملاوٹ کرنے کا ہے۔

وال: ایک شاعر، ایک عاشق - دونوں میں کوئی فرق ہے؟

واب: ہاں ہے۔

شاعر - شاعری کی نمبری تیار کرتا ہے۔

عاشق - اس نمبری کو بجاتا ہے۔

وال: کل مجھ کو بے گھر لگا کہہ دیا، مگر میں نے برا نہیں مانا - کیوں؟

جواب: سچی بات پر کوئی برا نہیں مانتا۔

وال: ایک ہاتھ سے تالی کیسے بجاتی ہے۔

جواب: کسی سینہ سے تھپڑ کھا کر دیگیے۔

وال: شادی کے بعد بچے پیدا کرنے چاہئیں تو بچے پیدا کرنے کے بعد کیا کرنا

چاہیے؟

جواب۔ جب حادثی چیزیں بھی چور بازار میں ملا کر بی گئی۔  
سوال: ہمارے ملک میں آبادی بھین کر ڈر ہے۔ ان میں بوتون کتنے ہیں اور جملہ کتنے؟

جواب۔ بے قوت۔ بھین کر ڈر

عقل مند۔ بھین کر ڈر

سوال: پہلے زمانے میں لوگ دھرم کی خاطر بھانسی پر پڑھ جاتے تھے۔ آج کل کیوں نہیں پڑھتے؟

جواب۔ آج کل وہ دھرم کو ہی بھانسی پر پڑھا دیتے ہیں۔

سوال: من میں کنول کھلتے ہیں، تن پر کیوں نہیں کھلتے؟

جواب۔ کنول خلیطہ جگہ پر کھلتا ہے۔ مگر تن کو لوگ صاف تھرا رکھتے ہیں۔

سوال: میں نے ایک فلم دیکھ کر جیب کاٹنے کا ڈر سیکھ لیا۔ لیکن سینما ہال سے نکلتے

وقت میری اپنی جیب کٹ گئی۔ کیوں؟

جواب۔ اُس جیب کترے نے وہ فلم دوسریہ دیکھی ہوگی۔

سوال: اگر بھینس کو عقل آجائے تو وہ کیا کرے گی؟

جواب۔ اپنے دودھ میں آپ ہی پانی ملا یا کرے گی۔

سوال: خدا کی پرستش کرنی چاہیے یا محبوب کی؟

جواب۔ جس میں خرچ کم ہو۔

سوال: ترازو میں ایک طرف جینہ بیٹھی ہو، دوسری طرف کرنسی نوٹ۔ تو آپ

کے ترجیح دیں گے؟

جواب جینہ سے بیاہ کر دوں گا۔ کرنسی نوٹوں کو جینہ تکھ دیں گا۔

سوال۔ جب کوئی نئی کوٹھی بن جاتی ہے۔ تو اس پرکانی ہانڈی کیوں لٹکا دیتے

ہیں؟

جواب۔ انکم ٹیکس دالوں کو ڈرانے کے لیے۔

جواب: وہ ایک وقت باپ بھی لگے گا اور خاوند بھی۔

سوال: عورت کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو کب آتے ہیں؟

جواب: خوشی کے آنسو۔ عورت جب ڈول میں بیٹھتی ہے۔

سوال: نورائیدہ بچہ اپنی مٹھی کب کھولتا ہے؟

جواب: جب وہ خیرات کے لیے ہاتھ بھیلتا ہے۔

سوال: بچہ پیدا ہوتے ہی کیوں روتا ہے؟

جواب: ماں باپ کے مستقبل پر۔

سوال: کھرک کو اپنی بیوی کے چال چلن پر مشبہ کب ہوتا ہے؟

جواب: جب وہ خاوند کی جیسٹ ٹوٹنا بند کر دے۔

سوال: بچے کوئی بار ٹھوکر لگی، مگر پھر بھی عقل کیوں نہیں آتی؟

جواب: ٹھوکر لگنے والے آپ سے زیادہ عقل مند ہوں گے۔

سوال: عورت اگر جھٹکارتن ہے تو پھر مرد کیا ہے؟

جواب: برتن کی دھڑ۔

سوال: جو بچہ اپنی ساس کو ماں کا مرتبہ دے دے وہ کہاں ہے؟

جواب: وہ ابھی ماں کے پیٹ میں ہے۔

سوال: سوشلزم کیوں لیٹ ہو گیا؟

جواب: بچاؤ کے پاس بس کا کرایہ نہیں ہے۔

سوال: چارے تلے کا ایک بلیک مارکٹیا ہر روز منہ رکھوں جاتا ہے؟

جواب: یہ دیکھئے کہ پڑھاؤ کی بلیک کس طرح کی جاسکتی ہے؟

سوال: اگر کوئی کا زارا حینہ اچانک آپ کے کمرے میں داخل ہو جائے تو آپ کے

منہ سے سب سے پہلا کونسا فقرہ نکلے گا؟

سوال: یہ جو بازار میں کب کلا ٹمکس پیدا ہوگا؟

جواب :- آپ کے سن میں کوئی چور ہے۔

سوال :- دنیا ہے تیاگ کس دلت اختیار کرنا چاہیے؟

جواب :- جب دنیا آپ کو تیاگ دے۔

سوال :- سائیں بابا! خودکشی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب :- بس یہی کہنا کام خودکشی نہیں کرنی چاہیے۔ ورنہ پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے۔

سوال :- میرے ایک دوست کی بیٹی ہے جو ایک بند کتاب کی طرح ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے آگے کسی نے کھول کر نہیں دیکھا۔

جواب :- کئی کتابیں ایسی ہوتی ہیں۔ جن کا کوہ پیچ ہی دیکھ کر لوگ رکھ دیتے ہیں۔

سوال :- میرا خاوند بکھرک ہے۔ دفتر سے گھر آتے ہی سیدھا چھت پر چلا جاتا ہے اور ایک

رڑکی کو گھورتا رہتا ہے۔ اس سے آخر کیا حاصل ہوتا ہے؟

جواب :- اور ٹائٹم۔

سوال :- خدا نے آرام کو پیدا کر کے غلطی کی تو پھر حق کو کیوں پیدا کر دالا؟

جواب :- غلطی کی تصحیح کے لیے۔

سوال :- عشق اگر پاپور ملے تو شادی کیا ہے؟

جواب :- بچے پیدا کرنے کا دینا۔

سوال :- حسین و جمیل لڑکی اگر دلاتی شراب ہے تو طوائف کیا ہے؟

جواب :- ویسی ٹھہرا۔

سوال :- وہ کس قسم کے میاں بھری ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کو طلاق نہیں دیتے؟

جواب :- جو پہلے ہی طلاق پاؤں نہ ہوں۔

سوال :- میرا خاوند اپنے آپ کو گدھا کیوں کہتا ہے۔ حالانکہ وہ بہت عقل مند ہے۔

جواب :- گستاخی سماعت عقل مند ہوتا تو کیا آپ سے شادی کرتا۔

سوال :- فکر صاحب! اگر بچا سالی سال کا کوئی مرد بیس سال کی لڑکی سے شادی کرے

تو کیا گئے سکا؟

جواب :- اس کے پرانے نوٹیٹر۔

سوال :- عورت کی گفتگو کا لذیذ ترین موضوع کیا ہوتا ہے ؟

جواب :- کپڑوں کے ڈیزائن اور پڑوسنوں کی حیثیت ۔

سوال :- خدا نے خوبصورت عورتوں کو حسن عطا کر دیا، بھونٹھی عورتوں کو کیا دیا ؟

جواب :- عقل ۔

سوال :- جس عورت کے پاؤں کی اڑیاں میلی ہوں ؟

جواب :- وہ ضرور گرجمن ہونگی ۔

سوال :- عقل مند آدمی اور ایک بھینس میں کیا فرق ہوتا ہے ؟

جواب :- عقل مند آدمی بھوکوں مرنا ہے مگر بھینس کو ہر روز چارہ مل جاتا ہے ۔

سوال :- میرا ایک روم کا نہایت ذمہ دار ہے مگر دوسرا بڑا نالائق ہے ۔ ایک باپ

کے دو بیٹے مگر قسمت جو اُدا کیوں ہے ؟

جواب :- ان میں سے ایک اپنی مال پر گیا ہو گا ۔

سوال :- خدائی فوجدار سے کیا مراد ہے ؟

جواب :- جو خدا کی فرج میں ملازم ہو مگر خواہ فلولق سے وصول کرتا ہو ۔

سوال :- کیا ایک حسین عورت ایک بدصورت مرد سے بھی محبت کر سکتی ہے ؟

جواب :- آپ کیسے دیکھ لیجئے ۔

سوال :- اچھے پڑوسی کی کیا پہچان ہے ؟

جواب :- جو آپ سے ڈر کر خاموش رہتا ہو ۔

سوال :- میں نے بہت سے ایسے آدمی دیکھے ہیں جو سننے زیادہ ہیں مگر بولنے کم ہیں ۔

ایسے آدمیوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟

جواب :- ایسے آدمی یا تو بہت زیادہ جاہل ہوتے ہیں یا بہت زیادہ عقل مند و دلدادہ بننا چاہتے ۔

سوال :- بگھے تار کی میں بڑا سکون لیتا ہے ۔ لیکن روشنی سے بے حد گھبرانا ہوں ۔

اس کی کیا وجہ ہے ؟

اس کے ٹیڈی سے کیا بات کروں ؟

جواب :- ”جہیز کی؟“

سوال :- ”جو مسجد میں بیٹھ کر شراب پیتے ہیں وہ کون ہوتے ہیں؟“

جواب :- ”اکاثر انسپکٹر!“

سوال :- ”میرا دادا اجڑا رہا تھا۔ باپ جیب کترا تھا۔ میں سنگٹنگ کا کام کرتا ہوں۔“

میراثیا کیا بنے گا؟

جواب :- ”لیڈر!“

سوال :- ”عورت ناقابل فہم کیوں ہے؟“

جواب :- ”کیوں کہ وہ بھی خالق ہے۔ خدا کی طرح۔“

سوال :- ”ایڈیل شادی شدہ جوڑہ کیسا ہوتا ہے؟“

جواب :- ”ہوتا ہی نہیں۔“

سوال :- ”دانہ گندم کھانے میں قصور کس کا تھا؟ آدم کا یا حوا کا؟“

جواب :- ”میرے خیال میں یہ دانہ گندم کا قصور تھا۔“

سوال :- ”کئی عورتیں عمر بھر شادی کیوں نہیں کرتیں؟“

جواب :- ”وہ خود رخصت ہی کئے اور رہ جاتی ہیں۔“

سوال :- ”عورت کو پاؤں کی جوتی کیوں کہا جاتا ہے؟“

جواب :- ”کیوں کہ خداوند اس جوتی سے اپنے سر کی زینت کرتا ہے۔“

سوال :- ”عورت کس وقت سب سے زیادہ حسین معلوم ہوتی ہے؟“

جواب :- ”جب وہ بچے کی ماں بن جاتی ہے۔“

سوال :- ”میاں بیوی کی ازدواجی زندگی کیوں کر خوش گوار ہو سکتی ہے؟“

جواب :- ”اندھے بن کر۔ تاکہ دونوں ایک دوسرے کے عیبوں کو نہ دیکھ سکیں۔“

سوال :- ”میں اپنی محبوبہ کو اس کی شادی پر ایک تحفہ دینا چاہتا ہوں۔ تمہارے کون سا

تحفہ دوں؟

سوال :- ہندوستانی سوشلزم سے سب سے بڑا خطرہ کس کو ہے ؟

جواب :- سوشلزم کو !

سوال :- چاند میں جو بڑھیا بیٹھی چرخہ کاٹا کرتی تھی وہ کہاں گئی ؟

جواب :- ٹیکسٹائل مل میں نوکر ہو گئی !

سوال :- عاشق کو کس وقت بھیانک پسینے آنے لگتے ہیں ؟

جواب :- جب محبوبہ تنگ اگر بیاد کا مطالعہ کر بیٹھے ۔

سوال :- میں کسی ایسے وکیلر جینہ کی رفاقت میں گھومنا چاہتا ہوں کوئی بھرت نہجہ تلیجے ؟

جواب :- اُس کی کار کے ڈرائیور بن جائیے ۔

سوال :- شادی اگر عشق کی قبر ہے تو بچے .... ؟

جواب :- قبر کے مجاور !

سوال :- اگر انسان تنہا ہو تو کیا لگتا ہے ؟

جواب :- خدا ۔ کیونکہ وہ بھی لا شریک ہے ؟

سوال :- میرے والد صاحب میری ماں کے ساتھ جب بھی جھگڑا کرتے ہیں تو اسے

طعنہ دیتے ہیں کہ تم تو بچپن میں بھینس بھینس تھیں ۔

میرے والد صاحب کو کس طرح معلوم ہوا ؟

جواب :- وہ گزشتہ جنم میں ڈیری کا مالک ہو گا اور بھینس کے دودھ میں پانی

ملاتا ہو گا ۔

سوال :- آپ نے ایک بار کھانا تنہا حسین لڑکیاں بے وقوف ہوتی ہیں لیکن میں

حسین بھی ہوں اور بے وقوف بھی نہیں ۔

جواب :- ہر حسین لڑکی بے وقوف تو ہوتی ہے لیکن ہر بے وقوف لڑکی حسین نہیں ہوتی ؟

سوال :- سالی آدمی گھیر والی ہوتی ہے تو سالانہ .... ؟

جواب :- پورا چٹرا سی !

سوال :- میری محبوبہ اکثر مجھ سے کہتی ہے میرے ڈیڈی سے بات کر دو آخر

جواب :- اس عشق کا آغاز ہی نہیں ہوتا جس کا انجام ہر جائے :-  
 سوال :- میرے عشق کا سورج غروب ہو گیا ہے یعنی میری محبوبہ کی شادی ہو گئی  
 ہے لیکن وہ ابھی تک میرے خوابوں میں کیوں آ جاتی ہے :-  
 جواب :- سورج ڈوبنے کے بعد کچھ دیر تک اس کی کرنیں کا پٹی رہتی ہیں :-  
 سوال :- تو میرے بعد کونسی منزل ہوتی ہے ؟  
 جواب :- آؤ گویں کی :-

سوال :- جب لیڈر سٹیج پر تقریر کر رہا ہوتا ہے تو کیا سوچتا ہے ؟  
 جواب :- لیڈر سوچے بغیر تقریر کرتا ہے :-  
 سوال :- شنیدیں آیا ہے کہ جب تلم ایخٹرسوں کے ہاں بچہ تولد ہوتا ہے تو وہ  
 اُسے اپنا دوہ نہیں بلاتیں ! اس کی وجہ کیا ہوگی ؟  
 جواب :- وہ دلیل دیتی ہیں کہ ہم مائیں ہیں ملک تو فتح نہیں ہیں !  
 سوال :- بے وقوف و دست کون ہوتا ہے اور دانا و دشمن کون ؟  
 جواب :- پتی و دانا استری اور جتنا کا لیڈر !

سوال :- آج کل کے لوگ گلیسرین کے آنسو کیوں بہاتے ہیں۔ اگلی آنسو کیوں  
 نہیں بہاتے ۔ ؟

جواب :- گلیسرین کے آنسو سستے پڑتے ہیں ۔  
 سوال :- "خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے ۔۔ کیسے ؟"  
 جواب :- "جیسے جیب کترے کو دیکھ کر پولیس والا رنگ پکڑتا ہے ۔"  
 سوال :- وہ کون سے مغزین ہیں جو ہندوستان اور پاکستان کو ایک نگاہ سے دیکھتے ہیں ؟  
 جواب :- "سنگٹر" !

سوال :- راجہ اندر کے دربار میں جو افسر اسیں رقص کرتی تھیں ، وہ آج کل میرے  
 ڈانسر بن گئی ہیں تو راجہ اند کہاں گیا ؟  
 اب :- بلیک میں کبیرے ڈانسر کی لمبٹیں بچھا ہے :-



سوال :- آپ صحن کا ٹھیکہ لے کر میں نے کسی مکانوں کے لوازم کھٹکھٹائے

لیکن کسی نے مجھے بھیک نہیں دی؟

جواب :- آپ نے خانی مکانوں کے در کھٹ کھٹائے ہوں گے؟

سوال :- گھائے کی خدمت کرنا بہتر ہے یا انسان کی؟

جواب :- گھائے کی۔ کیونکہ انسان کی خدمت کریں گے تو وہ آپ کی گھائے  
بھی چرائے گا۔

سوال :- کیا یہ سچ ہے کہ محبوب کی آواز کانوں میں رس گھول دیتی ہے؟

جواب :- یہ کانوں کی کواٹھی کے اوپر منحصر ہے؟

سوال :- انسان دوسروں کی نظریں گزنا کیوں پسند نہیں کرتا؟

جواب :- کیونکہ اپنی ہی نظریں گزنا کافی ہوتا ہے۔

سوال :- بہادر شاہ ظفر نے یہ شعر کیوں لکھا تھا

بہ کتا بد نصیب ظفر دفن کے لیے

دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں

جواب :- آن دنوں دہلی میں زمین بہت ہلکی ہو گئی اور بہادر شاہ ظفر کی اتھار

پوزیشن بڑی نازک تھی۔

سوال :- کہتے ہیں پائلس بہت غلیظ گیم ہوتی ہے تو پھر اچھے آدمی اس میں

کیوں پھنستے ہیں؟

جواب :- آپ سے کس نے کہا کہ وہ اچھے آدمی ہوتے ہیں؟

سوال :- پھول کب پتھر بن جاتے ہیں؟

جواب :- سب کوئی خوبصورت لڑکی بیڑی پولیس میں بھرتی ہو جاتی ہے۔

سوال :- میں کسی بھینس کے آگے میں بجانا چاہتا ہوں کسی مقول بھینس کچھ بتائیے؟

جواب :- فکر تو نسو، سرنٹ گل مہر پارک دہلی۔

سوال :- عشق کا آغاز کیوں ہوتا ہے اور انجام کیا؟

سوال :- سوشلزم مکے نمبر کی کتنی اہمیت ہے ؟

جواب :- امیروں کی ڈائمنگ ٹیل کے ایک بے گھر کی !

سوال :- وہ لوگ کہاں گئے ہو کہا کرتے تھے ملک میں انقلاب لائیں گے !

جواب :- وہ مندرجہ ذیل مقامات پر مل جاتیں گے :-

(۱) پبلک پارک میں گلی سٹری سٹ پھلیاں کھاتے ہوئے ۔

(۲) راج محلوں میں پستے کھا کر بوٹنگ پھلیوں پر آنسو بہاتے ہوئے ۔

سوال :- عاشقوں اور بڑھڑھوں کو نیند کیوں نہیں آتی ؟

جواب :- عاشقوں کو محبوب اور بڑھڑھوں کو موت کے انتظار میں ۔ دونوں نہ جانے کب ٹپک پڑیں ۔

سوال :- وہ کونسی آنکھ ہے جو روتی نہیں مگر آنسو بہاتی ہے ؟

جواب :- لیڈر کی آنکھ !

سوال :- اس دنیا سے ناطہ کب توڑنا چاہیے ؟

جواب :- جب دنیا آپ سے ناطہ توڑ لے !

میری آغوش میں گر گئیں، میرے کندھے پر سر رکھ کر روئیں، میرے ہونٹوں تک  
 آپنیں (کبھی کبھی میری جیب تک بھی جا پہنچیں)، میں نے تمہاری ہلکوں پر اپنے  
 کپکپاتے ہونے آنسو دیکھے اور انھیں اپنے ریشی رومال سے پونچھ ڈالا۔ تم نے اپنی  
 ریشی مخروم، نازک انگلیوں سے میرا سگڑٹ سلگایا اور پھر دھوئیں کے پیلے پیلے  
 مرفوٹوں کے ہلکے ہلکے تیرتے ہوئے بادلوں میں ہم دونوں گم ہو گئے۔ ایک دوسرے  
 سے ادھل جھل ہو گئے۔ اور پھر یہ گم شدگی کا عالم اکثر دہشتہ صدیوں تک پھیل گیا۔  
 اور میں نے اکثر افسوس ظاہر کیا کہ محبت کے لیے صدیاں بھی کتنی کم ہوتی ہیں  
 کاش محبت کے لیے وقت کی کوئی قید نہ ہوتی، گھڑیاں اور ٹائم پیس نہ ہوتے،  
 کیلنڈر اور جنتریاں نہ ہوتیں۔

لیکن اے میری صدیوں پرانی محبوبہ! کل رات ایک افسوس اک گھٹنا  
 ہو گئی کہ جب مجھے سگڑٹ نوشی کی زیادتی سے خند نہیں آ رہی تھی اور میرا سر  
 گھوم رہا تھا تو میں نے تمہیں سردبانے کے لیے بلایا۔ اور جب تم میری آرزوں  
 کے سارے پرتھوکتی، اٹھلاتی ہوئی آئیں تو تمہارے ساتھ پانچ چھ جینائیں اور کبھی  
 نہیں۔ اور یہ دیکھ کر میں بوکھلا گیا کہ تمہاری برقی ایسی آنکھیں تمہارے چہرے پر نہیں  
 تھیں بلکہ ایک اور جینے کے چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔ تمہارے ہونٹوں کے گلاب  
 دوسری جینے کے پاس تھے۔ تمہاری مخروم انگلیاں تیسری کے پاس اور زلفیں  
 چوتھی کے سر پر سوار تھیں۔ غرض تمہارا عضو عضو ٹپکنا تھا، بے ٹھکانہ ہو گیا  
 تھا۔ یوں گستاخانہ جیسے دنیا بھر کی جیناؤں نے مل جل کر تمہارے حسن کو لوٹ لیا ہے  
 اور ڈارنگ! یہ بات مجھے بہت بُری لگی کہ تم اپنا حسن (جو میں نے تمہیں  
 عطا کیا تھا) یوں اٹم غلم رنگیوں میں نہاتی پھرو۔ اور پھر تمہارے سامنے سب  
 نے میرا مضحکہ اڑایا۔ غضب یہ کہ اس تذلیل میں تم بھی شامل تھیں۔  
 بیاری! اگر تم واقعی مجھے چاہتی ہو تو آئندہ ایسی حرکتوں سے گریز کرو۔ یاد

تمہارا عاشق  
 زلم (کتنے سے نام نہاد)

رکھو

کا زخم ہو چکا اور اب صرف تمہارا فاتحہ باقی ہے۔ اس لیے آؤ کہ تمہارا وعدہ پورا کرو اور زیادہ نہ تر پاؤ، خلع لگ جاؤ۔ تمہارے بیس ساٹھ سال گزار گئے مگر اب یہ باقی کے دو چار سال گزانا انتہائی مشکل ہو رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم بھی اب بور ہو چکی ہو اور اپنا بوڑھا دل کسی نہ کسی کو دے دینا چاہتا ہو۔ مگر

میں ہر ڈاک سے تمہارے نوٹز کا انتظار کروں گا بلکہ میں تو کہتا ہوں پیاری بڑھیا! نوٹز کا تحلف بھی کیوں کرتی ہو؟

مہرباں ہو کہ بلا مجھے چارویں دت میں گیا دت نہیں ہوں کہ پھر ابھی نہ سکوں تمہارا قدیم ترین عاشق بد رہی ناتھ، ریٹائرڈ ایڈیٹ

ان بچھی مجبورہ کے نام —

شیللا، نیلا، کسلا، زبرہ، طاہرہ (جو بھی تمہارا نام ہو) یہ عجیب ٹریجڈی ہے کہ میں تمہیں نہیں جانتا (اور ظالم! تم مجھے نہیں جانتیں) نہ ہمارا نام نہ ہمارے والد صاحب کا نام نہ ہمارا پوسٹل ایڈریس نہ گلی اور مکان کا مینوسکریپٹ نمبر۔ اور اس ٹریجڈی کے بعد کامیڈی یہ ہے کہ میں نے تمہیں کبھی دیکھا بھی نہیں۔

لیکن جان من! اس کے باوجود میں تم سے محبت کرتا ہوں، کیوں کہ میری تصویر یہ ہے کہ محبت کسی رسمی تعارف کی محتاج نہیں، پوسٹل ایڈریس اور مینوسکریپٹ نمبر سے بہتر چیز ہے۔ اور اس بلندی ہی کا نتیجہ ہے کہ میں نے گھنٹوں تمہارے ساتھ بیٹھ کر محبت بھری باتیں کی ہیں، مگر کبھی ہم دونوں نے ایک دوسرے کا نام اور پتہ نہیں پوچھا — میں نے تمہیں جب بلایا جس کا نام سے بلایا تم انہیں۔

برہم پیدا کر دیا تھا بھارت کا ستر سا ہے آیا۔ جہا بھارت کی جنب ہی تو صرف پانچ  
 گاؤں کے سوال پر ٹرٹی گئی تھی اور ہمارے محلے کی جنگ بھی پانچ پے کی اینٹ  
 پر ٹرٹی گئی۔ میں پوچھتا ہوں اسی اینٹ ہی اینٹ! تم نے یہ کیا کر دیا۔ کیا تم اس  
 لیے پیدا کی گئی تھیں کہ انسانوں کو بھڑا کر لہو بہان کر دو۔ تم تو سایہ دار  
 مکان بنانے کے لیے پیدا کی گئی تھیں۔ لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ تمہارے  
 اندر مکان سمار کرنے کی خاصیت بھی موجود ہے۔

لہذا کل تمہاری وجہ سے ہمارے محلے بھر میں جوڑ لگا ہوا اس کے لیے  
 تمہیں شرم سے ڈوب کرنا چاہیے — جے ہند!!  
 کنوارا بوڑھا بنام کنواری بوڑھی  
 سیری شام حیات!

اس سے پہلے کہ قبر کے دروازے ہم دونوں پر کھل جائیں، آؤ ہم ایک دوسرے  
 پر کھل جائیں۔ تمہیں یاد ہو گا کہ آج سے چالیس برس پہلے میں نے تمہیں ایک ٹریٹر  
 لکھا تھا جسے پڑھ کر تم نے کہا تھا "سٹر بردری ناتھ! یہ بچپن ہے۔ انسان صرف  
 عشق اور شادی کے لیے پیدا نہیں ہوا، بلکہ ایک بہت بڑا کاز لے کر آیا ہے چنانچہ  
 میلاد ٹوٹ گیا اور میں نے طے کر لیا کہ اگر عشق کروں گا تو صرف تم سے، ورنہ عمر بھر  
 محروم عشق یعنی کنوارا رہوں گا۔

چنانچہ اسے میری پیاری! میں نے چالیس برس تک تمہارا انتظار کیا۔ اگر  
 چالیس برس تک میں سہا لیدہ پر بت پر جا کر تپا کرتا تو اب تک خدا کو پالیتا لیکن  
 آہ نہیں خدا کو پاسکا نہ تمہیں۔ میں نے برسوں تمہیں بازار میں جاتے ہوئے  
 دیکھا۔ تمہاری کمر جیدہ تھی، اماؤں کی لاش تمہارے کندھے پر سوار تھی، آنکھوں  
 پر موٹے موٹے شیشوں کی چینک تھی۔ بنی پر کے بوجھ سے تمہارے ہاتھ کانپ رہے  
 تھے۔ میں پوچھتا ہوں ظالم، کیا یہی تمہارا کاز تھا؟ یہی خمدگی، یہی لاشیں، یہی  
 چینک اور یہی پکی؟ اگر واقعی یہی کاز تھا تو جان تمنا! اب اس کی تکمیل ہو چکی

صرف نہ سمجھ کر پولیس کے حوالے کر دیا۔

غرض اسے جانِ تنہا! میں نے تیرا جلوہ دیکھنے کے لیے کیا کیا مصائب برداشت نہ کیے۔ لیکن تمہارا دل نہ پیچھا عجیب بات ہے کہ تمہارے دھماکے کے لیے ہمیں چور بننا پڑتا ہے، ڈاکو اور سنگٹہر کہلاتا پڑتا ہے، وحشی کہتے ہیں عاشقوں کا راستہ روک لینے نہیں۔ تم جہاں بھی جیتی ہو کسی نہ کسی پردے میں یا قید میں یا تالے کے اندر۔ آخر تم نے کون سا جرم کیا ہے کہ تمہیں ہر آدمی اندھیری، تاریک قیدوں میں رکھتا ہے۔ آخر تم ایک دھماکا ٹکڑا ہی تو ہو۔ تمہارے اس دھماکے کے پھیلنے محسن کی خاطر پورے انسانی سماج نے اپنا حلیہ بگڑا لیا ہے۔ تمہاری خاطر دنگے، قتل، ڈکیتی یہاں تک کہ تہذیبیں ایک دوسرے کو فنا کر دیتی ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے؟ کیا وجہ ہے؟ کیا وجہ ہے؟

## اینٹ کے نام۔

اینٹ ری اینٹ!

کل تمہاری وجہ سے ہمارے محلے میں جو دنکا ہوا اُس کے لیے تمہیں شرم ہے  
دوب مرنا چاہیے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ہماری پڑوسن (نام تو تمہیں بھی معلوم ہو گیا ہو گا) تمہیں سامنے کے پبلک پارک سے اٹھا کر (بکہ چاکر ملے آتی تھی۔ جہاں تم دوسری سینکڑوں اینٹوں کے ساتھ کسی کی دیوار بننے کی خاطر ٹہری ہوئی تھیں۔ تم صرف پانچ پیسے کی اینٹ تھیں لیکن غضب یہ ہو کر اسکول ماسٹر رام سہائے کی لڑکی نے اسے اینٹ چراتے دیکھ لیا اور محلے بھر میں شور و غل مچا دیا۔ بس پڑوسن بچا رہی بدنام ہو گئی اور اس نے نچھتے میں آکر تمہیں اسکول ماسٹر کی بیوی کے سر پر دے مارا اسکول ماسٹر نے بھرتی نہیں اٹھا کر پڑوسن کا سر بھاڑ ڈالا اور یوں دنکا ہوا

جواب : جب ! امیری اور غریبی دونوں ترقی کر رہی ہوں ۔

سوال : کال بیل اور کال گرل میں کیا فرق ہوتا ہے ؟

جواب : کال بیل بیکانی جاتی ہے ۔ کال گرل خود بخود تنگ اٹھتی ہے ۔

سوال : کچہری کے وکیل اور کوٹھے کی طول الف میں کونسی چیز مشترک ہے ؟

جواب : گالک

سوال : اگر جتنا اپنے لیڈر کو بے ایمان کہہ دے ، تو لیڈر کیا جواب دے گا ؟

جواب : یہی کہ میں اس پر غور کروں گا ۔

سوال : انسان گرمی ہوئی چیز کو اٹھالیتے نہیں ۔ مگر گرتے ہوئے انسان کو کیوں

نہیں اٹھاتے ؟

جواب : کوڑا کرکٹ کو اٹھانا اچھا نہیں سمجھا جاتا ۔

سوال : ناک کس کی پر جا کرتا ہے ؟

جواب : اپنی

سوال : کئی لوگ اپنی قرآپ کیوں کھودتے ہیں ،

جواب : کھدائی کے پیسے بچانے کے لئے ۔

سوال : اگر کسی لیڈر میں قوم کا درد اچانک روپے پیسے کے درد میں بدل جائے

تو آپ اسے کیا کہیں گے ؟

جواب : دردناک

سوال : رام راج اور جتنا راج میں کیا فرق ہے !

جواب : رام راج میں دیا اور تیل مل جاتا ہے ۔ مگر جتنا راج میں صرف دیا ملتا

ہے ۔ تیل نہیں ۔

سوال : حیب عاشق اور محبوب ایک دوسرے کی بات نہ مانیں تو کیا ہوتا ہے ؟

جواب : بچہ ڈرا ہو جاتا ہے۔

سوال : بچے دنوں خیر آتی یعنی کہ کچھ سون سہروں نے خیر ہری جن عورتوں کی متیا کر ڈالی آپ اسے کیا کہیں گے ؟

جواب : گم ہوتا۔

سوال : لوگوں نے پیسے کو بھگوان بنا لیا ہے۔ تو اصل بھگوان کو کیا کہا جائے ؟

جواب : گھر ٹاسکے

سوال : میں یاد جو درخواست کے زندگی کی اونچی منزل پر نہیں پہنچا۔ کارن ؟

جواب : نفٹ خراب ہوگی۔

سوال : انسان اور بھگوان میں کیا رشتہ ہے ؟

جواب : دونوں ایک دوسرے کی تخلیق ہیں۔

سوال : اس سروجن کا نام بتائیے جس نے ہیشہ ایک سرو کے ساتھ رول کیا ہر ؟

جواب : آپ کی بیوی۔



# دل کی ڈائریاں

ایک جیب کترے کی ڈائری

پہلی اپریل -

آج اپریل فول تھا۔ اس لئے میں نے اپنی آتما سے کہا۔ ”اے مکندال کی آتما! آج لوگ دوسروں کو فول بنا سکیں گے۔ میں تمہیں بناؤں گا!“ اور میں نے بھنگو۔ بے کڑے پہنے۔ ماتھے پر ماتھے کے بھی لبا۔ سینہ درمی تلمک لگایا اور علاقے کے اس مشہور مندر میں چلا گیا، جس کے پجاری کی جیب کھیلے جینے کاٹی تھی۔ مجھے اس پجاری پر غصہ بھی بہت آیا تھا۔ کیونکہ اس کی جیب میں سے کئی کھوٹے سونے نکلے تھے۔ نہ جانے لوگ پوجا کے لئے کھوٹے سونے کیوں چڑھاتے ہیں۔

جب میں مندر میں پہنچا تو عقیدت مندوں کی ایک ٹھیر لگی ہوئی تھی۔ بے اختیار ہی جاہل جیب کاٹنے کا نادر موقع ہے۔ لیکن آتما نے مجھے خوش گالی دی کہ تم مرد ہو یا سیاسی لیڈر، وعدہ کر کے ایقا نہیں کرتے۔ میں ٹھنڈی سالتس بھر کر خاموش ہو گیا۔ اگرچہ مجھے آتما پر سخت طیش آیا کہ یہ کسی ڈھیسٹ ہے۔ ہر وقت انسان سے چھٹی رہتی ہے۔

شرودھالوؤں کی بھیڑ کو چیر کر میں بھگوان کی مورتی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اندر سے عقیدت کے ساتھ آنکھیں بند کر لیں (اگرچہ کبھی کبھی ایک آنکھ بخوف سے کھول کر چڑھا دے کے دھن کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا) اور پھر بھگوان کی مورتی کے سامنے حلفت لیا کہ اگر میں آئندہ کسی کی جیب کا ٹوں تو تم مجھے کانایا پرا ددلوں بنا دینا! یہ حلفت میں نے دل ہی دل میں لیا کیونکہ بلند آواز میں لیتا تو ارد گرد کھڑے سب کے لوگ سن لیتے، ان کو ایمان دار بناتے ہوئے بھی لوگوں سے شرم آتا ہے۔

حلفت لینے کے بعد جیب میں چڑھا دے کے لئے جیب سے پیسے نکالنے لگا تو بہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میری جیب کٹ چکی تھی!

اس کے بعد سارا دن اداس رہا۔ میں آتما کو فول بنائے کھلاتا تھا، لیکن آتما نے مجھے فول بنا دیا! میں نے آتما سے پوچھا: ”یہ تم نے کیا حرکت کی؟ میں تو صرف تم سے بچا پرل فول کر رہا تھا۔ صدق دلی سے جیب کڑی سے تو بہ محفوظ کر رہا تھا کہیں تم سو گئیں اور کوئی میری جیب ہی کاٹ کر لے گیا۔“

”آتما نے جواب دیا قہہ قہہ قہہ!!“

میں نے کہا ”شیم! شیم! شیم!!“

تین اپریل -

مندر میں جس آدمی نے میری جیب کاٹی مئی آج اس کا پتہ چل گیا ہے جیب کتروں کے گور دے جسے ہم سب ”جنگی دادا“ کہتے ہیں، مجھ سے فکر کیا کہ آج کل مندروں میں شٹ پونجی، شرودھالو جانے لگے ہیں۔ پرسوں ہمارے گروہ کے ایک جیب کترے شنبھو نے ایک بھگوانے کپڑوں والے بھگت کی جیب کاٹی تو اس میں سے صرف سو روپیہ اور ایک ادھ چلی پٹری نکلی! — یہ کہہ کر جنگی دادا قہہ مار کر چٹا میرا، تھا شنکا کہ یہ سو روپیہ اور ادھ چلی پٹری تو میری جیب میں تھی جس میں انکی کرواداکے

سامنے اعتراض کر لیں کہ وہ محبہ ذاتِ شریف ہی کی جیب تھی لیکن پھر یہ سوچ کر لرز اٹھا کہ دادا اپنے چایک سے میری چٹری ادھیڑ دے گا۔ — — — اپنے گروہ میں ہی خارج کر دے گا۔ یہ جیب کتڑی کی تو میں بے کرب جیب کتڑے کی ہی جیب کٹ جائے۔ دادا مجھے ان کو الیقاؤڈ کر دے گا۔ اس لئے اپنی ندامت کا زہر جیب چاپ پی گیا۔

البتہ مجھے شبیہو سائے پر بیت غصہ آیا کہ اس نے مجھے بھپاتا کیوں نہیں حالانکہ ہم نے کئی بار اکٹھے مل کر جیبیں صاف کی تھیں۔ دل میں فیصلہ کر لیا کہ کسی دن شبیہو کسی کی جیب کاٹے گا، تو میں ہاتھ کی صفائی دکھا کر اس کی جیب کاٹ لوں گا۔

آج شام کو ایک بس سٹاپ پر اپنا "کاروبار" کرنے کے لئے گیا تھا۔ ایک نوجوان کا لچھٹ کا بیڑا اڑا لیا گیا، مگر اس بیڑے میں صرف ایک حسین لڑکی کا فولڈ نکلا، شاید اس کی کا لچھٹ محبوبہ ہوگی۔ فولڈ کی پشت پر لڑکی کا ایڈریس لکھا ہوا تھا میں نے اس ڈریس پر فولڈ واپس ڈاک سے بھیج دیا اور مجھے نیچھے کا لچھٹ نوجوان کی طرف سے کہہ دیا۔ "شکریہ کے ساتھ واپس!"

۱۴ اپریل

کئی دنوں سے کاروبار مدھم ہے۔ میں جیب میں بھی ہاتھ ڈالتا ہوں اور مٹا سی رقم ہاتھ لگتی ہے۔ نہ جانے لوگوں کی آمدنی کم ہو گئی ہے یا مہنگائی بڑھ گئی ہے کہ لوگوں کی جیب میں پیسے ٹکے ہی نہیں معلوم ہوتا ہے ہم سے بھی بڑے جیب کتڑے یعنی بلیک کیٹے میدان میں سرگرم ہو گئے ہیں۔ آخر گورنمنٹ ان بلیک مارکیٹوں کے خلاف ایکشن کیوں نہیں لیتی۔ ان کی وجہ سے ہمارے ایسے خاندانی جیب کتڑوں کا بزنس تباہ ہو رہا ہے۔



شکلی۔ راکٹ کی سی تیزی کے ساتھ میرے دونوں ہاتھ حرکت میں آئے اور دو کچلے لحمہ میرے ہاتھ میں دوڑنے لگے تھے۔ دونوں کی مجموعی رقم ایک ہزار دو سو سولہ روپے تھی اور تیسرے منٹ میں نے دیکھیا نوجوان حسینہ اور خورشید پر سن آدمی دونوں خواصد رت ہوٹل کی سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے۔ ادھیڑ آدمی نوجوان حسینہ کا نازک گورا گورا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ دونوں تھکتے لگا رہے تھے۔ دونوں محبت کے نشے میں چور تھے۔ محبت انسانوں کے ہوش و حواس گم کر دیتی ہے۔ اور ہم جیب کنزروں کے لئے نعمت غیر منزقبہ ہی کر سانسے آتی ہے۔

وہ اس وقت تو تھکتے لگا رہے تھے، جب ہوٹل کا بیران کے سامنے بل پیس کمرے کا تو دونوں نارود قطار روٹیں گے۔ سچ ہے محبت صرف سہانا نہیں ہے، اراقتی بھی ہے۔ مجھے ان دونوں پر رحم بھی آیا کہ وہ ہوٹل کے منبر کے سامنے کتے، سڑمندہ ہوں گے، سارا عشق کا نور ہو جائے گا۔ جی چاہا ان کی دردناک دیکھنے کے لئے ہوٹل کے باہر کھڑا ہوں اور ممکن ہو کسی پہاڑے ان کی جیب میں دس روپے کا ایک نوٹ ڈال دوں تاکہ بے چارے ٹیگیسی پر واپس جاسکیں۔ نوجوان حسینہ اگر پیدل چلے گی تو اس کے نرم و نازک تلووں میں چھپائے پڑ جائیں گے۔

لیکن جیب تراشی کے عظیم اصولوں کے مطابق اس جگہ رکنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس لئے میں ایک ٹیگیسی پر چلا گیا۔ قرصن اتار دیا۔ جیگا داوا اور جھوٹے مقامی دار کا بھینٹ بھی ادا کر دیا۔ بیوی کے لئے ایک ساڑی اور اپنے لئے خشک گوشت اور قہر کی خریدی اور اس وقت وہاں کی کاپیٹ سلمے رکھے آہستہ آہستہ لڑیں کر رہا ہوں اور ڈائری بھی لکھ رہا ہوں۔ کاش! مجھے اس ادھیڑ عاشق کا ایڈریس مل جاتا تو ایسے شکرے کا ایک خطا لکھ دیتا۔

— ۲۰ اپریل —

آج تین دن بعد گھر سے باہر نکلا تھا۔ ان دونوں بڑوں کا نشہ ابھی اترا نہیں، لیکن انار کا احساس ضرور شروع ہو گیا ہے۔ اس خدشے سے مارکیٹ میں پھرا گیا کہ کہیں جیب نراسنی کی پریکٹس نہ بھول جائے۔ آج تو ایک چھپرا بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ کیونکہ اخباروں میں پڑھا کہ آج کل حفاظت خود اختیاری کی خاطر جیب کترے حضرات چھپرے ساتھ لئے پھرتے ہیں۔ بلکہ جیب ایکب کترا جیب کاٹتے پکڑا گیا تو اس نے جیب کٹوانے والے کی بجائے شور مچانے والے ایکب اور آدمی کے پیٹ میں چھپرا اتار دیا۔ جیب وہ بھیا گئے میں کامیاب ہوا۔

تھے تھیلے ایکب طلبہ گاہ میں بیچا۔ ایکب، عجب نو دس سال کے ایکب چھپو کرے کو لوگ پکڑے ہوئے تھے اور لات، لٹکوں اور طمانچوں سے اسے ”با اخلاق“ بنا رہے تھے۔ معلوم ہو کہ اس نے ایکب بوڑھے کی جیب میں سے تین روپے اڑائے تھے۔ جس نے آگے بڑھ کر اس چھپو کرے کو تراخ تراخ چائے رسید کئے، جس سے اس کی ساری جیب کتری نکل گئی اور اس سے تین روپے کر بوڑھے کو واپس دے دیئے اور اعلان کر دیا کہ میں خود اس لونڈے کو تھفانے میں لے جاؤں گا!

بوڑھے نے میرا شکریہ ادا کیا اور جیب میں اس لونڈے کو کان سے پکڑے تھفانے کی طرف لے جا رہا تھا تو اس بوڑھے کے تین روپے میری جیب میں واپس آچکے تھے۔ کیونکہ جیب وہ بوڑھا میرا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ میں اس کی جیب سے دوسری بار کاٹ رہا تھا! میں نے راستے میں اس چھپو کرے کو گالیاں دے کر ان تین روپوں میں سے ایک روپیہ دے دیا۔ اور اسے سمجھایا کہ بے وقوف! جیب کاٹا ہوتا پہلے کسی استاد سے یہ سہز سیکھ لو۔ تمہارے ایسے فاعکار جیب کتروں نے

اس جن مطیع کو سرا کیا ہے ۔

میں نے وہ دو روپے بھکاریوں میں بانٹ دیئے۔ آخر وہ بھی انسان ہیں  
بغض بھی زندہ رہنے کا حق ہے۔ اگر فوجیب نہیں کتر سکتے تو جیب کتروں ہی کی کئی  
کھا میں ۔

۲۵ اپریل ۔

بد قسمتی جیب ساتھ دیا ہے جیب کتر کسی کلرک کا بیٹوہ اڑا لیتا ہے کا  
ایک کلرک کا بیٹوہ اپنے سامنے رکھا اس کی بد قسمتی دیا اپنی بے وقوفی پر سنس رہا ہوں  
ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ بیٹوہ نہ ہو۔ تیر کا نشان ہو۔ جس پر لکھا ہو۔ "شمنشان  
گھاٹ کو ۔"

در حقیقت غلطی مجھ سے ہوئی۔ میں گذشتہ تین دن کے ایک رشوت خور  
کلرک کا پھیا کر رہا تھا تا کہ وہ فلسفہ مساوات کی رو سے اپنی رشوت کا روپیہ  
میں جیب کتروں میں بھی غنٹی غنٹی بانٹ سکے۔ لیکن عین موقع پر وہ میرے ہاتھ  
سے نکل گیا۔ جس پر مجھے سخت غصہ ہوا اور میں نے غصے میں اگر ایک دو کلرک  
کی جیب کاٹ لی۔ اس میں سے جو کچھ برآمد ہوا اور ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ ایک شیلرنگ شاپ کا بل ساڑھے چھ روپے۔ یہ شاید ایک تھیں کا بل تھا  
جسے یہ کلرک زاماکر سکا نہ تھیں لاسکا۔ حالانکہ مقررہ تاریخ کو دو مہینے گزر چکے  
تھے !

۲۔ کلرک کے سالے کا ایک خط جس میں اس نے دھمکی دی تھی کہ ہم اپنے  
بال بچوں سمیت آپ کے گھر میں گرمی کی تعطیلات گزارنے آ رہے ہیں ۔ کلرک  
کے گھر کو اس نے بل اسٹیشن سمیٹ لیا تھا۔

۳۔ ایک پھولی سکر رٹر جس نے اپنے بچے کے لئے دفتر سے چرائی ہوئی ۔

۴۔ ”در کے لئے کنیا کی ضرورت، اس کے اختہار کی ایک کشتک اس کا مطلب ہے کلرک کی بیٹی اپنی جوانی کا بوجھ لئے اس کے کندھے پر بیٹھی ہے۔

۵۔ ”دس پیسے کا رسیدی شکٹ (اسے رسیدی شکٹ کی کیا ضرورت پڑی ہوگی، نہ جانے کیسے اس کے ہاتھ لگ گیا) جرمی نے بھی بیکارہ تھا۔

۶۔ ایک فوٹو گراف جس میں کلرک اپنے پانچ بچوں اور ایک بائیکل کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ بائیکل اس کا چھٹا بچہ معلوم ہو رہی تھی!

۷۔ ”دو روپے کے ایک میلے کچیلے نوٹ کے تین ٹکڑے — وہ نوٹ اس کی غیر منقولہ جائداد کے طور پر محفوظ رکھا ہوا تھا۔

اس کے علاوہ کچھ انہونی غیر ضروری کاغذات تھے۔ ایک میل سے بھری کنگھی تھی لیکن سب سے زیادہ بیش قیمت چیز جو کلرک مذکور کے ہارٹ نیل ہوئے کا بائٹ ہے۔ ”وہ کتنی دو روپے ہیں پیسے کی قدر تم! جس کے بل بوتے پر کلرک اس پینے کے آخری تارک دن گزارنا چاہتا تھا!

میں نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ تمام چیزیں ایک ڈسٹرڈ سکیٹ کے ذریعہ کلرک مذکور کو پوسٹ کر دوں گا اور دو روپے ہیں پیسے کی رقم اس کی ڈسٹرڈ ٹیفیس پر خرچ کر دوں گا۔

اور آئندہ ”میں نے“ میں نے حلفت لے لیا ہے کہ جیب بھی کسی کی جیب کا لگوں گا، اس سے پہلے چھ لوں گا کہ تم کلرک کو نہیں ہو؟

۲۸ اپریل

آج میں تلی میں بیٹھا ہوں، بال فٹ بال میچ کے دوران اچانک جیب کاٹے ہوئے پڑا گیا تھا میرا دوسرا سا کھٹی توڑوہ لے کر فرار ہو گیا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ الیٹھ داروغہ میں جیب مجھے نذر بند کرے تو لگا تو میں نے اس کی جیب سے



میں دس بارہ روپے کی رقم اڑا لی!

مجھے افسوس صرف یہ ہے کہ یکم مٹی آئے والی ہے یہ سرکاری ملازموں کی تنخواہ کا دن ہے۔ اور تنخواہ کے دن ایک جیب کترے کا جیل میں رہنا جیب تراشی کی تاریکی کا ایک المناک حادثہ ہے۔ میں نے جگہ دادا کو ہتیا م بھجوا دیا ہے کہ مجھے یکم مٹی سے پہلے پہلے رہ کر دادرے!!

## ایک لیڈر کی ڈائری

نوٹ: میری یہ ڈائری میرے انتقال کے پانچ سال بعد شائع کی جائے گی۔

۱۷ اکتوبر

کل میرا جنم دن تھا۔ کہتے ہیں جو لوگ اکتوبر میں پیدا ہوتے ہیں وہ راج گری پر بیٹھتے ہیں۔ میرا سوسیا رام دھن بھی اکتوبر میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن وہ راج کے تھوڑے بڑے دھن ہے۔ رام دھن نے اپنا جنم دن کہیں نہ منایا کیونکہ کالسی ٹیوشن کی رو سے ہر آزاد شہری کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنا جنم دن منائے یا نہ منائے۔ ہمارا کالسی ٹیوشن بس آزاد خیال ہے۔

میں نے اخباروں میں یہ محابدا نہ اعلان شائع کروایا تھا کہ اپنا جنم دن نہایت خاموشی اور سادہ طریقے سے مناؤں گا۔ لیکن صبح صبح میاں کا بدینے والوں کا یوں تانتا بندھ گیا جیسے گڑ کی بھیلی پر مٹکیاں جمع ہو جاتی ہیں۔ مجھے لمبوں اور تختوں سے لاد دیا گیا۔ ایک پرسن رپورٹر نے مجھ سے پوچھا: کیا آپ اپنے پہلے بیانی کی ترمیم کرنا پسند کریں گے؟ آپ کے جنم دن میں گاندھی جی کی کسی ساؤتھی ہوگی؟

لیکن میری بجائے میرے خزانٹ سکریٹری نے جواب دیا: "اس کا جواب عوام سے پوچھئے۔ کیونکہ پارٹیا صاحب کا یہ جنم دن عوام خود منا رہے ہیں۔ عوام نے اپنے لیڈر کے ہاتھ سے ہانگ ڈوڑھ چینی لی ہے۔"

میرا سکریٹری جھوٹ بول رہا تھا۔ کیونکہ ہمارا دور تختے لانے والے عوام بالکل نہیں تھے۔ ان میں کچھ وزیر تھے، کچھ بڑے بڑے کارخانہ دار تھے، کچھ میرٹھ پونجے، سیاسی لیفٹننٹ تھے۔ کچھ میری بیوی کی نقل نقل کرتے حسبن والی سہیلیاں تھیں۔ جن کے دبیز ہونٹوں پر نقی ہوئی لپ شک کی گئی تھیں چڑھتی ہوئی کھنیں اور ان تھوں پر جب مبارک باد کی مصنوعی مسکراہٹ ابھرتی تھی تو مجھے گھن آ جاتی تھی۔ لیکن میں اس گھن کا جواب مصنوعی مسکراہٹ سے دیتا تھا۔ میرے پاس اپنا کچھ بھی نہ تھا، جو کچھ تھا، میرے مداحوں کا دیا ہوا نفع تھا۔

میرے جنم دن کی خوشی میں رات کو عوام نے یعنی جوئے ہوٹل کے۔ لک۔ سیٹھ ٹھیکہ پر سادے عوام یعنی سیٹھوں و وزیروں، سمگلروں اور دھارکے نیٹاؤں کو ایک سادہ اور خاموش ڈنڈ دیا۔ جس میں سلکی پردے کے ٹیکھے، دھکی اور پردے کے باہر منگ کی دال اور مرغ مسلم شامل تھے۔ سیٹھ ٹھیکہ پر سادے کے ہوٹل کی بدعنوانیوں کے خلاف جب دو سال پہلے میں نے ایک عوامی اندولن شروع کیا تھا اس وقت سے وہ میرا مداح بن گیا تھا۔ ڈنڈ کے بعد میں نے سیٹھ ٹھیکہ پر سادے کے ساتھ فوٹو کھینچوایا۔ پر جانتے ہوئے بھی کہ وہ اس فوٹو کی بدولت اپنے معزز کاہلوں کو بلیک میل کرے گا۔

میں اس بلیک میلر کی انیٹ سے انیٹ بجا سکتا تھا۔ لیکن اندولن کے دوران اس کی نقی میری بیوی میرے پاس سمجھوتے کا فارمولا لے کر آئی تھی۔ وہ

کم بخت بے مدد و نصیر رست یعنی کسی عورت کو اتنا بھی خواہش و رست نہ ہونا چاہیے کہ پورے کا پورا سوشلزم اس کے سامنے سرسبز ہو جائے !

ڈنر کے بعد سکرٹری نے اعلان کیا کہ عوام کے محبوب نیا شری لپاڑیاجی کو جو سادہ تحفے موصول ہوئے ہیں وہ جھگی جھونپڑی والوں کی بہبودی پر خرچ کئے جائیں گے۔

ایسا اعلان میرے گزشتہ جنم دن پر بھی کیا تھا، ہر دو سرے اعلان کا حشر پہلے اعلان کا سا ہوتا ہے۔ جھگی جھونپڑی کے کالے کلوٹے اودھ نئے بچوں کے نصیب میں تو دو دو لٹو لٹکے تھے۔ حالانکہ ان میں سے کئی بچے اکتوبر مہینے میں ہی پیدا ہوئے تھے۔

۱۳ نومبر

شاید ہی چودہ نومبر کا دن تھا۔ آج سے چودہ برس پہلے میں نے اپنے بچے ہرے جوتے اور بچے ہوئے پا جانے کے ساتھ ایک حلے میں اخبار ”دین بندھو“ کی چودہ کاپیوں کو آگ لگا لی تھی۔ اور اسی رات کو اخبار ”دین بندھو“ کا کنٹرول مالک لالہ بھگتی چندا اپنی چمکی کار پر میرے تنگ دتار یک کو ارٹھیں یوں کیا تھا جیسے کرشن بھگوان سداں کے گھر آئے ہوں ! اور ایک ہزار روپے کے کرنسی نوٹ میرے میلے کچیلے تکیہ پر رکھتے ہوئے کہا تھا: ”پاڑیاجی ! آپ سچ ایک ایک آتش بیان مقرر ہیں۔ لیکن افسوس ! کہ اس اسمباگے دسٹ میں جوہر قابل کی قدر نہیں ہے۔ آپ دین ہیں اور ہمارا اخبار ”دین بندھو“ ہے۔ یہ ایک ہزار روپے کی تچہ بھنیٹ، ”دین بندھو“ کی طرف سے قبول فرمائیے اور اپنے لئے نئے پانچائے سلا لیجئے۔“

”تم مجھ کو شوت دے کر میرا صغیر خریدنا چاہتے ہو“ میں نے گرج کر

کہا تھا ان دنوں میں کافی امن تھا)

مگر لالہ بھگتی چند ضمیروں کا گھاگ سیاہی تھا، میری جاہل انقلابی  
ضمیر کہ بلند بانگ دعوے سے دل برداشتہ تھیں ہوا۔ میری پیشہ پر  
مشفقانہ تفسیر دیتے ہوئے مسکرا کر بولا، (جو ان انقلابی دانش کے کرداروں  
مفلس تنہاری رہنمائی کا انتظار کر رہے ہیں۔ مگر دانش کا افلاس دور کرنے  
سے پہلے اپنا افلاس دور کرو۔ درنہ دو چار سال بعد تنہاری یہ بھوک  
ادرتاریکی اور غلامت تنہاری ہڈیاں چاٹ جائے گی۔

اس ایک مزار پر بے کرم ملٹی پر سڑتا منتر کی گویاں قصور سے قبول کر لیں یہ کہ وہ  
جلا گیا۔ ڈٹا منتر کی گویاں میرے غلیظ سرانے کے اندر گھٹے ہو گئے تھیں، لی  
کے جراثیم کو مارنے کے لئے پڑی رہ گئیں، میرے ایمان کی مضبوط دیوار  
کی پہلی اینٹ گر چکی تھی۔ غصے اور بے بسی کے ملے جلے تاثرات ساری رات  
بھوتوں کی طرح میرے خوابوں میں وحشیانہ رقص کرتے رہے۔ لیکن جب دوسری  
صبح بیدار ہوا تو اخبار ”دینی بزم“ کا تاڑہ پرچہ میرے سامنے پڑا تھا جس میں  
جلی عنوان کے ساتھ یہ خبر درج تھی :-

”عوام کے محبوب رہنما شری پاپریا کی گرفتاری آج متوقع۔“ معتبر ذرائع  
سے معلوم ہوا ہے کہ کل جتنا کھانا تو ملنے کے اندر عوام کے محبوب تری رہنما شری  
پاپریا نے ریشمی کپڑوں کی ایک گانٹھ کو چراگ لگائی تھی، اس سلسلے میں  
سرکار کی طرف سے ان کے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری کئے جا چکے ہیں  
اور آج کسی وقت بھی ان کی گرفتاری متوقع ہے۔ مل و رکروں میں ان کی گرفتاری  
کے بعد کتنا غریب و غصب بھیل سکنا ہے؟ اس کے متعلق سارے شہر میں  
چیمگیو بیاں ہو رہی ہیں۔ مل کے ارد گرد دفعہ ہم انکا دی گئی ہے۔“

گو یا لالہ بھگتی چند نے میری شہرت اور میری لیڈری کا شاندار آغاز کر دیا تھا  
میرا سر مارے احسان کے اخبار ”دین بندھو“ کے اوپر جھبک گیا اور مجھے زندگی میں  
پہلی بار معلوم ہوا کہ اخباروں کی آزادی صرف ایک پر فریب جمہوری طلسم ہے  
اور یہ دنیا عنیروں کی خرید و فروخت کی ایک بہت بڑی منڈی ہے۔ اور میں بھی  
منڈی کی ایک جنس ہوں۔

آج چودہ برس بعد لالہ بھگتی چند میرا لنگوٹیا دوست بن چکا ہے اور آج  
جب بھی ہم دونوں اس واقعہ کو یاد کرتے ہیں تو ہم خوشی کے آنسو بہاتے ہیں۔  
ہاں، آج چودہ نومبر ہے اور میں اپنی ڈائری میں یہ چند الفاظ خوشی کے  
آنسوؤں کی طرح بہا رہا ہوں۔ اور اپنے اس بچے ہوئے پاجامے کو الماری سے  
نکال کر سوچ رہا ہوں۔ یہ پاجامہ آج بھی موجود ہے۔ سندوستان کے  
افلاس کی طرح اور افلاس آج بھی سندوستان میں زندہ ہے۔ اگر چودہ نومبر  
کو میں اخبار ”دین بندھو“ کے پرچوں کو لگا کر لگاتا تو اس پاجامے کو بی  
کے جراثیم چاٹ چکے ہوتے۔ چودہ نومبر زندہ باد! افلاس کے پاجامے پائینڈ  
باد!!“

۳ دسمبر

کچھ دنوں سے زندگی بہت ڈول ہو رہی تھی، نہ کوئی شہ گامہ تھا نہ شور و مشر۔  
سیٹھ ٹھیکہ گاہ پر ساد کی حسین ترین بیوی بھی پیرس کے سیر سپاٹے پر چلی گئی تھی اور مجھے  
دانا جبرائی دے گئی تھی۔ غلطی میری اپنی تھی۔ میں نے ہی اسے سندوستانی سنگیت  
کاروں کی ڈبلی گیش میں شامل کر دیا تھا۔

حالانکہ وہ علم موسیقی میں پرائمری پاس بھی نہ تھی۔ لیکن میرے حق کے تاروں  
کو کبھی کبھی ہار چمڑ دیا کرتی تھی۔ اس لیے اس کے سنگیت کار ہونے میں کوئی شک

وہ چلی گئی اور مجھے سرکاری کاموں کے بیابان میں تنہا چھوڑ گئی۔ میں نے اپنی تنہائی اور اداسی اور جدائی کا غم دور کرنے کے لئے ایک نیا شوشہ کھرا کر دیا۔ شہر کے ایک دیرین شیلے پر ایک ذلیل سا چھوٹا سا مندر بنا ہوا تھا، یہ جانتے ہوئے کہ اس مندر میں بھگوان رہتا ہے۔ میں نے اپنے ایک جنونی درکر کے ہاتھوں اسے گروا دیا اور بھگوان کا بھگوان منہدم ہو کر نیچے گر پڑا۔

مندر گرنے کی خبر سے بھگوان کے ہزاروں بھگت پاگل ہو گئے، منہ سے جھاگ بہانے لگے۔ انہوں نے جوش اور غصے میں دوسرے ہی دن مندر کی تعمیر پھر شروع کر دی۔ دوسری طرف سے خدا کے پرستاروں نے بھی خدا کی حفاظت کے لئے جھنڈے اٹھائے، ان کا دعویٰ تھا کہ اس مندر کے نیچے ایک پرانی مسجد دی پڑی ہے اور کہ ہم اس مسجد میں رہے ہوئے خدا کو باہر نکالیں گے۔ دونوں طرف سے حقوق کی جنگ شروع ہو گئی، صبح کو مندر کی دیوار کھڑی ہو جاتی، دوپہر تک مسجد کی دیوار اور شام تک پھر مندر ابھرنے لگتا۔ بھگوان اور خدا آپس میں گتھم گتھا ہوتے۔ لگے میری اداسی اور ڈل زندگی میں ایک شکار، ایک رونق پیدا ہو گئی، میری پیرس میں گئی ہوئی حسین محبوبہ کا عارضی نعم البدل مجھے مل گیا۔

حب صورت حالات نازک ہونے لگی۔ قومیں نے تین شہگامی اقدامات کئے۔ (۱) فریقین کے نام صلح اور آتش کی دھواںگ اپنی جاری کر دی (۲) دونوں طرف کے دکرروں کی گرفتاریاں شروع کر دیں۔ (۳) پیرس میں اپنی حسین محبوبہ کو شیلی گریام بھیج دیا۔ "ڈارنگ! سارا شہر خدا کی لپیٹ میں آ گیا ہے۔ دن بھر جگا دوڑ کرتا ہوں۔ تم لوٹ آؤ تو اس نعم کا دینے والے شہگامے میں سکون اور سرور کے چند لمحے میسر آ جائیں۔

میری اس کی اپیلی اور ذیلی گرام دونوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ تناؤا اپنے حرج پر ہے۔ اٹھاد اور بھگوان دونوں خاموش تماشائی ہیں۔ لامٹھیاں اور گومیاں چلائی جا چکی ہیں۔ کل سے سارا شہر ہڑتال پر ہے کچھ دن بھر میں بے ہڑتال زدہ شہر کا دورہ کیا۔ ایک امن کمیٹی بنادی گئی ہے جس میں فریقین کے فساد رستہ شامل ہیں۔ دونوں طرف کے فساد رستہ میرے عقیدت مند ہیں۔ میں ایک انکوائری کمیٹی بنا کر اسے متنازعہ جگہ کی تاریخی ریسرچ کرنے کا حکم جاری کر دیا ہے۔

فیصلہ کرنا دشوار نہیں ہے۔ مگر میں ابھی پیرس سے شیلی گرام کے جواب کا انتظار کر رہا ہوں۔

۱۰ دسمبر

پیرس سے شیلی گرام آگیا ہے۔ (ماریسی)

انکوائری کمیٹی کی رپورٹ بھی آگئی ہے۔ (ایک طرف ہے)

اس دوران میں فساد فریقین کے پانچ آدمی ہلاک ہو چکے ہیں۔ ریسرکاری اطلاع ہے۔ غیر سرکاری اطلاع میں ہمیشہ مرنے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے نہ جانے سرکاری طور پر آدمی زیادہ کیوں نہیں مرتے؟

شنگدل مجبور بنے واپس آنے کی بجائے مجھے پیرس آنے کی دعوت دی ہے اس نے حکم دیا ہے کہ مندر اور مسجد کا فیصلہ قرار ہو۔ سیاسی فیصلے سیاستوں کے حکم سے کئے جاتے ہیں عجیب دنیا ہے۔ عجیب سیاست ہے۔

لیکن میں ابھی تک الجھن میں ہوں۔ میرے کچھ مخالف لیڈر انکوائری کمیٹی کی رپورٹ مطالعہ کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ کل مظاہرین کا ایک مجموعہ اپوزیشن لیڈر شری گوردھ ناتھ جی کی قیادت میں میری کونسل کے باہر نعرے لگاتا رہا اور میں

اندر بیٹھا اطمینان سے ٹیلی ویژن دیکھتا تھا۔ آج رات میں مشرقی گورکھ ناتھ کو ڈنر پر بلارہا ہوں۔ اسے پھیلی کے پکوڑے بہت پسند ہیں۔ وہ اکثر کہا کرتا ہے۔ پھیلی کے پکوڑے عوام کے گوشت پرست سے زیادہ لذیذ ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے ڈنر کی مستی میں ہم مسجد اور خدا دونوں کا فیصلہ کر لیں گے۔

۱۲ دسمبر

گورکھ ناتھ کے ساتھ میرا سمجھوتہ نہیں ہو سکا وہ کم سخت اس معاملے کو طول دینا چاہتا ہے۔ کچھ اور زحمتی، کچھ اور گرفتاریاں، کچھ اور قتل، کچھ اور بے وقوفیاں جو عوام کی طرف سے سرزد ہوں اور وہ ان بے وقوفیوں کے بل بوتے پر میرے سر سے تاج اتار لے اور خود پہن لے۔

کیوں نہ میں وزارت سے استعفیٰ دے دوں اور اعلان کر دوں کہ اس زمین پر مندر کا حق ہے اور میں مندر کی دیواروں میں اپنی ہڈیاں چنوا دوں گا۔ میرا لہو اور میرا گوشت مندر کی تعمیر میں لگا دیا جائے، اس سے دو فائدے ہوں گے (۱) گورکھ ناتھ کی تقدیر بھڑک جائے گی۔ کیونکہ وہ بھی مندر کے حق میں شور و غل مچانا پھرتا ہے۔ میرے میدان میں اترتے ہی لوگ گورکھ ناتھ کو بھول جائیں گے (۲) مندر کی حفاظت کے لئے جو دولاکھ روپیہ چنہ جمع ہو چکا ہے۔ وہ میری تحویل میں آجائے گا۔

لیکن مسجور بچاؤ کمیٹی کا کیا رد عمل ہو گا۔ کیونکہ اس کمیٹی کا صدر بھی میرا فرشتہ ہے اور وہ اب تک مجھ سے کچھیں ہزار روپے لے چکا ہے۔ اور پھر وہ میرا سچا و فادار بھی ہے۔

بڑی الجھن ہے۔ ابھی مجھے کچھ اور سوچنا چاہئے، کچھ اور انتظار کرنا چاہئے۔



۱۶ دسمبر

کامیابی - مسرت - فراموشی !

مندانہ جگہ کا حل تلاش کر لیا گیا ہے، ریسرچ کمیٹی کی رپورٹ میں ایک سنی خیر تنظیم کی گئی ہے کہ یہاں مندر اور مسجد سے پہلے گوالے رہا کرتے تھے۔ اس لئے اس جگہ پر گائیڈوں کی پرورش و پروا خست کی جائے گی اور عوام کو خالص، پاکیزہ دودھ بازار سے بچیں فی صدی رعایتی قیمت پر سپلائی کیا جائے گا۔ ریسرچ کمیٹی کے پانچ معزز ممبروں نے پانچ پانچ ہزار روپے لیکر تسلیم کر لیا ہے کہ مشری لپاڑیاہم سے زیادہ بہتر مورخ ہیں۔ انھوں نے رپورٹ میں ریٹرنیم بھی منظور کر لی ہے کہ اس جگہ کی کھدائی کے دوران ایک گائے کا ہڈی بھی ملا ہے۔ اور دودھ دہنے والا برتن بھی۔

آج شام کو عوام کا ایک بھاری جلوس نکل رہا ہے جو گومٹالہ بنانے کے حق میں ہوگا۔ عوام کو چھٹے خدا کی ضرورت نہیں، سستے دودھ کی زیادہ ضرورت ہے !

کل صبح سرکار کی طرف سے ایک قراخدا لانہ پیش کش کی جائے گی کہ مندر اور مسجد کی تقدس کو برقرار رکھنے کے لئے گومٹالہ کے دائیں اور بائیں طرف کی زمین الاٹ کر دی جائے گی اور تعمیر کا سارا خرچ سرکار ادا کرے گی۔

فریقین کے دو بڑے رہنما میرے ہاتھوں سے مجوس کے گلاس پی کر کل صبح اپنی بھوک بھرتال ختم کر رہے ہیں۔ اپنے ہی عزیز ہیں۔ بڑے فرما بیروار ہیں۔ میں کل صبح ہوائی جہاز سے پیرس کی طرف پرواز کر رہا ہوں۔ اس اندولن کی تکان مٹانے کے لئے مجھ پر کی آغوش بہت ضروری ہے۔ اگرچہ سرکاری طور پر میں فرانس میں تبدروں کی ایکپورٹ کے مسئلے میں گفتگو کرتے جا رہا ہوں۔

## ایک بالو کی ڈائری

۲ مئی ۱۹۷۰ء

کل میرے ٹھیکہ گرام چھینیکا مل کے مالک بھیگا چند نے مجھے خوش کرنے کے لئے ۱۹۷۰ء کی ایک ڈائری عنایت فرمائی۔ کیونکہ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ ریلوے کے گڈس پارسل کلرک بھیجنا تھا۔ اسے آپ کا "مناسب" تعارف کراؤں گا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے لفظ "مناسب" پر خاص زور دیا تھا۔ ایک لفظ کے بدلے میں ایک ڈائری مل جاتی ہے۔ مارکیٹ میں لفظ بھی کہتے ہیں۔ کتنی پیاری دنیا ہے۔ کتنی پیاری مارکیٹ ہے!

مناسب، ہر بڑا آدمی ڈائری لکھتا ہے، مجھے شک ہو گیا ہے کہ میں بڑا آدمی ہوں یا بننے والا ہوں۔ حیب میں چھوٹا سا تھا تو میرا والد کہا کرتا تھا: "میرا بیٹا بڑا ہو کر سمبھاش بالو بنے گا۔" والد کی دعا کا معنی تھنی اڑھرا۔ یعنی میں سمبھاش بالو تو نہ بن سکا۔ صرف بالو بن گیا۔ مجھے اس لفظ بالو سے سخت نفرت ہے۔ رکشا والا، تاننگے والا، قتل، چراسی سمبی مجھے بالو کہہ کر بلاتے رہیں گے میں بڑا آدمی نہیں بن سکتا کسی نے مجھے بتایا کہ بالو لفظ "بالوڑ" سے نکلا ہے جس کا مطلب "بندر" ہے۔ میں نے جب بھی آئینہ دیکھا ہے مجھے بندر کہیں دکھائی نہ دیا جس دن مجھے اپنے اندر بندر نظر آ گیا میں خود کشی کر لوں گا۔

میری بیوی ادھر آ رہی ہے۔ بندر کی بیوی! حیب یہ دلہن بھی کراچی یعنی تو بالکل غلط سارے بالو معلوم ہوئی تھی۔ لیکن اب چھ مہینے سات سال میں "سلم ایریا" بن کر رہ گئی ہے۔ میرے خیال میں مجھے ڈائری لکھنا بند کر دینا چاہئے۔ کیوں کہ وہ مجھ سے آکر کہے گی: اے میرے چار بچوں اور پانچویں امیدوار بچے کے ڈیڈی! اپنے اس بچے کو ڈائری پر اپنی نئی قمیص بھاڑ لایا ہے اور اسے یہ وارننگ بھی دے دو

کہ اسے تنخواہ کے تک شکر رہنا پڑے گا۔

۶ مئی ۱۹۷۰ء

آج سارا دن بے حد مصروف رہا۔ مالک مکان آٹھویں بار مکان خالی کرنے کی دھمکی دیے آیا۔ آدھ گھنٹہ تک اسے گالیاں دیں اور گالیاں کھائیں گالیاں کھاس کا رو بار کے دوران منحنے بچے کو بوتل میں سے دودھ بھی پلاتا رہا کیونکہ میری سلم ایریا برہم کاریوں کے سبب سنگ میں بھگوانی کے ساتھ براہ راست تعلق قائم کرنے لگی ہوئی تھی۔ خاندان گالیاں کھاتا ہے بیوی سب سنگ کرتی ہے جب وہ لونی تو میں نے مالک مکان سے جتنی گالیاں کھائی تھیں، وہ بیوی کے حلق میں اندھیل دیں۔ دفتر میں جا کر بڑے صاحب سے جھڑپ ہو گئی۔ اس نے دھمکی دی کہ تمہارے خلاف ان ایجنسیوں کی کچھ رپورٹیں آئی ہیں۔ مالک مکان غیبه دھمکی دیتا ہے۔ میں بیوی کو دھمکی دیتا ہوں۔ بیوی بچوں کو دھمکی دیتی ہے ہر بڑا ہر چھوٹے کو دھمکیوں تلے پیتا جا رہا ہے صاحب بڑا ہے، میں چھوٹا ہوں اگر ڈکری چھٹ گئی، اگر بیوی برہم کاریوں کے ساتھ بھاگ گئی، میں ڈر گیا صاحب سے وعدہ کر لیا کہ میری ٹھکانے کی دکان سے آپ کے مکان کے لئے ایک من لوہے کا سریبالا دوں گا۔ بیوی کو شلیفون کر دیا کہ فی الحال برہم کاریوں کے ساتھ بھاگنے کا پیرد گرام ملتی کی کر دو۔ مالک مکان کے گھر جا کر منیت سماجیت کی کہ میں رشتہ لینے کا نیک کام شروع کر رہا ہوں اور ڈیوڑھا کر ایہ ادا کیا کروں گا۔ اور کیا گزرتا، تین سو روپے ماہانہ پانے والا بابو دولت آمیز سمجھوتوں کے سوا اور کر بھی کیا کر سکتا ہے۔

سارا دن سمجھوتے کرتا رہا۔ شام کو کلرکوں کی ریلی میں انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتا رہا۔ اس کے بعد من کی شانتی کے لئے ایک بھگوانی جاگرن میں شریک

ہوا۔ اس وقت غیور نہیں آ رہی ہے۔ اس لئے ڈائری لکھ رہا ہوں۔

۱۰ مئی ۶۱۹ء

آج کوئی خاص گھٹنا یا دنگھٹنا نہیں ہوئی۔ اینٹوار کی چھٹی مٹی، اس لئے دن بھر آنتا سہٹ رہی۔ جیڑی کے ساتھ قلم دیکھنے کا وعدہ کیا اور توڑ دیا، ستاس کھیلنے والے کچھ کلرک یا لو آ گئے۔ وہ چما کھیلنا چاہتے تھے۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ میں نے اپنے کیرکٹر کی تعمیر شروع کر دی ہے۔ اس لئے جرات کھیلوں گا۔ انھوں نے مجھے جو رو کا غلام کہہ دیا۔ میں نے قبول کر لیا۔ شام کو تفریح کے لئے بچوں کو لے کر میرینیل پارک میں چلا گیا اور ان کے ساتھ گھاس پر بیٹھ کر مزگ پھیاں کھانا رہا۔ کئی ہینڈ لبرجروں نے اعلان کیا کہ تم ہمارے ڈیڑی ہو۔ مونگ پھلیاں، اور میرینیل پارک صرف دو چیزیں ایسی ہیں جراتان کو ڈیڑی بنا دیتی ہیں میں نے جب بچوں کو اپنے اوپر اتنا مہربان دیکھا تو انھیں ان کی مٹی کے غلام بھڑکانا رہا۔ اور ان میں سے ایک بچے نے تو مجھ سے وعدہ بھی کر لیا کہ آئندہ مٹی کے راز رہا کے سر سبت آپ کو بتا دیا کروں گا۔

۱۳ مئی ۶۱۹ء

گذشتہ کئی دنوں سے محسوس کر رہا ہوں کہ ہمارے گھر کے سامنے والی چھت پر ایک نوجوان لڑکی ٹھیک اس وقت بال بکیرے آکھڑی ہوتی ہے۔ جب میں دفتر جانے لگتا ہوں وہ زلفوں کو کسی رقاصہ کے انداز میں جب جھٹکا دیتی ہے تو میرے دل میں گھنگھروں کا اٹھتے ہیں۔ شروع شروع میں تو مجھے نگاہیں ملانے کی جرات نہ ہوئی، کیونکہ ایک تو میں کلرک ہوں۔ دوسرے محلے والے میں مجھے شریعت آدمی کہتے ہیں اور تیسرے یہ کہ پیار کرنے کے لئے نام چاہئے۔ میرا نام دفتر کے لئے محض ص ہے۔ پیار کرنے کے لئے نہیں۔ لیکن ایک دن تنگ آکر میں نے اسے ہاتھ سے

سلام کر دیا۔ وہ کمبخت مسکرا دی۔ اس مسکراہٹ نے میرے اندر کا سارا نظام  
 اقلقل پھیل کر دیا۔ اس دن میں پر سوار ہونے وقت اچانک اس کی مسکراہٹ  
 یاد آگئی تو میں سے پاؤں پھسل گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روٹی کا ڈبہ تو میں کے اندر  
 چلا گیا۔ اور میں بس سے یا نہرہ چھا۔

بیوی نے پوچھا تھا: ”ڈبہ کہاں گم کرائے؟“ میں نے جواب دیا: ”چور  
 ہو گیا۔“ اب میں اسے کہہ جاتا کہ سامنے وہ جوتوں والی سائولی سلونی  
 لڑکی رہتی ہے۔ ڈبہ اسی نے چرایا ہے۔

آج صبح وہ سائولی سلونی لڑکی جمعیت پر نہیں آئی۔ میرا دل ڈوبنے لگا،  
 جی چاہا، آج عہد مخدوم دیدار کو دفتر نہ جانا چاہئے۔ کئی منٹ تک اس سائولے  
 چاند کے طلوع ہونے کے انتظار میں سڑک پر کھڑا رہا۔ میرا چھوٹا بچہ بالکونی سے مجھے  
 ”بائی بائی“ کرتا رہا۔ بچے کی اس حرکت سے گہرا کر مل دیا۔ جاتے جاتے ایک ٹھنڈی  
 آہ محبوبہ کی چھت کی طرف پھینک دی۔ سارا دن دفتر میں طبیعت مضطرب  
 رہی۔ کسی کام کو جی نہ چاہا۔ شام کو اور ٹائم پر بھی کام نہیں کیا اور جلدی گھر لوٹ آیا  
 کیا دیکھتا ہوں۔ کہ چاند میرے گھر کی بالکونی میں اتر آیا ہے اور میری بیوی کے  
 ساتھ غیر رومانی باتوں میں مصروف ہے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکا جیسے باہر  
 نکل کر محبوبہ کے قدموں پر جا گئے گا۔ میں نے جلدی جلدی بیوی کی آنکھیں بچا کر  
 محبوبہ سے آنکھ ملائی۔ ایک خاموش بدعبر مسکراہٹ نے جواب دیا: ”بائی بائی“  
 بعد میں بیوی نے مجھے بتایا کہ ان لوگوں کا تبادلہ کانپور ہو گیا ہے اور کل جا رہا  
 ہیں۔ عجیب محبوبہ ہے۔ اتنی جلدی بائی بائی کرتا تھا تو مسکرا کر کہوں دیکھا تھا ابھی  
 تو خاموش سپارگشت کی منزل میں تھا۔ لیوں کو جنبش تک نہ ہوئی تھی۔ محبت کے دو  
 بولوں کا تبادلہ تک نہ ہوا تھا۔ اور تم چلی گئیں، اتنا مختصر پیار! اس سے پہلے کہ میں

جبرائیل اظہار کروں، انداز گفتا سچوں، تم باہیں چھوڑ کر بھاگ گئیں !  
اب تو ڈائری لکھنے میں ملوث آئے لگا تھا۔ اب کیا ڈائری ڈائری لکھنے کا  
سوچ رہا ہوں ڈائری کے باقی صفحے میں بیرون ٹھیکہ گاہ کو لٹا دوں۔ اس پیار میں میرے  
دونوں نقصان ہوئے۔ ایک تو دل ٹوٹ گیا اور دوسرے دلی کا ڈبہ بگم ہو گیا۔

۱۴ مئی ۱۹۷۰ء

آج صبح ریشمیں زلفوں والی محبوبہ اپنی فیملی کے ساتھ شکیبیہ پر سوار ہو کر روانہ  
ہو گئی۔ میں نے عینک لگا کر اس کی طرف دیکھا۔ میرا خیال ہے وہ اداس ممتھی میری  
عینک بہترین کوالٹی کی ہے، جھوٹ نہیں بولتی۔

میں نے آج اس کے سیر میں تھپنے کے لئے دفتر سے چھٹی لے لی۔ اس کے جانے  
کے بعد بہت کچھ آیا کہ اس سے کانپور کا ایڈریس ہی پوچھ لیتا۔ میرا سب کچھ چھپا کر  
لے گئی۔ کم از کم اس کا ایڈریس تو میرے پاس رہ جاتا۔ سارا دن اپنی اس بے وقوفی  
اور محبوبہ کے مستقبل پر اہیں بھرتا رہا۔ آہیں بھرنے کے دوران میرا جلا سا لٹا گیا۔ اس  
کے ساتھ انتہائی لغو اور بے معنی باتیں کرتا رہا۔ وہ اپنی بہن کو چند دن کے لئے لینے آیا  
تھا۔ سب نے بخوشی اجازت دیدی نیچے اپنے انکل کو دیکھ کر مجھے بھول گئے۔ ایک تو محبوبہ  
کا بھرا اور اب بیوی کا بھرا۔ ایک میں آہیں ہیں دوسرے میں حسرت ہے۔ اس وقت  
بیوی نیچے میرے سارے صاحب کے ساتھ سٹیا دیکھنے کے لئے گئے ہوئے ہیں۔ اور میں  
گھر میں تنہا ہوں۔ یہ ڈائری لکھ رہا ہوں۔ بار بار رنگا ہیں اس محبت کی طرف اٹھ جاتی  
ہیں۔ جہاں کہیں زلفیں لہرایا کرتی تھیں آج ایک گواہ بن گیا کالمیں کا میں کر رہا ہے۔

اور میں سوچ رہا ہوں اب جبکہ دھماکے کے امکانات تاریک ہو گئے ہیں اپنے  
آپ کو مصروف رکھنے کے لئے کوئی اور شغل اختیار کر لوں۔ رشوت کا کام ہی شروع  
کر دوں۔ محبت نہ سہی رشوت ہی سہی۔ دل دھماکے کے لئے کوئی سہنگامہ نور ہوا ہی چاہئے

آج مندرجہ ذیل کارہائے نمایاں سرانجام دئے۔

- ۱۔ گھر کی چار پائیزوں کی دودھیں کس دیں۔
- ۲۔ راشن کارڈ کی تجدید کروائی اور گھر کے پانچ افراد کی بجائے چھ افراد لکھوائے۔
- ۳۔ ہلیک میں بناسیتی گئی کا ایک ڈبہ خرید لیا۔
- ۴۔ دفتر سے شیشری چرائی۔ بچوں کے کام آئے گی۔
- ۵۔ ایک دوست سے دس روپے ادھار لئے۔ کیونکہ تنخواہ ختم ہو چکی تھی۔ دس روپے لوٹانے کا ارادہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس دوست نے دو سال پہلے مجھ سے پانچ روپے ادھار لئے تھے۔ لیکن ابھی تک نہیں لوٹائے تھے۔
- ۶۔ بیوی کو اس کے میکے میں ارجنٹ خط لکھا کہ اسے لوئیر سمجھ کر جدیدی لوٹ آؤ۔ تمھارے بھرتے مجھے دو کوڑی کا نہیں رہا۔
- ۷۔ اپنے ایک ساتھی کلرک کے خلاف بڑے صاحب کو چھٹی لکھی کہ وہ ہر روز دفتر آکر صرف حاضری لگاتا ہے اور بھر بھاگ جاتا ہے تحقیق کی جائے۔ اس چھٹی کے نتیجے میں نام نہیں لکھا۔ اس کلرک نے بھی میری شیشری چرائے کی رپورٹ کر دی تھی۔
- ۸۔ گھر لوٹے وقت بس پر سوار ہوا۔ رشتہ زیادہ تھا اس لئے میں نے کنٹرکٹر سے شکایت نامہ سب نہ بھیجا۔
- ۹۔ فروٹ مشاپ پر اگر بھلیوں کا ریٹ پوچھا، خریدے نہیں کیونکہ حسب سابق بے حد پیچھے تھے۔ گھر آکر ایک "لیٹرڈ، ایڈیٹر لکھا کہ منہ گائی نے ہم کلروں کی کمر توڑ دی ہے۔
- ۱۰۔ ایک بی بی کو مارا جی بیوی کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر دودھ پینا چاہتی

کئی ایک ڈنڈا پی کے بجائے دودھ کی کڑا حانی کرجا لگا۔ دودھ والٹ  
گیا۔ رنکلی کے کام آیا نہ میرے۔ میں اور پی دودھ بہت دیر تک کھتے  
افسوس ملے تر ہے۔

۲۵ مئی ۱۹۷۰ء

کل سے اہلیہ محترمہ تشریف لے آئی ہیں۔ کہتے ہی انہوں نے دوا اہم سنائی  
خیز خبریں سنائیں۔ ایک یہ کہ بڑا بر خوردار عزیز از جان امیش چندرجا کھیتے ہوئے  
پوس کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا تھا۔ بہت مشکل سے مانا جی کے صوف کی بدولت  
معافی مانگ کر رہ کر یا گیا اور دوسری خبر یہ کہ پانچویں عزیز از جان کی ڈیویری کا  
وقت قریب آپہنچا ہے۔ لہذا باادب با ملاحظہ ہو شیار!

میں نے بیوی سے دست بستہ عرض کی کہ جہاں تک جوئے کے کس کا تعلق ہے  
وہ شہدیاں سے ورثے میں عنایت ہوا ہے۔ سنا ہے بر خوردار کے ناتا بھی بالکل  
اسی عمر میں جرا کھیتے ہوئے حوالہ است، تشریف لے گئے تھے۔ اس لئے تاریخ اپنے  
آپ کو دہرا رہی ہے۔

اور پانچویں بر خوردار کی ڈیویری کے سلسلے میں عرض یہ ہے کہ فیملی پلاننگ  
کے اصول توڑنے کا یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ ہمارے وطن سے جوئے باز پیدا ہو رہا  
ہیں جس سے دلش کا مستقبل خطرے میں پڑ رہا ہے۔ اس لئے ہر صبح بیدار ہوتے  
ہی چوک میں ٹنگنی ہوئی فیملی پلاننگ کی لال ٹکون کی طرف دیکھا کرو۔ متوجہ جانے  
کی بجائے لال ٹکون کی طرف دیکھنا زیادہ مفید ہے۔

ان دونوں سوالوں پر بیوی سے ان میں ہو گئی ہے۔ آج رات کا کھانا  
نہیں بچا یا گیا۔ کھانا نہ کھانے سے میری آکٹا ٹری شفا ت ہو گئی ہے۔ اور میں  
گوتم بدھ کی طرح آج رات کو نروان کی تلاش میں کھاگ جانا چاہتا ہوں،



افسوس کہ میں گوتم بدھ نہیں سکا۔ کیونکہ فرار کی اس رات کو اچانک میری آنکھ لگ گئی اور صبح اس وقت کھلی جب میری بیوی سیرے پلنگ کے پاس چائے کا گرم گرم کپ لے کھڑی تھی۔ اس نے رو کر مجھ سے معافی مانگی جو میں نے سٹاکا کر دی اور پھر ہم دونوں نے ایک دوسرے کو سمجھایا کہ ہم دونوں زندگی کی گاڑی کے دو پیٹے ہیں۔ اس نے الگ نہیں ہو سکتے۔ رکھی سوکھی کھا لیں گے۔ لیکن دنیا کے سامنے رسوا نہ ہوں گے۔ ہمارا مطلب یقیناً یہی تھا کہ ہم اپنی ہی نگاہوں میں رسوا ہوتے رہیں تو کوئی ہرج نہیں جیسا نصیب میں کلر کی لکھی ہے تو پھر کیا گوتم بدھ اور کسی غارتہ جنگی؟

گوتم بدھ نے آج دو روپے رشوت لی اور بچوں کے لئے خربوزے اور فالے خرید لایا۔

کل یہیں تنخواہ ملی تھی۔ تنخواہ سے زیادہ مسرت انگیز چیز یہ تھی کہ نئے گریڈ مقرر ہو جانے کے بعد گزشتہ ایک سال کا "ایرنز" (بقایا) کا روپیہ مل گیا۔ میں نے بیوی کو چھپ چھپ کر ایک نئی ساڑھی لے دی جسے پہن کر وہ یوں معلوم ہوتی تھی جیسے پہلی رات کی دہلی ہے! بے اختیار جی چاہا، مٹی مرنے مٹانے کے لئے ہل اسٹیشن پر چلا جاؤں لیکن بیوی نے سمجھایا کہ آئندہ سال چائیں گے۔ اس سال تو ڈیپوری ۹۹...

# لغات فکری

الیکشن — ایک دنگل جو ووٹروں اور بیڈروں کے درمیان ہوتا ہے اور جس میں بیڈر جیت جاتے ہیں ووٹر ہار جاتے ہیں۔

الیکشن پیپیشن — ایک کھبا جسے ہار ہی ہوئی اپنی نوچتی ہے

ووٹ — چوڑھا کے پر، جو برسات کے موسم میں نکل آتے ہیں۔

ووٹر — آنکھ سے گر کر مٹی میں رلا ہوا آنسو جسے الیکشن کے دوران موتی سمجھ کر اٹھا لیا جاتا ہے اور الیکشن کے بعد پور مٹی میں ملا دیا جاتا ہے۔

ووٹوں بسٹ جو ہر کی دکان پر ملکی ہوئی موتیوں کی لڑیاں۔

اصبدا اس — بڑے بڑے عقلمندوں کو بھی بے وقوف بنانے والا عقلمند

زر ضمانت — کمزریں میں پھینکی ہوئی رقم، جو اکثر ڈوب جاتی ہے۔

انتخابی جلسہ — ایک طہنورہ جس پر بے سرے گائے گائے جاتے ہیں۔

چنا ویدیتی نیٹو جس میں بعد میں توڑنے کے لئے وعدے کئے جاتے ہیں۔

انتخابی تقریر — الیکشن کے جنگل میں گیڈڑوں کا نغمہ کہ میرا باپ بادشاہ تھا۔

انتخابی حینڈلے رنگارنگ پتنگوں کی دکان

انتخابی پوسٹر امیدوار کا شجرہ نسب اس کے خاندان کی مکمل تاریخ۔

ڈورڈوڈو کنوینٹ ڈورڈو کی خاک چھانٹنے کا شوق۔

پولنگ ایجنٹ ۔ امیدوار کا چچ

بوگس ووٹ ۔ ایک جھوٹ، جو سچے آدمی الیکشن کے دنوں میں برتے ہیں۔

ایکشن کا خرچہ جوئے پر لگائی ہوئی نقدی

جناؤ کے نتائج لڑائی ختم ہونے کے بعد میدان جنگ میں گنتی کا عمل کر (۱)

کتنے ڈھیر ہوئے ۔ (۲) کتنے دھن ہوئے (۳) کتنے بج نکلے

محبوبہ ۔ ایک قسم کی غیر قانونی بیوی

بیوی ۔ محبوبہ کا انجام

بائیسیکل ۔ کلرک یا لوگ دوسری بیوی

کلرک ۔ ایک گیڈر جو شیر کا جامہ پہن کر کرسی پر بیٹھتا ہے ۔

خدا : ۔ وہم اور حقیقت کے درمیان ڈولتا ہوا اینڈولم

عشق : ۔ ایک معزز قیدی جسے جیل میں ہمیشہ اے کا اس ملتی ہے

کاغذ : ۔ کوڑا تو بے فز رکھا جائے تو ضرور رساں ۔

جس ورتکاری ۔ عزت حاصل کرنے سے پہلے عزت کا تجربہ

کمر لپٹن : ۔ ایک زہر جیسے شہید کی طرح مزے لے لے کر چاٹا جاتا ہے ۔

سیاست : ۔ پیسے والوں کی عیاسی اور بن پیسے والوں کے گلے کا دھوکا ۔

بیوی : ۔ ایک لطیفہ جو بار بار دہرانے سے باسی ہو جاتا ہے ۔

سچائی : ۔ ایک چور جو ڈر کے مارے باہر نہیں نکلتا ۔

جھوٹ : ۔ ایک بھول جو دیکھنے میں حسین ہے، کھانے میں لذیذ ہے، لیکن

جسے سہم کرنا مشکل ہے ۔

جہڑوس بیت : ۔ ایک مندر جہاں بے گت لوگ چڑھاوا چڑھاتے ہیں، اور

پجاری کھا جاتے ہیں ۔

عشق : — خود گشتی کرنے سے پہلے کی حالت ۔

غریبی : — ایک کھوکھل جس میں امیر لوگ پیسے جمعیت کر اپنے گناہوں کی  
فندا دکم کرتے ہیں ۔

شاعر : — ایک پزندہ جو عمر بھر اپنا گم شدہ آشیاں ڈھونڈتا رہتا ہے ۔

لیڈر : — دوسروں کے کھیت میں اپنا بیج ڈا کر فصل اگانے اور بچے  
کھانے والا ۔

قبرستان : — مردہ انسانوں کا حال ، زندہ انسانوں کا مستقبل ۔

اصیل : — ایک پھول جو کبھی بیج زمینی کو زرخیز نہ دیتا ہے ۔ اور کبھی زرخیز  
زمین کو بخر ۔

خوشامد : — کمزور کی طاقت اور طاقت ور کی کمزوری ۔

ٹی ہٹائی : — صرف جسم ہی جسم ۔ روح غائب ۔

مشافقت : — ایک عینک جسے اندھے لگاتے ہیں ۔

تعلیم : — ان پڑھ لوگوں کو بے وقوف بنانے کا ہتھیار ۔

بھادرا : — آگ کو پانی سمجھ کر پی جانے والا کم علم

اندھیرا : — شیطان کا گھر جسے خدا اپنے ہاتھ سے تعمیر کرتا ہے ۔

دسونی گھر : — گرمی عزتوں کی راجدھانی ۔

گرمستی عورت : — گرمی مرد کی گاڑی کا پٹرول پمپ

جھل : — جھونپڑی کے مقابلے پر کھینچی ہوئی بڑی لکیر

طالب علم : — ایک پیاسے سمندر میں دھکا دے دیا جاتا ہے اور وہ

عمر بھر ڈکیاں کھاتا رہتا ہے ۔

جیب کترا : — ایک شرارتی چمپو کرا جو دوسروں کی بائسککل میں پن چھو کر

اس کی ہوا نکال دیتا ہے اور مبالغہ جاتا ہے ۔

سٹرک : — ایک راستہ جو جنت کو بھی جاتا ہے اور جہنم کو بھی ۔

جنت : — ایک خراب

جہنم : — اس خراب کی تعبیر

پیسہ : — ایک چھپکلی جو انسان کے منہ میں آگئی ہے ۔ اور اب اسے

کھائے تو کوڑھی ۔ چھوڑے تو کلنگی ۔

دس یا : — جس کے کنارے گھر بناؤ تو اسے جوڑ آجاتا ہے ۔ اور گھر کو بہا

ے جاتا ہے ۔ لیکن اگر اس میں ڈوبنے کے لئے جاؤ تو ہمیشہ

سوکھا ملتا ہے ۔

خود کشی : — جائز چیز کا ناجائز استعمال

حکمرانی : — جس پر بیٹھ کر عقل مندا می بے وقوف ہوا جاتا ہے

نیکی : — جسے پہلے زمانے میں لوگ دریا میں ڈال دیتے تھے ۔ آج کل

منڈی میں برائے فروخت بھیگا دیتے ہیں ۔

اخبار : — ایک پھل جو تسکین کے لئے کھایا جاتا ہے ۔ مگر کھاتے ہی

بے چینی پیدا کر دیتا ہے ۔

سیکس : — رات کا شہنشاہ ۔ صبح کا فقیر ۔

طوائف : — ڈسپوزل کا مال جسے اونے پونے دام پر بیلا م کر کے بیچ

دیا جاتا ہے اور بڑبڑہ چڑھ کر بولی دے کر دوبارہ خرید لیا

جاتا ہے ۔

خدا : — انسان کی وہ کمزوری جس سے وہ طاقت حاصل کرتا ہے ۔

دوست : — دشمنی سے پہلے کی ایک منزل ۔

دشمن : — دوستی کا انجام  
 صہمان : — جس کے آنے پر خوشی اور جانے پر اذریادہ خوشی ہوتی ہے  
 ڈاکٹر : — جرمیاریوں سے ہنس ہنس کر بانٹنی کرتا ہے مگر تندرستوں  
 کو دیکھ کر مست پھر لیتا ہے ۔

حج : — انصاف کرنے میں آزاد مگر قانون کا غلام  
 گواہ : — جھوٹ اور سچ کے درمیان ٹکنا ہوا پنڈولم  
 یاد : — پُرکھوں کا چھوڑا ہوا پرانا بھی کھانا  
 کوشش : — دھیرے میں تیر چلانا ۔ لگ جائے تو واہ واہ ! چرک جائے  
 تو واہ واہ !

اندھیرا : — بھلی کمپنی کا سرورد  
 بھلی : — چوروں کا سرورد  
 چوس : — ایک جیب کا مال دوسری جیب میں مفتقل کرنے والا کاشٹ  
 حادثہ انسان : — جو اپنے سے پہلے زمانے کے ماڈرن کو پرانا کہے ۔  
 خوسالہ : — جو حیوان کو انسان اور انسان کو حیوان بنا دیتی ہے ۔  
 انجان : — جو وہ چیزیں نہ جانتا ہو جنہیں جانتے سے دکھ پیدا ہوتے ہیں  
 استاد : — بیوقوفوں کو عقل مند بنا کر اپنے دشمن بنانے والا بے وقوف  
 کوٹا کھڑکتا : — استعمال شدہ چیزوں کا جنازہ  
 جنازہ : — واپسی ٹکٹ  
 بیل : — گائے کا بھایا ہوا خاوند  
 لنگڑا : — دو پاؤں والوں سے زیادہ خطرناک  
 کمزوری : — ایک مردہ جس پر زندہ لوگ حملہ کر دیتے ہیں اور بڑے خوش

ہوتے ہیں۔

- سرنال کا : - مردوں کے چھوڑے ہوئے تخت پر بیٹھنے والا حکمران
- قنق : - آنکھوں والوں کی اندھی حرکت۔
- صکان : - چڑیوں ہکیوں اور سانپوں کا مشترکہ ایک رہیں پیرا۔
- مفلس : - جو اگر موجود ہو تو قابل دولت خود کشتی کر لیں۔
- خود کشتی : - چور کی جانے لڑ کشتی بھائی، لفظ کم ہو جائے۔
- لفظ : - جرم سے ادا ہو جائے تو ہر جنگ چھڑ جائے، ادا نہ ہو سکے تو اندر جنگ چھڑ جائے۔
- ہریض : - جس کے بل بوتے پر دنیا بھر کی میڈیکل کمپنیاں چلتی ہیں۔
- قبرستان : - لاشوں کی سوشلسٹ سٹیٹ
- ساروح : - محمد پیچ کی مفروضہ کمر۔ جس کے متعلق ایک شاعر نے کہا تھا :  
کہاں ہے، کس طرف کو ہے، کدھر ہے
- شاعر : - اندھیرے میں ٹپکتا ہوا ایک چراغ۔
- بد صورت عورت : - حسیاؤں کو پرکھنے کا آلہ۔
- آدم : - خدا کی وہ غلطی جس کی وہ آج تک تصحیح نہیں کر سکا۔
- غلطی : - معاف کر دینے والوں کے لئے ایک مادر موقع۔
- صوق : - جس سے ہمیشہ عقل مند لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں، اور پیر تو لوگ یہ سوچ کر مال جاتے ہیں کہ یہ ہماری شان کے شایاں نہیں۔
- بے وقوف : - دنیا کی بڑی بڑی سلطنتیں بے وقوفوں نے قائم کی ہیں اور عقل مندوں نے اجاڑی ہیں۔

- عوام :- چرپال پر رکھا ہوا ایک حقہ جسے ہر راغبیر آکر پیتا ہے ۔
- سرمایہ دار :- دوسروں کی کترتوں سے اپنے لئے پتلون تیار کرتے والا
- ایک ماہر ٹیلیو ماسٹر ۔
- امن :- وحشی لوگوں کی نیند کا زمانہ ۔
- بوڑھے :- دیوالیہ دکان کے باہر ٹکا ہوا پرانا سائیکل بورڈ ۔
- بکری :- جس کی عقل زیادہ ہے دودھ کم
- بیوی :- مجبور کی بیگمٹی ہوئی مشکل ۔
- سہتے دار :- ایک رسی جڑوٹ کر بھی سر پر ٹنگتی رہتی ہے ۔
- ننگا :- ٹیکسٹائل ملوں کا مذاق اڑانے والا ۔
- مقرض :- ایک شہنشاہ ، جو دوسروں کی کمائی پر عیش کرتا ہے ۔
- قرض خواہ :- جو قرض دیتے وقت دوست اور قرض واپس لیتے وقت دشمن
- دھلی :- جہاں مکان بڑے ہیں انسان چھوٹے ہیں ۔
- بھینٹ :- ایک مندر جہاں سے بھگوان نکل گیا ہے ۔
- کلکتہ :- جہاں کے لوگ دن کو ایک دوسرے سے لڑتے ہیں ۔ رات
- کو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر گاتے بجاتے ہیں ۔
- حکومت :- کانٹوں کا آج جسے ہر گنجا پہننا چاہتا ہے ۔
- عقل :- محبت اور غلوں کا قبرستان ۔
- بے وقوفی :- ایک خزانہ جو کبھی غالی نہیں ہوتا ۔
- پیاد :- عشق کا انجام ، بچوں کا آغاز
- بچے :- ماں باپ کے پیدا کئے ہوئے ماں باپ ۔
- ماں باپ :- بیک وقت بچوں کے حاکم اور بچوں کے غلام ۔



دل :- ایک قبر جس کے نیچے اکثر زندہ مردے دفن کر دیے جاتے ہیں  
 دماغ :- شیطان اور خدا دونوں کا مشترکہ گھر۔  
 آنکھیں :- جو باہر سے بند ہو جائیں تو اندر کی طرف کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔

ہاتھ :- جو بھیک دیتا ہے، لیتا نہیں ہے۔  
 پاؤں :- جو دوسروں کو ٹھوکر مارتا ہے۔ خود ٹھوکر کھاتا ہے۔

سود :- دوسروں کا بھلا کرنے کے لئے ایک برائی۔  
 بے وفا :- ایک طوطا جسے پستہ کھلایا جائے تو تعریف کرتا رہتا ہے، نہ کھلاتا جائے تو آنکھیں پھیر لیتا ہے۔

وفادار :- بغیر پستہ کھائے تعریف کرنے والا جاہل طوطا  
 خوش قسمت :- ایک لالچوں جو جس کے ہاتھ لگ جائے، اسی کی ہو جاتی ہے  
 خاسن آئینہ جینچ :- ایک چھپتی جو سمندر کو خالی کرنے کی کوشش میں لگی رہتی ہے۔  
 بد لیتی قرصہ :- ایک ڈائن جو بچے پیدا کرتی ہے، انہیں کھلاتی اور پاتی  
 پوسٹا ہے۔ اور پھر خود ہی انہیں کھا جاتی ہے۔

راشن :- بھوکے پیٹ کے لئے بڑھئی دور کرنے کا چورنی۔

ٹیڈی بوائے :- جو ساڑھی پہن کر مجرباؤں کے دل جیتے۔

ہل اسٹیشن :- صحت مند مرلینوں کا ہسپتال۔

لوہاری :- ایک چاکر، جو ہل اسٹیشن پر نہ جانے کے جرم میں لگایا جاتا

# عرقِ انفعال

گھلتا کسی پکیوں مرے دل کا معادہ  
اپنے ہی انتخاب نے رسوا کیا مجھے

# کر وڑپتی بن جاؤ گے

”تم جلد ہی کر وڑپتی بن جاؤ گے“

۱۹۳۸ء میں آج سے ۲۵ برس پہلے میں نے ریفقزہ ایک مشہور جنتری میں پڑھا تھا۔ جنتری کا نام پرسدہ گھمنڈی جنتری تھا جسے ملک کے مشہور و معروف جیو قسٹی نیڈرٹ گھمنڈی دیال جی شائع کرتے تھے اور صرف اس لئے شائع کرتے تھے کہ ان کے والد صاحب قبلہ نیڈرٹ پاکھمنڈی دیال جی کبھی ہر سال جنتری ہی شائع کرتے تھے۔

اور انھیں نیڈرٹ گھمنڈی دیال جی نے ۱۹۳۸ء کی پرسدہ گھمنڈی جنتری میں میری قسمت کا حال لکھتے ہوئے پیش گوئی کی تھی کہ ”تم جلد ہی کر وڑپتی بن جاؤ گے“، چنانچہ پورے پچیس سال تک میں نے کر وڑپتی بننے کا انتظار کیا لیکن میری بجائے جب سوسائٹی کے دوسرے رذیل اثر وادی اُصفت آدمی کر وڑپتی بننے لگے تو میں طیش میں آ گیا اور فیصلہ کیا کہ گھمنڈی لال کے علم جیوتش کے خلاف ایک

میر دست مضمون لکھ ڈالوں۔

اور اس مضمون کے سلسلے میں مجھے ۱۹۳۸ء کی تلاش میں، شہر کے مشہور کباڑی بازار میں چہا گیا۔ ہمارے شہر کے اس کباڑی بازار کی منفرد خصوصیت یہ ہے کہ یہاں قدیم سے قدیم اشیاء بھی بالکل نئی حالت میں مل جاتی ہیں اور پھر یہاں کے کباڑیوں کے پاس دنیا کی ہر نایاب اور نادر چیز موجود رہتی ہے مثلاً ایک دوست نے مجھ پر عجیب و غریب انکشاف کیا تھا کہ جاپان سے انھوں نے ایک تخت خرید لیا تھا جس پر سکندر اعظم بیٹھا کرتا تھا۔ لیکن بالکل دلیا تخت سندوستان کے لئے کباڑی بازار میں بھی اسے دکھایا گیا۔ جس پر سکندر بیٹھ کر حکومت کرتا تھا۔ غرض یہ کباڑی بازار نادر اوقات دنیا سے بھرا پڑا تھا۔ یہاں وہ ترکش بھی موجود تھا جس سے ارجن نے ہما بھارت کی جنگ لڑی تھی، وہ کوزہ بھی تھا سے محمد بن قاسم پالی بیا کرتا تھا۔ وہ بھی تھا تو بھی تھا جس میں ہیو بقال اپنی فوج کا حساب کتاب لکھا کرتا تھا۔ اس کباڑی بازار میں ایسی انسانی کھوپڑی بھی دستیاب ہو جاتی تھی جسے ایک کباڑی بکر باجیت کی کھوپڑی کہہ کر بیچتا تھا۔ دوسرے کباڑی اسے علامہ الدین غلجی کی کھوپڑی کے طور پر فروخت کرتا تھا۔ اس کباڑی بازار کے متعلق ایک لطیفہ بہت مشہور تھا کہ ایک بار ایک بوڑھا آدمی ایک کباڑی کی دکان پر پہنچا اور بولا "کیا آپ کے پاس مہاراجہ رنجیت سنگھ کی کھوپڑی موجود ہے؟" کباڑی نے بڑے کاروباری تغیر کے ساتھ کہا "کیوں نہیں۔ ابھی مانتے کرتا ہوں۔" چنانچہ اندر جا کر وہ ایک کھوپڑی اٹھالایا۔ بوڑھے کھوپڑی کو غور سے دیکھ کر کہا "ساعت کیجیے میں نے خود مہاراجہ رنجیت سنگھ کو دیکھا تھا۔ ان کا سر بہت بڑا تھا مگر یہ تو چھوٹا سا سر ہے؟" کباڑی نے جواب دیا۔ "جواب دیا۔ خیاب یہ ان کے بچپن کی کھوپڑی ہے۔"

چنانچہ ایسے عالمگیر قسم کے کباڑی بازار میں کوئی دھج نہیں کھنی کر مجھے بچپن  
سال پہلے کی پرسدہ گھنڈی جنتری دستیاب نہ ہوئی۔

اس کباڑی بازار کی دکانیں چربی کھوکھوں کی بنی ہوئی تھیں۔ شکستہ اور  
میلے کھیلے کھوکھوں کی یہ قطار دور سے یوں دکھائی دیتی تھی جیسے کسی شیم خانے میں  
بیتریوں کی فہرست لٹکی ہوئی ہو۔

میں نے یہ فہرست ساری کی ساری دیکھ ڈالی، مگر جنتری نہ مل سکتی نہ ملی  
کباڑی بازار کی آخری دکان سے حبیب میں مایوس ہو کر لوٹ رہا تھا تو کباڑیے  
نے میرا کندھا پکڑ کر کہا: ”جناب اگر جنتری نہیں ملی تو نہ سہی کچھ اور لے جا رہے  
مگر میری دکان سے خالی ہفت منٹ لوٹے۔ میری ہاں جنتری سے زیادہ  
نادر چیزیں موجود ہیں۔“

”مثلاً...؟“ میں نے جمل بوجھ کر کہا۔

”مثلاً...“ کباڑیے نے ایک لڑنے پھوٹے گراموفون پر رکھا ہوا ایک  
میلا کچھلا پنیل کا چراغ دکھاتے ہوئے کہا۔ ”چراغ نے جائے یہ ایک تاریخی  
چراغ ہے، شہنشاہ اکبر اس کی روشنی میں بیٹھ کر مظاہر کیا کرتے تھے۔“  
کچھ ہنسنے ہوئے اور کچھ روئے ہوئے میں نے عرض کیا: ”مگر جناب سات  
کچھ شہنشاہ اکبر تو ان دنوں مرچے۔“

”تو پھر یہ اکبر نہیں ہوگا شاہ جہاں ہوگا۔ کباڑیے نے کاروباری وقار کی  
قاطر اپنی غلطی کی فوراً تصحیح کر ڈالی۔

اگرچہ جنتری کی بجائے چراغ لے جانے میں کوئی ٹک نہ نہیں تھا لیکن مجھ جیسے  
میں چراغ مجھے پسند آگیا۔ جیسے انسان کو کچھ چیزیں خواہ پند آجانی ہیں جیسے شادی

سے پہلے ایک لڑکی مجھے خواہ مخواہ پسند آگئی تھی، جو بعد میں میری بیوی بن گئی اور عمریکہ کے کچھ پیارے کامیاب دوست بنی۔

میں نے اس کا باڈی سے اس چراغ کی قیمت پوچھی اور اس نے شاید یہ سمجھ کر کہ میں کوئی ریسرچ اسکالر ہوں، "بمقابل ریاست میں چراغوں کا رول" پر ایک تھیسس لکھ رہا ہوں، چراغ کی قیمت پچاس روپے بتادی، لیکن جب اکبر بادشاہ سے بچے اور شہزادہ جہاں سے بھی بچے گزرتے پڑتی آخر میں بادشاہ تک چراغ کی بات پہنچی تو قیمت گر کر پچاس روپے سے پچاس پیسے تک آ پہنچی اور سوداٹے ہو گیا۔

میری بیوی نے چراغ کا استقبال بڑی سر دھری سے کیا۔ بالکل ایسے اچھے وہ ہر شام میرا استقبال کیا کرتی تھی، چراغ دیکھ کر اس نے طعنہ دیا کہ تمہارا انتخاب ہمیشہ غلط ہوتا ہے تم زندگی میں کبھی کوئی صحیح چیز گھر نہیں لا گئے۔ میں نے کہا: میں تمہیں گھر لایا ہوں، ہندوستان کی کروڑوں عورتوں میں سے منتخب کر کے، کیا میرا یہ انتخاب غلط تھا؟

بیوی کے لئے اس کی نزدیک مشکل تھی۔ (اگرچہ ناممکن نہیں تھی) اور پھر اس نے اس چراغ میں ایک عجیب خونی ڈھونڈ نکالی کہ ایک کمر سپلائی کمپن کی ڈالافٹ کی وجہ سے جب کبھی بجلی ختم ہو جائے گی تو اس بحران میں یہ چراغ بڑا سودمند رہے گا۔

اس خونی کو دریافت کرنے کی دیر لگتی کہ بیوی کو ایک دم جیسے چراغ سے محبت ہو گئی اس نے اعلان کیا کہ میں اسے ابھی مانچر کر شیٹے کی طرح چمکا دیتی ہوں۔ میری بیوی کو سکھڑا پے کا مرض لاحق ہے، بلکہ اس کے میکے والے

دنیا بیوی پر پگنڈہ کرتے پھرتے تھے کہ ہم نے ایک سٹریٹی ایک نالائق آدمی سے بیاہ دیا اور نہ اس نالائق غاوند کا گھر آج تک نیلام ہو چکا تھا۔ (اور یہ بات پر پگنڈہ کے باوجود صحیح تھی)

مگر جوں ہی بیوی نے آنکھیں میں جا کر اپوں کی راکھ سے شہنشاہ اکبر کے اس چراغ کو دگر دینا شروع کیا، ادب تک ایک دسہنتاک سادھا کہہ دیا اور آنکھیں کی زمین بھٹی۔ زمیں سے دھوئی کا ایک طوفان اٹھا اور اس دھوئی میں سے تقریباً پندرہ فٹ لمبا ساڑھے سات فٹ چھرا ایک خرغٹا نگر میپ صدرت دیو نمودار ہوا۔ اور گرج گرج کر بولا۔

”اے اللہ دین! میں تیرا غلام ہوں! بنا: میرے لئے کیا حکم ہے؟“

میں اس وقت برآمدہ میں ایک آئینہ کے سامنے کھڑا اپنی ڈاڑھی کے چند تازہ تازہ سفید بال گن رہا تھا۔ دھماکے اور دھوئی سے گھبرا کر میں اپنی اکلوتی بیوی کی طرف دوڑا، جو اس وقت تک دو تین گز دور جا پڑی تھی۔ اور کراہ رہی تھی۔ اور دیو اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ بچ مانئے تو اتنے بڑے گستاخ دیو کو دلچہ کر میرے اپنے ہاتھ پاؤں پھیل گئے تھے۔ لیکن اس خیال سے بیاہ کے وقت میں نے سات پیرے لئے تھے اور ہر پیرے میں بیوی کی حفاظت کا عہد کیا تھا۔ — لپک کر بیوی کو اٹھایا اور دیو کی آنکھ بچا کر دیو سے کہا۔

”اے کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟“

دیو بدستور ہاتھ جوڑے ہوئے گرج گرج بولا۔

”میں اللہ دین چرنخ کا دیو ہوں اور یہ عورت اللہ دین ہے اور میں اس کا غلام

ہوں۔“

”مساف کیجئے، یہ تو شبلا ہے اللہ دین نہیں ہے۔ اللہ دین کہہ کر کا گھر اگلے

چوک پر ہے۔ آپ غلطی سے اللہ دین کی بجائے شیلا کے گھر آ گئے ہیں۔  
دوڑنے میزنی تشریح کو کلفتیاد کرتے ہوئے کہا۔

”میں نہیں جانتا جس انسان کے پاس یہ چراغ ہو گا وہ اللہ دین ہو گا۔ اس نے  
یہ محرومت کبھی اللہ دین ہے۔ اس نے مجھے بلایا ہے۔ اور یہ مجھے جو حکم دے گی میں  
اس کی تعمیل کروں گا۔“

حکم دینے والے اللہ دین کی گھنگھی بندہ چپقلی اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا  
اور وہ مارے خوف کے مجھ سے یوں چٹ گئی جیسے کسی غلطی پر سڑک کوئی محبوبہ  
اپنے عاشق سے چٹتی ہوئی ہو۔ مجھے فوری خطرہ یہ لاحق ہو رہا تھا کہ کہیں میرے  
بچوں کی اس واحد ماں کا ہارٹ فیل نہ ہو جائے کیونکہ وہ گزشتہ پانچ برس  
سے ضعف قلب کا شکار تھیں اور ڈاکٹر کا آخری بل ادا کئے ہوئے ابھی جو میں  
گھنٹے پہلے نہیں گزرے تھے۔

بیوی کے ہارٹ فیل ہونے کے احساس سے میرا اپنا ہارٹ دھڑکنے لگا کہ میری  
بیوی کے پیوہ ہونے میں صرف ایک آدھ منٹ کی کسر باقی ہے۔ مگر نہ جانے  
میری بیوی نے کوئی اچھے کرموں کا پھل تھا کہ میں نے اپنے آپ کو فوراً سنبھال  
لا اور کہا۔

”جائزہ تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ ڈاکٹر شامتی پر کاش گولڈ میڈلسٹ  
کو بلا لاؤ۔“

مگر دیوش سے مس نہ ہوا۔ جا بھڑا رہا۔

”جاؤ۔ جانے کیوں نہیں اے غلامِ نمک حرام با۔“  
نمک حرام نے دھمکی دی۔

”جس کے پاس چراغ ہے میں صرف اسی کا حکم مانوں گا۔ تم کون ہوتے



ہو حکم دینے والے؟

دیو کی سمجھائی کم شعوری پر مجھے سمجھتے انسوس ہوا۔ اس کم بخت کو اتنا بھی معلوم نہیں، کہ تم جس کے غلام ہو وہ خود میری غلام ہے۔ جب دو میرا حکم مان لیتی ہے تو تم کیوں نہیں مانتے۔ لیکن صورتِ حالات چونکہ انتہائی نازک تھی اور مشکل رشتوں پر بحث و مباحثہ سے میرا اور بیوی کا رشتہ ٹوٹ جائے گا خطرہ تھا اس لئے میں نے فوراً بیوی کے ہاتھ سے چراغ چھین کر اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کہا۔

”اب میں اللہ دین ہوں۔ چراغ میرے پاس ہے۔“

مگر دیو شاید کچھ با اصول واقع ہوا تھا بڑے وقت رہو میں بولا۔

”پہلا حکم پہلے اللہ دین کا۔ دوسرے اللہ دین کا حکم بعد میں۔۔۔۔۔“

مجبور ہو کر میں اللہ دین نمبر ایک کے تلوے لٹنے لگا اور کہا۔

”جان میں! ہوش میں آ جاؤ۔ خدا کے لئے کوئی حکم دے دو۔ کوئی سنا

میں حکم کوئی انت شنت اوٹ پانگ سا حکم۔“

اور میری بیوی میں نہ جانے کیسے الکا ایکی بہت پیدا ہو گئی اور نہ جانے

اس نے غصہ سے کہا یا دیو سے کہا۔

”وقع ہو جاؤ یہاں سے۔“

اور پھر ایک دم زمین شق ہوئی اور دیو دفع ہو گیا۔

کچھ دن تک ہم میاں بیوی حواس باختہ رہے اہماری سمجھ میں نہیں آ رہا

تھا کہ ہمارے ساتھ یہ کیا سوک روا رکھا گیا ہے کہ ہم اپنی خالص اور شغری

ستمی محبت کی کمائی کے عادی بنے۔ مگر ہمیں حرام کی کمائی دے ہے۔ اور

چراغ عنایت کر دیا گیا تھا۔ اس لئے سہارے حماس کا مطلق ہو جانا ندرتی تھا۔ کیرنگداس سے ہماری عادات و حضائل میں بڑی گڑبڑ کا اندیشہ ہو گیا تھا۔ ہم اپنی حارل زندگی میں اس امر کے عادی ہو چکے تھے کہ فی جرابیں نہ خریدی جاسکیں تو ہمیشہ کوئی حبراہیں پہننے میں بھی ایک لطف آتا ہے۔ ہم تو اپنے بچوں تک کو یہ سکھا چکے تھے کہ باپ کی پرانی چالوں سے خالی بنیان بنانا ہندوستانی کلچر ہے اور ہمیں اپنے کلچر کی ہر قیمت پر حفاظت کرنی چاہیے۔

اس لئے جب الامدین کے چراغ کے تصور سے ہمیں یہ احساس ہوا کہ ہم ایک منسلک میں امیر کبیر بن سکتے ہیں۔ تو سہارے کلچر کو ایک اچانک صدمہ ہوا اور ہم اپنے ہوش اس حد تک گموا بیٹھے کہ چڑا سہقتہ ایک دوسرے سے کھل کر بات بھی نہ کر سکے۔

نسب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس چراغ کو کہاں رکھا جائے تاکہ نہ یہ بچوں کے ہاتھ لگے اور نہ اسے چھوا تھا کر لے جائیں۔ اس معاملے میں چور اور بچے دونوں کو ہم نے ایک سطح پر رکھا اور اسے زمین کے اس حصے میں دبا دیا جہاں بیوی کے طوائف زلیخا کا ڈبہ دبا ہوا تھا۔ ایک تباحث یعنی کہ ممکن ہے چراغ نکالنے کی کئی بار ضرورت پڑے اس لئے اس کو ٹرک میں رکھا جائے جہاں چٹا جی کی وصیت اور بیوی کے چیز کی کچھ باقی ماندہ نشانیاں اور عریاں میگزین کے خفیہ فوٹو رکھے ہوئے ہیں۔ بڑی مشکل سے

بیوی اس بات پر رضامند ہوئی کہ ٹرک کی دو چار چابیاں رکھی جائیں۔ ایک میرے پاس رہے اور ایک میری بیوی کے پاس۔

یہ پہلا واقعہ تھا کہ میرے اور بیوی کے اعتماد کی دیوار میں دراڑ پڑ گئی، درخت اس سے پہلے ہم دونوں شاستروں کی ہدایات کے مطابق ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ مجھے پہلی بار شب ہوا کہ شاستر اور بیوی دونوں تاپا بیدار ہیں اور اس چراغ کے ساتھ شاستر کا سورج نہیں جل سکتا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے بیوی سے زیادہ چابی پر یقین آیا۔

چند دن اور بے معنی طور پر گزر گئے۔

ایک دن میں چوری چھپے) الدین چراغ کا مشہور قصہ میرزا نوگلارام ایک سیلر کے ہاں سے خرید کر رات بھر ٹھنڈا رہا۔

دوسرے دن جب شام کو گھر لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں بیوی بھی لڑکے کا قصہ کتاب دفنہ کے پلوں میں چھپائے پڑھ رہی ہے۔ میں نے کہا:

”کیا پڑھ رہی ہو جان من!“

”بھائی کی ایک کتاب ہے نا ایشور بھگتی کے بڑے بڑے سندھ گیت لکھے ہیں اس میں۔“

میں نے مزاح جرات سے کام لے کر کتاب چھین لی۔

یہ تو الدین کا قصہ ہے جناب!“

میں نے طنزاً عرض کیا۔

ظاہر ہے بیوی مشتعل ہو گئی۔ بالکل ایسے ہی جیسے سبزی میں نمک زیادہ پڑ جائے تو اس کا الزام کوئل ڈھیر والے پر لگا دیتی ہے کہ وہ گیلا ایندھن مہیا کرتا ہے۔ چنانچہ اس نے ہٹ کر کر کہا۔

”میں جانتی ہوں تمہیں اب مجھ سے محبت نہیں رہی، بلکہ اب تو اس ٹھوڑی

کالی کلونی چھو کر سی کے پیچھے ٹھوسے ہو۔ میں پوچھتی ہوں وہ کیوں آئی تپ ہمارے  
 گھر؟ اب کے آئی تو نا نگیں توڑ دوں گی۔“  
 میں نے کہا۔

”دیکھو میری محبوبہ اور الادین کے درمیان محبت کو مست لاڈ  
 محبت ایک مقدس عظیم جذبہ ہے اور میری محبوبہ چھو کر سی کا رنگ کالہ ہے  
 تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ محبت نہیں کر سکتی، باقی رہنا نگیں توڑنے کا معاملہ تو  
 عیا اپنی محبوبہ کی ٹانگوں کا تحفظ اب زیادہ معقول طریقے سے کر سکتا ہوں کیونکہ  
 میرے پاس دلو موجود ہے۔“

یہ ایک ایسی کھلی دھمکی تھی جو بہت کم غامض بہت کم بیویوں کو دے سکتے  
 ہیں۔ عام حالات میں شاید میں یہ کہنے کی حیرت کبھی نہ کرتا۔ بلکہ اس کالی کلونی  
 چھو کر سی سے بدستور خاموشی اور محفوظ محبت کے عجیباً کہ محبت کی یہ دھمکنی ہمارے  
 اچے کانوں کو بھی سنائی نہ دیتی۔ لیکن جب سے الہ دین کا چراغ میرے قبضے میں  
 آیا تھا میرے اندر ایک حیرت انگیز تبدیلی آ رہی تھی۔ گذشتہ آٹھ دس سالوں کے  
 تپن نجاست، شرافت اور بزدلی میرے ورثے میں آئی تھی وہ میری گرفت کے  
 ٹکلتی جا رہی تھی اور اس کی بجائے وہ وحشیانہ قوت اور جارحانہ بربریت میرے  
 اندر داخل ہو رہی تھی جو انسان کو چھپر، گیدڑ اور گدھا وغیرہ سمجھتی ہے اور اس طرح  
 وہ تاریخی حالات پیدا کر دیتی ہے۔ جب ایک انسان دوسرے انسان کا اور ایک قوم  
 دوسری قوم کا خون پی کر مر رہی ہے لے سوا دہشتا کرتی ہے۔

”میں چراغ کے سما دیوے جو چاہے کروا سکتا ہوں۔“ میں دن بحسن ترجیا  
 خراب دیکھتا۔ میں اگر چاہوں، لوگوں کے تاج محل کو اکھڑا کر اپنے کوچہ گھاس  
 رام میں نصب کروا سکتا ہوں، میں اگر چاہوں تو پورے وطنی مٹھ کو یہاں سے جزیرو

انڈیا میں منتقل کروا سکتے ہوں۔ میرے ہاتھ میں جادو ہے، طلسم ہے، طاقت ہے دولت ہے۔ میں عظیم ہوں، میں بلند ہوں، میں شہنشاہ ہوں، میرے قدموں پر ساری دنیا جھک سکتی ہے (اس سندھوتانی بیوی کی کیا بات ہے؟)

یہی بیوی بھجوتوں کی لپٹ تک یعنی "قصہ اللہ دین چراغ کا" میرے منہ پر پنج کرا تیر چلی گئی معلوم ہوتا تھا اس کے اندر بھی وہی شہنشاہ جاگ چکا تھا۔ جو میرے اندر جاگ رہا تھا۔ اس میں بھی وہی دشمنانہ قوت اور جارحانہ بربریت جنم لے چکی تھی۔ جو میرے اندر۔ میرا تھا ٹھنکا یہی بیوی کتنی نرم دل، وفادار اور محکوم و ستمیہ کی مالک ہو کر قہقہے، لیکن اب یقیناً اسے بھی یا حساس ہو چکا ہے کہ اللہ دین کا چراغ اس کے پاس ہے۔ اس لئے اس دیو کے مقابلے پر میرے اس غاوندانہ فیصلے آدمی کی کیا سہتی ہے۔ میں تو دیو سے کہہ کر اسے بحر سندھ میں ڈبو سکتی ہوں۔

چنانچہ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا۔ اندر جاتے ہی وہ لپٹاگ پر جاگری اور منہ چھپا کر مظلوم بیویوں کی طرح بسور نے لگی۔ مگر میں انتہائی لطیف میں تھا۔ متاثر نہ ہو سکا، ورنہ مظلوم بیویوں کا رونا ہمیشہ رونا ساگ لگتا ہے۔ میں نے تیزی سے ٹرنک کے تالے کی چابی گھمائی، اور چراغ نکال لیا۔

میرا پردہ گرام سرسبز تھا کہ دیو کو بلائے ہی اسے پہلا حکم یہ دوں گا، کہ میری بیوی کو اٹھا کر ماؤنٹ ایورسٹ پر پہنچاؤ اور وہاں اسی پر میری کالی کلرٹی محبوبہ کو لیٹے آنا۔

میں نے عبدی عبدی فرش پر چراغ رکھا۔ میں غصے میں اپنے آپ کو پاگل بھی محسوس کر رہا تھا، اور انتہائی دانش مند بھی۔ کیونکہ جس بیوی پر سے اعتماد اٹھ جائے اسے اپنے گھر میں رکھنا انتہائی پاگل پن تھا۔

چراغ رکھا گیا۔

کچھ بھی نمودار نہ ہوا۔

نزد دھواں ، نزد دیو ، نزد دھماکہ

صرف فرسش پہاکیب ہلکی سی رگڑ کا نشان پڑ گیا۔

شاید چراغ کے گھڑنے میں کوئی ٹیکنیکل نقص رہ گیا ہو۔ میں نے سوچا۔

اس لئے دوسری بار میں نے اسے پورے پورے جو انفرادی سے رگڑا۔ یہاں تک ایسی زور دار رگڑ یعنی ، جیسے کوئی بڑھئی آری سے لکڑی چیر رہا ہو۔

مگر دیو اس بار بھی نمودار نہ ہوا۔

یہ دیو کو کیا ہو گیا ؟

کم بخت کہیں دوسری جگہ مصروف نہ ہو۔

کہیں ہسپتال میں بیمار نہ پڑا ہو۔

کہیں مجھ سے ناراض نہ ہو گیا ہو۔

مگر الادب کے قصے والا دیو کبھی بیمار نہ ہوتا تھا۔ غاصی اچھی پہیلنے لگتی

اس کی۔ شاید وہ اصلی دیو ہو گا۔ اور میرے چراغ والا دیو اس کا سب سے بڑا  
ایڈیشن ہو گا۔

قریب قریب مایوس ہو کر میں نے چراغ کو فرسش پر دے مارا کہ وہ ٹوٹے

ٹوٹے بچا۔ لیکن میرے اس غلام دیو کا جو تاج محل کو، عفا کر کے چرگھا ہی رام میں  
نصب کر سکتا تھا۔ دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔

میں نے میری سے کہا

”دیو کیوں نہیں آتا؟“

اس نے جمل معین کر جواب دیا۔۔

”میں کیا جانوں؟ تمہاری اس کالی کلونی؟ چھو کر ہی سے عشق کرنے میں مصروف ہو گیا“

یہ طعنہ عین میرے کچھے میں لگا۔

میرے سارے خواب چکنا چور ہو گئے۔

آج کا دن مجھ پر عدم اعتماد کا دن تھا پہلے بیوی پر اعتماد ڈٹا، اب دیہ پر دونوں میں اخلاق و کردار کی کمی دردناک تھی۔ اب کوئی کس پر اعتماد کرے۔ سچ ہے اس دنیا میں کوئی کسی کا نہیں، سب اکیلے ہیں۔ کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ نہ دکھ میں نہ سکھ میں۔ ہر دکھ تنہا ہے، ہر سکھ اکیلا ہے۔

درد و درپیر انگ کی اس کیفیت میں میری عجیب حالت ہو گئی صاف ثابت ہو رہا تھا کہ یہ دنیا صرف مایہ ہے بلکہ سرمایہ ہے۔

سرمایہ دار، مردہ یاد!

انقلاب، زندہ یاد!

دنیا بھر کے دکھ لوگو! تنہا ہو جاؤ، اکیلے ہو جاؤ، ایک دوسرے سے الگ ہو جاؤ! دنیا بھر کی بیویو! اپنے خاوندوں کے ساتھ دغا کا قراڈ چھوڑ دو۔ اور اے اللہ دین کے چراغ! میری آنکھوں سے درد ہو جا، نہیں تو اپنی آنکھیں پھوڑ لوں گا۔ میں رونے لگا۔

بیوی پہلے ہی رو رہی تھی۔

لیکن ہم دونوں الگ الگ وجہ سے رو رہے تھے۔

بچے ہمیں روتا دیکھ کر دوڑے آئے اور وہ بھی رونے لگے ان کے رونے کی وجہ ہم دونوں سے الگ تھی۔

(”ماڈرن اردو“ میں سے)

# ہم نوشیرواں بنے

پروفیسر نیچا بداس کئی دن سے ہمیں گمراہ کر رہا تھا کہ ہم دارالسلطنت کا دورہ کریں اور ہمیں بدل کر کریں، جیسے نوشیرواں بادشاہ کیا کرتا تھا۔ ہم نے نوشیرواں کا نام ہمیں اپنی سنا تھا، ہمارے مرنوم دادا ہمارا جادویراج کن سمجھوڑا تھا تب بھی ہمیں کہیں ہمارے دو چار جام چڑھانے تو ہنٹے ہیں اگر اپنے آپ کو نوشیرواں کہا کرتے تھے۔ لیکن ہمیں بدل کر کبھی دورے پر نہ نکلے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ گھوڑوں والی بگھی گئے بغیر وہ کہیں نہیں جاسکتے۔ چاہے ہمیں جنت کا دورہ کیوں نہ کرتا پڑے۔

لیکن ہماری شکل کچھ اور تھی۔ ہمیں زمانہ جمہوریت میں بادشاہ بننے کا چانس ملا تھا۔ گھوڑے اور گھٹی کارواج ختم ہو چکا تھا اور ہمیں کار پر سوار ہونا پڑا تھا کار کہیں بھی جانی ہی نہیں سٹ سے اس کی منظوری ایسی پڑتی تھی۔ ڈراما اس منظوری کے بغیر کار چلاتا تو اسے بادشاہ کو اعزا کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا جاتا۔ غرض جمہوری دور میں نوشیرواں بننا ایک بہت بڑا رسک۔ (K لکھا۔



نیشنل داس نے ایک اور نکتہ بتا کر ہمیں ہراساں کر دیا کہ یڈ میوکرسیا ہے رعایا سے براہ راست تعلق قائم کیجئے۔ ورنہ وزیر لوگ موقع پا کر آپ کو گدی سے اتار پھینکیں گے۔ اور رعایا چوں تک نہ کرے گی۔ رعایا پر کیسے غور رکھا ہے؟ اس کا آپ کو براہِ علم ہونا چاہئے، تاکہ آپ وزیرانگی خاطر اسے درودش برائیوں کا پول کھول سکیں۔

مقامِ تاسف ہے کہ نیشنل داس کا سیاسی شعور ہم سے بہت زیادہ گہرا ہے، نہ جانے یہ سپر مینٹی میں کیوں ٹول رہا ہے۔

بہر حال ہم نوشیرواں نے بننے کے لئے بے قرار بھی ہیں اور بختے ہوئے دُرتے بھی ہیں۔ ہمارے راج محل سے غائب ہونے کی خبر بجلی کی طرح پھیل جائے گی اور شعیر کی ساری پولیس یہیں کتوں کی طرح سونگھتی پھرے گی۔ بڑی الجھن میں جان ہے۔ کیا کریں؟ کدھر جائیں؟ اے خدا! اے! اے! واد! ہمارا راج کن کبھو رانا تہ جی! ہماری رہنمائی کر!

بالآخر ہماری مالا لکٹی رنگ لانی اور ہم آج نوشیرواں بن کر باہر نکلے ہم نے ایک مالی کا بھیس بنایا اور شاہی محل کے گیٹ کیپر کو شاہی اجازت نامہ دکھا کر نکل دیا۔ کیونکہ ہم نے خود ہی اجازت نامہ تحریر کیا، خود ہی دستخط کئے اور خود ہی باہر نکل آئے۔ جل دینے کا فیصلہ نہیں ہے حدِ لذتِ معلوم ہوا جل رہتے وقت سارے بدن میں ایک رومانی شکستہ سنسنی سی دوڑ گئی، چہرے میں بادشاہی دھوکا دے سکتا ہے۔ یہ ہیں پہلی یادِ معلوم ہوا۔

محل سے نکل کر ایک فرلانگ تک ہم دمِ سادھ سیدھے چلتے رہے جیسے ہم راجہ نہ ہوں، چور ہوں، جب تھکے گئے تو پیپل کے پڑکے پتے کھڑے ہو گئے ہم نے سوچا، اب ہم اپنی رعایا کے درمیان آچکے ہیں۔ لیکن بہت شش و پنج میں تھے

کہ رعایا سے بات کیسے کرے۔ رعایا سے براہ راست باتیں کرنے کا ہمیں کوئی تجربہ نہ تھا۔

ہم کھڑے ہوئے ہانپ رہے تھے۔ ہمیں ہانپنے کا تجربہ بھی پہلی بار ہوا تھا۔ ہمارے سامنے ہماری رعایا پاپادہ چل رہی تھی۔ لیکن وہ ہماری طرح ہانپ نہیں رہی تھی۔ عادت کی بات ہے، ہم نے سوچا اگر رعایا بھی ہماری طرح بادشاہ ہوتی تو ضرور ہانپتی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ سپرل چلنا حاکمیت ہے۔ جب ہماری جیب کرسیوں سے بھری ہوئی ہے تو کیوں زنگیسی پر چلیں۔ ہم نے ایک ٹکیسی کو اشارہ دیا۔ وہ اس غرور کے ساتھ رکنا جیسے ہمارے اشارے سے اس کی تڑپیں ہوتی ہو۔ ٹکیسی ڈرائیور ایک شاگڑا مٹنڈا (جوان تھا) اس نے پہلے سر سے پاؤں تک ہمارا معائنہ کیا۔ ہم مالی کے بھیس میں تھے نا؟ اور پھر ناک چڑھا کر بولا: ”کیا بات ہے، ہمیں کیوں روکا؟“

”ہم ٹکیسی پر سوار ہوں گے۔“ ہم نے ذرا ان باری کیا۔  
 ”اے واہ رے ہم کی اولاد! صورت مشکل سے تو بولی گئے ہو یا موحی۔ لیکن اپنے کو، ہم کہتے ہو کسی بادشاہ کی نا جائز اولاد معلوم ہوتے ہو۔ کتنے پیسے ہیں پلے میں؟“

ہم مارے طیش کے آتش زیر پا ہو گئے۔ کتنی بدتمیز رعایا بے ہماری؟ جی چاہا اس کے رخسار پر طمانچہ جڑو سی۔ لیکن مالی اور طمانچہ؟ بڑی مشکل تھی۔ اس نے منہ کا ایک گھونٹ بھرا اور کہا: ”بورو۔ کتنے پیسے چاہئیں، ہزار، لاکھ، دو لاکھ، تین۔۔۔۔۔“

ڈرائیور نے ہم پر استہزاء یہ قہقہہ لگایا اور بولا: ”کوئی بدتمیزی سمجھ گئے ہو؟ میں سمجھ کر ٹکیسی میں بٹھا کر گرتا رہتا ہوں چاہتا۔۔۔“

یہ کہہ کر وہ قہقہے کے ساتھ ٹکیسی سٹارٹ کر کے چلا گیا۔ راج محل کے باہر بادشاہ کی گنتی غریب ہوئی ہے؟ قہقہہ اس سوال کا جواب دے رہا تھا! آہ راجہ کو تو صرف راج محل ہی میں رہنا چاہیے۔ (ہم نے فٹنچل داس کو لاکھ لاکھ لگائیاں دیں، جس نے ہمارے سر پر زار و سوا ہونے کا منصوبہ بنایا تھا۔) پیل کے پٹر کے نیچے ایک بڑھیا بیٹھیں تھیں اور اپنی گھٹری میں سے کھانا نکال کر کھا رہی تھیں۔ کیا یہ درخت اس کا ڈائٹنگ روم ہے؟ ہمیں یہ مزاحیہ فقرہ اچانک سوجھ گیا۔ پیل چادر کے دسترخوان پر دو تین کالی کالی روٹیاں اور اچار رکھ کر بڑے مزے سے کھا رہی تھیں۔ ہم اس کے قریب چلے گئے اور پوچھا: کیا تم رعایا ہو؟ بڑھیا بولی۔ کیا مطلب؟

”میں تم سے براہ راست تعلق قائم کرتا چاہتا ہوں۔“  
 ”کون ہو تم؟“

کیا میں اسے بتا دوں کہ میں نو شیرواں ہوں، لیکن نہیں۔ راج یعنی کئی صلحت کا تقاضا تھا کہ اپنا راز افشاء کروں۔ اس لئے تقریباً کہا: ”میں بھی ہندو ہی طرح ایک رعایا ہوں۔ ہمارا راج چوپٹ ناٹھ جی سے ملنے کے لئے جارہا ہوں۔“  
 ”بیکار ہے، وہ کوئی راج ہے؟ اس کے راج میں تو بھر پیٹ رونی ہوگا نہیں ملے گا۔ اس نے میرے گناہ بیٹے کو جیل میں ڈال دیا۔ میں تو اس بخوس کی صورت و بکیروں۔“  
 ڈرامیور کے بعد بڑھیا ہمیں سوا کر رہی تھیں۔ اس کے بیٹے کو کس نے جیل میں ڈالا ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا۔ ہمارا معلومات گنتی: نقص مقیس، مزید تشریح کے لئے پوچھا: ”اں! کس جرم میں تمہارے بیٹے کو جیل ہو گئی؟“

”اندھیر نگر کی جو ہوئی بیٹیا: میرا: بیٹا ایک زمیندار کا مزارعہ تھا۔ زمیندار ناچار سفر بہ نہانے کا دھندا کرتا تھا، چھاپا چوڑا تو زمیندار پولیس کو رشوت دیکر چھوٹ گیا

لیکن میرے بیٹے کو پھنسا دیا اور اب سنا ہے اس زمیندار نے راجہ چورپٹ نالائق کے بیٹے کا جشن منانے کے لئے بھی ایک ہزار روپیہ دیا ہے۔ تفت ہے ایسے راجہ پر جو رشتہ کے پیروں سے جشن مناتا ہے!“

بڑھیا نے ایک مشکوک نگاہ ہم پر ڈالی۔ ہمارے لباس کو دیکھا۔ کیونکہ راجہ صرف لباس ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ لباس سے وہ بالکل متاثر نہ ہوئی اور اپنے پرچے منہ سے مسکرا کر بولی: ”ہی ہی ہی! جاؤ بھیا! کیوں بڑھیا سے مذاق کرتے ہو؟ تم راجہ ہوتے تو ایسے گھٹیا مذاق نہ کرتے۔“

ریکھنے کہتے اس نے گھٹری اپنے گھٹنے کے نیچے دبالی تاکہ ہم اٹھا کر بھاگ نہ جاسیں۔ اس نے ہمیں چور سمجھا تھا۔ ہمیں اپنی اس بوڑھی رعایا پر سخت غصہ آیا لیکن یہ غصہ ہم کیسے نکالیں! ہماری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ صرف تعجباً اسے دھمک دئی۔ دیکھ رہی بڑھیا! ہمیں راجہ تسلیم کر لے۔ ورنہ ہم تمہارے بیٹے کی طرح تمہیں بھی جیل بھجوا دیں گے!“

یہ سن کر بڑھیا نے گھٹری پر اپنی گرفت اور مضبوطی کر دی اور داد دینا بچائے لگی: ”ارے کوئی بچا داریہ لٹیرا میری گھٹری چھینا چاہتا ہے!“

ہم گھبرا گئے اور سوچنے لگے اس ڈانٹ بڑھیا کے پاؤں پر گر پڑیں یا بھاگ کھڑے ہوں۔ مگر اس کا داد دینا ہماری سوچ کی رفتار سے زیادہ تیز تھا۔ جسے سن کر پانچ چھ آدمی آگئے۔ بچے قماش سجھ کر رک گئے۔ راہ چلتی عورتیں بھی گھٹری ہو گئیں۔ اور اب چلیے ہم سچ پچ عوام میں بکھر گئے۔

کیا ہے مال جی؟ ”بہت سی آوازیں بڑھیا کی طرف پڑیں۔“

”یہ مڑا، مٹھنڈا، مجھے اکیلے جان کر میری گھٹری ...“

اور ایک زن نے کاٹھانچہ ہمارے گال پر پٹا: ”کیوں بے ماں کے ... شرم نہیں آتی؟“  
 ”اے پڑھر تھانے چلو گی!“

”تو رہے! دن دباڑے رہنری۔ راج فقوڑے ہے، اندھیر گردی ہے!“

”ہی ہی ہی! اے کہتے ہیں چوپا راجہ کاراج!“

”اور مجھے دھوکا دیتا تھا کہ میں ہی چوپٹ راجہ ہوں؟“ بڑھیا نے تیل چھڑکا  
 اور پھر ایک اور زن نے کاٹھانچہ! (اس بار زیادہ بھر پور تھا، جبرے تک مل گئے!) اور  
 پھر جیسے فتح کا نقارہ بجایا: ”ہوں! تباؤں تھیں راجہ کیا ہوتا ہے؟“  
 ”جو سر اندھیر کھاتا ہے، قہہ قہہ قہہ!“

اور گھٹری چراتا ہے ...!

اب ہماری پوزیشن انتہائی نازک ہو گئی تھی۔ نہ اپنے آپ کو راجہ چوپٹ تاتھ  
 کہہ سکتے تھے اور نہ زیادہ تھپڑ کھا سکتے تھے! ایک خیال آیا اور بڑا عظم کوٹلی فون  
 کر دیں کہ ہمیں اپنی رعایا سے نجات دلاؤ! لیکن وزیر اعظم ہماری کھلی اڑائی کا:

مگر جب پچھلے ال تھپڑا دہم بڑا رنگن رہے تھے تو جیسے ہماری عقل کا بند  
 ٹوٹ گیا۔ ہم نے اپنی جیب میں سے آٹھ دس کرنسی نوٹ نکالے اور ہر امی اچھا لڑکا  
 اور پھر جیسے ایک بجزہ سا ہوا بچے ان نوٹوں کے پیچھے بھاگے، ایک انیس بھاگے  
 اور بڑے ان بچوں کے پیچھے بھاگے اور ہمارے بجائے بچوں کو تھپڑ مارنے لگے۔ ہم نے  
 کچھ نوٹ اور اچھا لڑکے، کچھ تھپڑ اور لگے۔ یہاں تک کہ ایک نوجوان حسین دیہات کو  
 جیسی تھپڑ لگا گیا۔ اب ہمیں اس تنازعے میں مداخلت آنے لگا۔ ہم نوٹ پر نوٹ چھاپتے  
 پلے گئے۔ ایک سے دوسرے کی گردن پکڑ لی۔ دوسرے نے تیرے کی کلائی دو بچا  
 چرتے لے چھرا نکال لیا۔ اور نوٹوں اور آدمیوں کو ایک پیڑ فٹار سے کاسٹے لگا

ہیں ان زخموں پر قدرے رحم بھی آنے لگا۔ لیکن یہ راج نیت یعنی اور ہم راج نیت کے سامنے انسانیت نہیں دکھا سکتے تھے یہی لوگ جو چند منڈ پہلے ربن سجدہ کرتے تھے اب حاتم طائی سمجھ رہے تھے۔ سہارا حیا ہے کہ وہ اس وقت سوچ سے محروم ہو چکے تھے۔ جب انسان پیسے کے پیچھے بھاگتا ہے تو سوچ اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ لیکن ہم برابر سوچ رہے تھے کہ ہماری رعایا جن لوگوں کی خاطر سر پیش کر رہی ہے، وہ دراصل ان کے بچے ہی نوٹ تھے۔ ہم نے رعایا ہی سے وصول کئے تھے لیکن اس وقت وہ اپنی ہی چیز کو یوں لوٹ رہے تھے، جیسے وہ حرام کا مال ہو!

ہم نے رعایا کی یہ لوٹ دیکھی تو بڑھبھیا سے کہا: ”بے وقوف! اللہ تو بھی بڑھ کر لوٹ لے!“  
 بڑھبھیا نے رال ٹپکانی۔ بیٹیا! جیتے رہو جنم مجھے اپنے ہاتھ ہی سے کچھ نوٹ دیدو۔  
 ابگو ان تینیں سچ سچ راجہ جو پٹ تانہ بنا دے گا!“

ہم نے محسوس کیا ہماری ساری رعایا لیٹ رہی ہے۔ مظلوم ہم لیٹا ہے اور ظالم ہم! اور ہم ان لیٹروں کے راجہ ہیں! ہمارے منہ سے ایک فرمان اچانک نکل گیا: ”بھاگ جاؤ نوٹ کر! پولیس آرہی ہے!“

اس پر جس کے جوہر تھے لگا، نے کر بھاگ گیا اور صرف ہم باقی رہ گئے اور یہ ایک کناکڑا رول، جرم ملکا کر ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا تھا: ”ہمارا ج! صحت نوٹ ہی بانٹو گے یا روٹیاں بھی۔“ روٹیاں ہی بانٹو تاکہ ایک آدمی ہم بھی لے اڑیں۔ آخر ہم بھی تو آپ کی رعایا ہیں!“

ہم نے کتے کو دھتکار دیا۔ اسے ایک ڈھیل مارا جس کا شاید اس نے بہت برا مانا۔ کتے کے جیسے کے بعد ہم تنہا رہ گئے اور پھر تنہائی سے تندرہ اٹھا کر روٹنے لگے۔ اپنی اور رعایا دونوں کی حالت زار پر! اور جب دور دور کی کچھ ہلکا براتو ہم یہ سوچ کر محل میں لوٹ آئے کہ رعایا سے تعلقات پیدا کرنے ہیں تبھی اس وقت سے اور تینیں زر میں (چوہٹ راجہ ہیں)۔

# مسخر

کہنیا لا ایک پور سے میری ملاقات کب ہوئی؟ یہ مجھے بالکل یاد نہیں۔ شاید وہ ملاقات کوئی اہم واقعہ نہ ہو جو پہلی ملاقات پر کوئی گہرا نقش چھوڑ جائے۔

لیکن اب یہ عالم ہے کہ کپور سے ملنے کے لئے طبیعت میں ابال سا اٹھنے لگتا ہے۔ حالانکہ وہ نہ حسین و جمیل جسم کا مالک ہے نہ اس کے لمبے تڑپے قد میں کوئی کشش ہے اور نہ اس کی گفتگو اور لب و لہجہ میں کوئی حقیقی شائستگی ہے۔ صرف ایک لیڈی کٹھ عینک کے سوائے اس کی پوری شخصیت میں کوئی چیز چمکیلی نہیں ہے۔ بدن کے ماسرین کا خیال ہے کہ ہر شخصیت کے جسم میں سے کچھ خاص قسم کی لہریں نکلا کرتی ہیں ان لہروں کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک قسم کی لہریں اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ دوسری قسم کی لہریں دھکے دے دے کر اپنے سے دور بھینکتی ہیں کپور کے نصیب میں دوسری قسم کی لہریں تھیں جو جسم سے پھوٹتی ہیں تو انسان کو جگا دیتی ہیں۔ سید صاحبان ظہیر اور کپور متذکرہ بالا دونوں قسم کی لہروں کے دو رنگ۔ اچھا۔ ٹائڈے کچھ جاسکتے ہیں

لیکن اس کے باوجود میرا عالم یہ ہے کہ میں کمپور سے ملنے کے لئے مضطرب ہوا تھا  
ہوں اور میرا خیال ہے کہ میری اپنی لہروں میں ہی کوئی نگر ٹپڑ ہے ورنہ کمپور کے لئے  
مضطرب ہونا کہاں کی دانش مندی ہے ؟

وہ شہروں میں رہتا ہے مگر دیہاتی خدو خال رکھتا ہے اگر وہ کسی گھاؤں کے  
جاگیردار کا بیٹا ہوتا تو ضلع کا مجسٹریٹ بن کر اپنی دیہاتیت کو چھپا لیتا مگر وہ ایک  
غریب دیہاتی کا بیٹا ہے جس کی پرورش اور تربیت لاکھ پور کے ضلع میں جائگلی بوجھوں  
کے درمیان ہوئی۔ اس لئے اب چاہے وہ یونیورسٹی کا پائلٹ ہی کیوں نہ بن جائے  
اور بورڈ واسوسائٹی کے آداب ہی کیوں نہ اپنائے لیکن مصل میں وہ تو بس پرائیویٹ  
رک کر باغیچوں ہی سے کھانے لگے گا چھری کاٹنے سے نہیں کیونکہ وہ ٹھوسٹی ہوئی بناؤ  
کا مذاق اڑانے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ خود اس کا شکار ہونے کے لئے نہیں۔

لیکن کمپور کا خیال ہے کہ وہ پہلی بایوس نہیں ہے۔ اس جہنم میں اسے فطرت  
کی طرف سے جتنی بھی چیزیں دستیاب نہیں کی گئیں وہ اگلے جہنم میں مل جائیں گی  
اگلے جہنم میں بھی زمین تو اس سے اگلے ہی ملیں گی۔ انسان کو اس چوراسی لاکھ مربع  
جہنم میں اس لئے جلتے ہوئے رکھا گیا ہے کہ اس کوئی ضرورت نہیں ہے چوراسی لاکھ جہنم کا آئینہ  
بہت مسرت انگیز ہے۔ وہ ایک سنجیدہ تہنہ لگا کر کہتا ہے : ”یہ آئینہ یا سینے میں  
امید کی مشعلیں بنانا دیتا ہے۔ چنانچہ میں آئے دن دالے کسی دوسری جہنم میں ہر ایک سے تشنہ  
لوں گا۔ راجندر سنگھ بیدی سے کرشن چندر سے، فکر تو نسو سے، مہم ہا۔  
سیا پوریہ بات کہہ گا چوراسی لاکھ جون کے آئینہ پر طعنے نہ کرنا ہے بلکہ  
کہہ سکتا ہے کمپور کی کسی بات کا کیا اعتبار ہے کیونکہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے  
دیکھ رہا ہے کہ وہ ساٹھویں سال میں داخل ہو چکا ہے جس میں سے عمر کا بیشتر قیمتی  
حصہ اس کے خیال میں نہیں بلکہ پار حصہ (نوعانہ) چلا گیا ہے۔ یعنی ایک پورا جہنم



نہاؤ و بڑا ہو گیا ہے اور اب جبکہ دم واپس بھر رہا ہے، شراب چاہے وہ انڈیا کا پریذیڈنٹ کیوں نہ بن جائے اس سے کیا فرق پڑے گا، خوشی اور امنگ کے وہ لمحے تو لمحوں سے نکل ہی گئے۔ جبکہ وہ ایک دور افتادہ گاؤں میں سوکھے ٹکڑوں پر پتار رہا۔ تھینوں کے زہریلے گھونٹ نیتا رہا۔ یہاں تک کہ آٹھویں سال ہی میں ماں کی ممتا سے بھی محروم ہو گیا۔ اس لئے اب چاہے پورا اجارت اس کی ماما بن جائے وہ اس سے محبت کی کونسی ہر کھینچ سکے گا۔

اس لئے آنے والے جنم پر بعد رس رکھو اور قبضے اڑاتے چلے جاؤ۔

کبھی کبھی بڑا لگتا ہے جبکہ طنز نگار کمزور بڑا مباد اور جیانا انسان ہے کیونکہ وہ دنیا کی بڑی سبزی طافست کو ایک ہی فقرہ میں چٹکیوں سے اڑا دیتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی اس کی جذبی دیکھ کر اس کے جیسے پن پر شبہ ہونے لگتا ہے، ایک وفد کا ذکر ہے کہ کسی کالج میں اسے پرسنل جنے کا یقینی چانس مل رہا تھا، کمزور کی اپنی ہی خواہش تھی کہ انہی ۴ سپروائیزری کرتے بیت گئی۔ اب اسے پرسنل مزدور بن جانا چاہئے۔ کوالی فیکشن، تجربہ اور سفارش سبھی کچھ مکمل تھا۔ اسے انٹرویو کے لئے بتایا گیا اور اس پر سوالات کئے گئے۔

”کیز جناب! کیا آپ پورٹل میں دلچسپی رکھتے ہیں؟“

”جی نہیں!“

”کیا کالج میں کلچر کنکشن کروا سکتے ہیں؟“

”جی نہیں!“

”کیا آپ کالج کی از سر نو تنظیم میں حصہ لیں گے؟“

”جی نہیں!“

اور پھر کمزور نے مجھے بتایا کہ وہ یس کی حد مسرور ہوا کہ انٹرویو بورڈ کے ہاتھ نابل سمجھتا ہے اور اسے پرسنل بننے کا چانس نہیں دیا جائے گا۔ اس نے جان بوجھ کر سبھی

جواب دہن میں ہی دئے تاکہ اسے ایک ذمہ وار پسند سے قرار دینے کا مصلحت حاصل ہو سکے۔

یہی حالت اس کی گھریلو زندگی میں ہے۔ دو گھر سے جو گناہاں ہوتا ہے۔ حالانکہ سات بچے ایک بیوی اور ایک باپ اسے سو فی صد پر اپنے خلیجے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ لیکن پھر بھی اس کا یہ فارمولہ ہے کہ دیتا تک آدمی جیتا ہے۔ اسے گھر میں دن اور رات بھر یہ زیادہ سے زیادہ ایک آدمی گھنٹہ ہی رہنا چاہئے اور باقی وقت گھر سے باہر گزرنا چاہئے۔ چنانچہ اگر اس کا بیچہ میرا ہے تو وہ اسے اس ڈر سے ڈاکٹر کے ہاں نہیں لے جائے گا کہ کہیں ڈاکٹر یہ نہ کہہ دے کہ بچے کا بچنا محال دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ وہ اس مفروضہ خوف سے فرار جانے کے لئے بیوی سے کہہ دیتا ہے کہ تم خود جا کر اسے دکھا آؤ۔ وہ یہ جانتا ہے کہ بیوی سودا سلع خربہ بننے کے لئے بازار جانے لگی تو ڈیوڑھی سے دام دے آئے گی لیکن وہ اس نقصان مایکوسنسی خورگ برداشت کر لے گا۔ وہ تو یہاں تک کہہ دیتا ہے کہ اس کی پیٹ کا کپڑا خریدنے کے لئے آٹھ سال بچے شہد کو بھیج دیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ کتنا فرق پڑے گا؟ یہی پانچ دس بارہ روپے؛ مگر فرار تو ایک بیش قیمت چیز ہے، پانچ دس بارہ روپے سے ہزار گنا زیادہ قیمتی۔ !!

اور اس فراریت کے حق میں اس لمحے پاس بڑی بڑی دلچسپ دلیلیں بھی ہیں مثلاً وہ کہتا ہے کہ دنیا کی یہ ساری جبر و جبرائت سائنس کے لئے ہے۔ آسائش اور فراریت کی سرمدیں بالکل قریب قریب ہیں۔ تم کام کس لئے کرتے ہو؟ اس لئے کہ کام کرنے کے بعد کام سے فرار حاصل کر کے پک تک پر چلے جاؤ۔ تم کام کے زیادہ بوجھ کو مشینوں پر کریں ڈالنا چاہتے ہو؟ تاکہ تم کام سے فرار حاصل کر سکو۔ اور غمزدہ نہایت غمزدہ سے گردن اٹھا رہتا ہے اور کسی حد تک چھکتے ہوئے بے جا کارنہ بھیجے میں کہتا ہے۔ سویت روس

میں جس لو کام کے چھ گھنٹے مقرر کئے گئے ہیں آخر کیوں بتایا اسی لئے نہیں کہ باقی اٹھارہ گھنٹے انسان فراہم لذت سے آشنا ہو سکے، گویا وہاں اٹھارہ گھنٹے نازکے اور چھ گھنٹے کام کے ہوتے ہیں۔

اس کا حلقہ احباب بہت مختصر ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ اس نے کوئی ایسا دوست نہیں بنایا جس پر وہ حتی جان سے مرث جائے تو زیادہ مناسب رہے گا۔ یوں کہنے کو تو اس کے سینکڑوں دوست ہیں مگر میرا خیال ہے کہ کپور نے کئی کو اپنا دل نہیں دیا۔ اگرچہ اس میں کپور کی بد مزاجی کو دخل نہیں ہے کیونکہ ٹرچڈی یہ ہے کہ اس کے پاس دل کی مقدار کہا بے حد کم ہے۔ وہ کسی کے لئے بھی بے مہربان نہیں تڑپ سکتا۔ نہ اس کی یاد میں نارے گن سکتا ہے نہ آہیں بھر سکتا ہے۔ یہ بات بھی نہیں ہے کہ وہ جذبات سے بالکل گور ہے، بلکہ جھگڑا صرف مقدار کا ہے۔ وہ اگر کسی کو اپنی محبت سونپنا ہے تو دل سے نہیں بلکہ دماغ سے۔ اس کا دماغ ہی محبت کا فیصلہ کرتا ہے۔ اگر کوئی مرد و زنانہ سے عاری ہے تو چاہے وہ یوسف ثانی ہی کیوں نہ ہو کپور اسے منہ نہیں لگا کرے گا۔ وہ کہتا ہے کہ مرد کو ذمہ اور عورت کو حیفیٰ گنا چاہئے۔ عورت کے حسن کا فیصلہ بھی وہ دل سے نہیں دماغ سے کرتا ہے۔ علم حایات کے فیتے سے ہی وہ حسن تاؤک کو ما پتلا ہے۔ پورا اتر اتر ہے نصیب ورنہ کنڈم !

ہاں اس کے ایسے احباب کی تعداد بے شمار ہے جو کپور کو اپنا دوست سمجھتے ہیں مگر کپور انہیں بنا تا رہتا ہے۔ کیونکہ اگر کپور کسی کو نہ بنا کے تو اس کی زندگی اجیرن ہو جائے ایک مرتبہ اس نے ایک نہایت بد صورت شاعر کو اپنا دوست بنایا۔ یہ شاعر اسے لاہور کے کافی دوس میں ملا۔ وہ اسے اپنے نہایت ہی گھٹیا شعر شاعر محفل سے اپنا ندان اڑا رہا تھا کپور نے اس کے اشعار کی تعریف تو حدیث شروع کر دی اور نہایت سنجیدہ لہجے میں اہل محفل کے سامنے اشعار کی خوبیوں کو اجاگر کرنے لگا۔ بد صورت

شاعر کمپور پر لڑ ہو گیا۔ دوست کا ہاتھ آگے بڑھایا جسے کمپور نے بڑے خلوص قلب کے ساتھ  
 تمام لیا۔ یہاں تک کہ سبھی سمجھنے لگے کہ کمپور اور بد صورت شاعر میں گارہی جمین رہی ہے۔  
 ایک بار وہی شاعر اسے مال روڈ پر مل گیا۔ علیک سلیک ہوئی۔ شاعر نے جذبات  
 محبت سے جو چرم کو کر کہا: "کمپور صاحب! مجھے کوئی خدمت بتائیے۔ میں آپ کے  
 کس رکھی کام آتا چاہتا ہوں۔"

کمپور نے کہا: "رہنے دیجئے۔ دوستی میں بے شکافی ہی اچھی رہتی ہے۔"  
 شاعر نے کہا: "آپ میرے مخلصانہ جذبات کو ٹھکرا رہے ہیں۔"  
 کمپور بولا: "تو میرا آپ میرا صرف ایک جھوٹا سا کام کرو دیجئے۔"  
 شاعر بولا: "فرمائیے۔"

کمپور نے نہایت سادگی سے کہا: "آپ ذرا انکلیٹ فرما کر چند منٹ کے لئے میرے  
 غریب خانے پر تشریف لے چلئے۔"

شاعر نے کہا: "کون سا کام ہے؟"

کمپور نے کہا کچھ بھی نہیں۔ میں صرف آپ کو اپنی بیوی سے ملاؤں گا۔ اور پھر اسے  
 بتاؤں گا کہ دیکھو تم مجھ پر خرافات کی طرح متی ہو جا لا نکالیں گی مجھے جسے بھی زیادہ بد صورت لڑکی موجود  
 لڑکیا وہ اس باتے رہنے میں صرف طنز کرتا ہے اور ابدی لذت اخذ کر کے  
 رہ جاتا ہے؟ کیا وہ اس کردار۔۔۔ یا اس کیفیت کے ساتھ بہدروی رکھتا ہے  
 جس پر وہ اپنے طنز کا نشانہ چلاتا ہے؟ نہیں! کمپور یہ بات نہیں مانتا۔ وہ کہتا ہے اگر  
 میں طنز کرتے وقت بہدروی کے جذبہ کی لپیٹ میں آجاؤں تو میرا وار خطا جائے گا  
 اور اگر خطا نہیں جائے گا تو پچیس پچاس سا وعظ ہو کر رہ جائے گا۔ میں واعظ نہیں ہوں  
 بلکہ طنز نگار ہوں۔

چنانچہ اسی بنا پر وہ کیٹیوں کو بنا ڈرتا ہے۔ جو لوگ اس کے طنز کا نشانہ بنتے

ہیں ان کی تین قسمیں بن جاتی ہیں۔ ایک وہ جو شکار ہی شکار رہتے ہیں اور آخری دم تک اسی سادگی کے ساتھ شکار بنے رہتے ہیں، ایک وہ جو اس کے طنز کے راز کو پہچانے ہیں اور حمل کر کے ابھرتے ہیں اور اس کے گھٹیا قسم کے انتقام لینے پر تیل جاتے ہیں اور ایک وہ جو جوڑا سہہ کرا سے عیب سہلانے لگتے ہیں تو شرفِ لذت سے مسکرا دیتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے تبسم آمیز آنسو بہہ نکلتے ہیں اور طنز کے اثر کی یہی مقدار ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ جب وہ پہلے کام کی سیاحت پر جا رہے تھے راستے میں اسے ایک بہت بڑے پنجابی زمیندار کے ساتھ سفر کرنے کا موقع مل گیا جسے اپنے بسترے اور معیاری گلے پر سر پٹے اور ریشمیلے ہونے کا یقین تھا۔ چنانچہ اسی مضحکہ خیز یقین کو بنا پر کپڑے اسے بتایا کہ کیا آپ نے کشمیر میں ایلن ہوئی چائے کے تالاب بھی ملاحظہ فرمائے ہیں۔ تو زمیندار نے حیرت کے ساتھ وہ تالاب دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ کہہ کر اس کی نیت کو اتنی سنجیدگی کے ساتھ آگے بڑھانا رہا کہ بالآخر اس زمیندار کو پہلے کام کے قریب گندھک کے ایک پہاڑی چشمے پہنچ گیا اور اس میں سے چائے کا ایک کپ بھر کر اسے پلا یا۔ جس پر زمیندار نے صرف اتنا کہا کہ یہ چائے کچھ تمکین زیادہ ہے۔ کہہ کر اسے کہا کشمیری لوگ تمکین چائے ہی پسند کرتے ہیں کیونکہ یہاں کھانڈ کی پیداوار بے حد مشکل ہے۔

اسے اپنے دلچسپ جسم کا مشہور احساس رہتا ہے اور اس بنا پر وہ کسی عورت کی ذلتِ عشق میں گرفتار نہیں ہوتا چاہتا۔ بلکہ کلی محلہ سے گزرتے ہوئے ایک ٹیک اور شریف بچہ کی طرح ٹھک جاتا ہے۔ وزن تو نے والی مشین سے یوں ختم کھانا ہے جیسے شیطان لا حول سے۔ نہانے سے بہت ڈرتا ہے۔ کیونکہ نہانے میں کپڑے اتارنا پڑتے ہیں اور جسم کا پتلا پن صاف چٹلی کھانے لگتا ہے۔ سفر کرنے سے بھی گھبراتا ہے۔ کیونکہ سفر کے دوران میں دھکے لگتے ہیں ٹکٹ لینے کے لئے، گاڑی میں بیٹ جا مل کر رہنے کے لئے اسٹیشن پر اترنے پر چڑھنے کے لئے، سامان اتارنے

اور پڑھانے کے لئے۔ اور اس سارے عمل میں اس کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ چنانچہ سفر کو مضر سمجھتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک انگریز خاتون نے اس کے ساتھ مذاق کرتے ہوئے کہا۔ ”کپور صاحب!“

“YOU ARE AS THIN AS A NEEDLE”

یہاں آپ تو سوتی کی طرح پتلے ہیں۔ کپور نے بے ساختگی سے اس چوٹ کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ محض سر آپ ذرا لمبا لٹ سے کام لے رہی ہیں۔ چند ایک سرسٹیاں تجھے موتی بھی ہوتی ہیں۔“

جسمانی کمزوری کے اس احساس نے اس میں مقابلہ کرنے کی سپرٹ کم کر دی جائے۔ ایک مرتبہ کب پبلشر نے اس کی کتاب شائع کر دی۔ اور جب کچھ دنوں کے بعد اس سے رائٹس مانگی تو پبلشر نے اسے سر بازار جسمانی مقابلے کے لئے بلکارا۔ جیسا کہ کپور نے بھی بے تکلف مسکراہٹ کے ساتھ کہا میں تو آپ سے مذاق کر رہا تھا اور میں وہ کتاب پبلشر کو مفت دے دی۔ اسی طرح ایک مرتبہ لاہور کے ایک سیاسی وکیل اور ادبی مجاہد نے اس کے ایک طنزیہ مضمون لکھنے پر ڈوکل کے لئے بیکار تو کپور نے معافی مانگی لی۔ اس کا مقررہ کر لڑائی صرف عقلمندوں سے کرتی چاہئے۔ مودکوں سے لڑائی کرنے میں ہڈیاں ٹوٹ جاتے کا احتمال ہے جو ایک نہایت احمقانہ عمل ہے۔ چنانچہ عقل مندوں کے ساتھ لڑائی کرنے میں اسے بے حد لطافت آتا ہے ایک مرتبہ محفل میں ہوتی تھی تو ایک نیشکچیز سی قسم کے مصنف تشریف لائے جو کپور سے بے حد تالاں تھے۔ چنانچہ انہوں نے باتوں باتوں میں اپنی ذہانت کا ستھیا نکال کر کہہ رہا تھا۔ ”آزمائی شروع کر دی۔ کپور نے کہا۔“ صاحب میں تو آپ کو بہت شریف آدمی سمجھتا تھا۔ ان صاحب نے فوراً چوٹ کی اور کہا۔ ”کپور صاحب!“ میں بھی آپ کو شریف ہی آدمی سمجھتا تھا۔“ اس پر کپور بھڑک اٹھا اور بولا۔ ”معاذ کبھے! آپ ٹھیک کہتے تھے، غلطی مجھ سے ہوئی۔“

کتبِ لال کپور صرف طنز نگاہی ہے۔ بلکہ اس میں سنجیدگی اور متانت کے جواشیم بھی کافی مقدار میں ہیں۔ روزِ زندگی اور سماج کے ہر مسئلہ پر اپنی ایک — رائے رکھتا ہے۔ مثلاً خدا کے متعلق اس کا خیال ہے کہ اس کے وجود کو تسلیم کر لیتا چاہیے کیونکہ دنیا میں بیک وقت اتنی خوبصورتی اور مائی بد صورتی پیدا کرنا کسی بہت بڑے اعلیٰ اور برتر وجود کا ہی کام ہے۔ مگر وہ کسی مذہب کو نہیں مانتا۔ کیونکہ اس کا خیال ہے کہ کسی بھی مذہب میں کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں کہی گئی ہے جسے ذہین آدمی پہلے سے نہ جانتا ہو لیکن — وہ اچانک رومانیٹک سا موڈ بنا کر کہتا ہے۔ مذہب میں جہاں جہاں بھی شریعت کے عناصر پائے جاتے ہیں وہ اسے بے حد پسند آتے ہیں۔ گیتا کے اشلوک اور قرآن کے آیتیں۔ پر وہ مجبوراً اذیتا ہے۔

وہ اردو زبان کو ایک اہامی زبان سمجھتا ہے کیونکہ اس کا خیال ہے کہ دنیا کی ہر اہامی زبان کے خالص صورتِ قرین اور تاثیر انگیز پہلو اردو زبان میں موجود ہیں۔ اس زبان کو مارنے کی کوشش بالکل ایسے ہی ہے۔ جیسے کوئی چیکنگر خاں کسی بہت بڑے علمی کتب خانے کو غلام دے۔ اور اس جگہ پر ایک قوجی خیمہ کھڑا کر دے: کیا اردو زبان صرف دہلی اور لکھنؤ کی زبان ہے؟ میں نے اس سے ایک بار پوچھا تو اس نے ہنر کر جواب دیا کہ نہیں۔ لکھنؤ میں تو اردو زبان بے حد غلط بولی جاتی ہے انھیں تو بھی اتنا بھی شعور نہیں کہ بیل نڈ کر ہے یا موٹ۔

جب اس کے احباب اسے بتاتے ہیں کہ تم ادبی اعتبار سے شیخ سن سے مشابہت رکھتے ہو تو وہ خوشی کے پھول نہیں سماتا۔ لیکن جب اسے یہ خیال آتا ہے کہ شیخ سن تپ دن سے مرا تھا تو وہ گھبرا جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ وہ شیخ سن بالکل نہیں بنے گا۔

حالانکہ ایک ماہر پامٹ نے اسے صاف صاف بتا دیا تھا کہ تمہاری موت باضی کی خرابی کے باعث ہوئی۔

# پیاز کے چھلکے

مگر خط اس کو لکھوائے کوئی تو ہم سے بکھوائے  
ہوئی صبح اور دھڑک کر کان پر گھر سے قلم نکلے





کہ نہیں بلکہ گورنمنٹ کو ہی عقل مند سمجھتے ہیں۔ سوچنے لگتے ہیں کہ بچوں کو بلان کر کے  
 ہی پیدا کرنا چاہئے۔ ورنہ سماج واد پیدا نہیں ہوگا، بچے ہی پیدا ہو کر رہیں گے۔  
 مگر میرا خیال ہے کہ جو لوگ کم بچے پیدا کرنے کے نعرے دگاتے ہیں۔ وہ  
 بڑے لکھے جاہل ہیں۔ کیونکہ بچے پیدا کرنے کا تعلق سماج واد سے نہیں ہے۔ صرف  
 سماج سے ہے۔ مثلاً کم سے کم بچے کا مطلب یہ ہے کہ صرف ایک بچہ پیدا کیا جائے  
 کیونکہ ایک بچے سے کم بچے پیدا کرنا ممکن نہیں۔ لیکن اگر وہ ایک بچہ نالائق  
 نکلی آئے۔ تو آپ کیا کریں گے۔ کیونکہ تاریخ کہتی ہے کہ ہر گھر میں ایک نہ ایک بچہ ضرور  
 نالائق نکلتا ہے۔

اس لئے اگر بچہ ہی ایک ہو تو نالائق ہونے کی ذمہ داری بھی اسے ہی اٹھانا  
 پڑے گی۔ لہذا ایک نالائق بچے کے مقابلے پر ایک لائق بچہ پیدا کرنا ضروری ہو جاتا  
 ہے تاکہ بڑا بھائی اپنے بڑے سے کہہ سکے "اجی رگھو ناتھ جی! وہ تو کچھ میرا نصیب  
 اچھا تھا کہ چھوٹا بڑا عقل مند نکلی آیا۔ ورنہ بڑے نے تو گھر کی لٹیا ہی ڈبو دی تھی۔  
 یعنی اب کم سے کم بچوں کی تعداد دو بچے ہو گئی۔ جو گویا سماج کی بنیادی  
 ضرورت ہے مگر یہ دونوں بچے، لڑکے ہونے چاہئیں۔ کیونکہ اگر ان میں سے ایک  
 لڑکا ہو۔ تو نالائق ہو اور دوسری لڑکی ہو۔ جو بیاہی جائے تو آپ کے بچے کیا باقی  
 رہا۔ لہذا دو لڑکے ضرور ہونے چاہئیں۔ ایک نالائق دوسرا لائق۔ اور دو لائق  
 کے لئے تین سوچا بچے ایک ہیں ہونی چاہئے تاکہ بھیا کو راکھی یا ندھ سکے۔ بھیا کی  
 یاد میں گیت لگا سکے۔ اور ہر گھوڑے کی ٹاپ، ہر موٹر کے ہارن اور ہر بائیکل  
 کی گھنٹی سن کر سمجھے کہ میرا بھیا آ رہا ہے۔

ادریوں سماج کی ضرورت کے لئے نین بچوں کا کوٹا منظور کرنا ہی پڑے گا۔  
 جب یہ نینوں بچے بڑے ہو جائیں گے۔ تو کھلے ہرے، کم بخت ڈالنے کی مار کھا کھا کر

سیرس میں ہو جاتی ہیں۔ اور والدین کو بڑھ کر دیکھیں گے۔ اس سیرس میں منہ کی جھلک  
 دفعتاً کوڑھنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک شخص نفعی سی سادہ اور معصوم، قوتی سی  
 آواز گھر کے آنگن میں گونجنے رہے۔۔۔ امدیوں میں، جب والدین ادھیڑ عمر کو پہنچ  
 جاتے ہیں، تو ایک شخص بچے کی مدد غریبوں کی سہنے کی تمنا ضرور کرتے ہیں۔ والدین  
 جو زمانے کے تھیلے کھا کھا کر بلاڈ پریش کا عام شکار ہو جاتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ  
 ایک قوتی آواز انہیں لوری دے کے سلا سکے۔ اور اگر اپنا بچہ نہیں ہو گا، تو بڑھوسا  
 کے شخص کو سینے سے لگائے پھرے گا۔ مگر دوسروں کے بچے کا اعتبار ہے۔  
 آجائے تو قریب آجائے۔ نہ آئے تو دور سے آنگوٹھا دکھا دے۔ اور ادھیڑ آواز میں  
 کہے۔ "میں! یہ آدمی مجھے مارتا ہے۔"

اس لئے بڑھوسا کے بچے کی انسلٹ سے بچنے کے لئے چوتھا، اپنا، شفا  
 بچہ بے حد ضروری ہے۔

میں جوں جوں زیادہ سوچتا ہوں بچے بھی زیادہ ہوتے جا رہے ہیں۔ مگر  
 میں نے بات قاعدہ حساب لگا کر سوچا ہے کہ آٹھ سے کم بچوں کے بغیر گزارنا نہیں ہو سکتا  
 مثلاً فرض کیجئے کہ آپ کے آٹھ بچے ہوں۔ قرآن میں سے ایک لڑکا تر گھر سے ضرور  
 بھاگ جائے گا۔ کیونکہ تیرہ اور پندرہ برس کی عمر کے درمیان ہر لڑکا گھر سے بھاگ تا  
 ہے۔ اس لئے ریزوٹاں میں سے ایک بچہ الگ ضرور کر لیا جائے، تاکہ وہ بھاگ  
 سکے۔ بھگوڑے لڑکے پر پریشان ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ کیونکہ وہ سماج  
 میں بڑا آدمی بننے کے لئے ہی بھاگتا ہے۔ صرف بھگوڑے لڑکے ہی ہوتے  
 ہیں۔ جو فلم کے ہیرو بن جاتے ہیں، میں نے اکثر بھگوڑے لڑکوں کو شاعر،  
 ایڈیٹر، فلاسفر بننے دیکھا ہے۔ حتیٰ کہ آج کل جو ہمارے نیشنل لیڈر ہیں  
 وہ بھی گھر سے بھاگے ہوئے لڑکے ہیں۔ اور اگر لیڈر نہیں بنتے تو بڑے ہو کر

ڈاکو بن کر ابھرتے ہیں مگر ابھرتے ضرور ہیں۔

چنانچہ آٹھ میں سے ایک بچہ تو آپ کو ڈاکو اور لیڈر وغیرہ بننے کے لئے علیحدہ کرنا پڑے گا۔ آٹھ میں سے ایک خارج۔ باقی رہ گئے سات۔ ان میں سے لڑکیوں کو تو ایک دم نکال ہی دیجئے کیونکہ وہ پر یاد دھن ہوتی ہیں۔ بیک آپ کا دھن دوسروں کا۔ وہ ضرور بیاہی جائیگی۔ لیکن یہاں ایک احتیاط ضرور کریجئے کہ وہ ساتوں کی ساتوں لڑکیاں نہ ہوں۔ ورنہ سارا دھن پرایا ہو جائے گا۔ اور بیک دیرالیم ہو جائے گا۔ کم از کم دو زیادہ سے زیادہ تین لڑکیاں ہی ایسی ہوں جو دامادوں کے گلے میں مرہ دی جائیں۔ ورنہ میرے ایک دو دست ہیں جن کی تو لڑکیاں ہیں۔ اور ان کا گھر بالکل گریزا سکول معلوم ہوتا ہے ایک دن میں نے ان سے کہا۔ ”جناب عالی! یہ سرکٹ کی ٹیم کی کپتانی کس لئے ہے؟“

وہ ایک گزلباس فانس بھر کر پڑے۔ ”بھائی! ایک بیٹا پیدا کرنے کی خواہش میں یہ ٹریفک چل پڑا ہے۔ اور اب نان شاپ رکنا ہی نہیں۔“  
ہاں! زیادہ بچے پیدا کرنے کے حق میں یہ مضبوط دلیل ہے۔ کہ بیٹا ضرور پیدا کیا جائے۔ ورنہ لڑکیاں چاہے لاکھ بہادر ہوں مگر ہر لڑکی جھانسی کی رانی نہیں بن سکتی۔ ”اپ آپ لگائیے حساب۔ ایک لڑکا مہاگ گیا، تین لڑکیاں بیاہی گئیں۔ باقی رہ گئے صرف چار لڑکے۔ ان میں سے ایک لڑکا اس حساب میں رکھئے کہ اسے شادی کی جانی رہے۔ کیونکہ ہر گھر میں ایک بچہ ایسا ضرور ہونا چاہئے جس پر ماں باپ اور بھائی بہن اپنے ہاتھ سینک سکیں۔ اور گالیاں وغیرہ دیں کیونکہ گالیموں کا شور اگر پیدا نہ کیا جائے اور شادی نہ کی جاتی رہے۔ تو وہ گھربالکل ڈل گنتا ہے۔ سونا سونا سا۔ شادی اور گالیموں سے گھر میں یوں لگتا ہے۔ جیسے پہا

کافی ایکڑ مٹی ہو رہی ہے اور گھر آباد ہے۔

اور ان آٹھوں میں سے ایک بچہ ایسا بھی ضرور ہونا چاہئے۔ جسے سارا گھر  
پیار کر سکے کیونکہ ہر بچے کو پیار کرنا بے حد مشکل ہوتا ہے صرف ایک بچہ ہی ایسا  
ہوتا ہے جو گھر کا چراغ کہلاتا ہے۔ اگر کبھی چراغ ہوں۔ تو دیوالی سی ضرور لگتی  
ہے۔ لیکن تیل کا خرچہ اتنا بڑھ جاتا ہے۔ کہ گھر دیوالی مناتے مناتے دیوالیہ ہو جاتا ہے  
اس لئے گھر کی روشنی کے لئے صرف ایک ہی چراغ کافی ہوتا ہے۔ باقی بچے اگرچہ  
چراغ ہوتے ہیں۔ مگر صرف نام کے چراغ۔ کسی میں تیل نہیں ہوتا ہے تو کسی کی  
بتی غائب ہوتی ہے۔

میں اب گنتی ہو گئی تھی۔ باقی رہ گئے دو دوڑ کے۔ جو مس لینش کے لئے ہونے چاہیں  
مثلاً کوئی ایر حسی آن پڑے۔ جیسے ویش کی رکشا کا مسند کٹا ہو جائے۔ تو اسے قورج  
میں بھرنے کے لئے بھیج دیا جائے۔ قورج کی بجائے اسے جبل میں بھی بھیجا جاسکتا ہے۔  
پنجاب کے ایک شہر میں پانچ بمبائی ناچار مٹن مشراب بیچنے کا دھندا کرتے تھے، اور ان  
میں سے ایک بمبائی باری باری جبل میں ہی رہتا تھا۔ نمبر ٹیپھیوٹ جانا تو نمبر چار کو  
ستھکھڑی پہننے کے لئے آگے کروایا جاتا۔ اس طرح دھندا بھی جاری رہتا اور جبل بھی  
آباد رہتی۔

اور اگر لائق بٹیا کہیں شہر سے باہر نوکری کے لئے چلا جائے تو دوسرے بچے کو قیامت  
کی ڈیوٹی پڑ گا دی جائے۔ اور نمبر سے کوہڑو سیوں سے دانگا فساد کرنے اور لامٹی چارچ  
وغیرہ کرنے کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ اور دانگے کے بعد اس سے گھر کے دوسرے کام کا ج  
کردائے جائیں مثلاً بٹر بھپاؤ، حق بھرا لاؤ، دڈ کرشیو کا بلیڈ خرید لاؤ۔ اور لٹتے ہوئے راشن  
ڈپو دے کو ملاوٹی گیموں بیچنے پر گامیاں وغیرہ بھی دے آیا۔

غرض جو آدمی مجھ پر ان آٹھ بچوں میں سے ایک بھی کم یا غیر ضروری ثابت کر کے دکھاؤ  
میں اس کا مٹا سننے کے لئے تیار ہوں۔

# کاغذ کا لباس

یورپ سے ایک ”ہی براڈ“ قسم کی خبر آئی ہے کہ وہاں کاغذ کے لباس تیار کرنے کا تجربہ کیا جا رہا ہے، ظاہر ہے یہ یورپ کی ایک اور ترقی کا ثبوت ہے۔ ورنہ وہ کوئی نہیں ممتی کہ جب افریقہ میں بھی انسان نے کپڑے کا لباس پہننا ہی نہیں سیکھا اور ”نچرل“ ہی کرگھوم رہا ہے یورپ کاغذ کے لباس تک جا پہنچا ہے۔ ہم ہندوستانی چونکہ یورپ کی نقل کرنے کو اپنے باپ دادا کا حق سمجھتے ہیں اس لئے چند سال بعد یہ کاغذی لباس ہندوستان میں پہنچ جائے گا۔ اور ایسے ہی یورپ اپنی ہر ایجاد اور انکوائپڈورٹ کر دیتا ہے۔ مثلاً صاحب بیادر، کالی میم، پتی کتا، لاک، اینڈروڈ، ہنا ہو پ، جاسوسی ناول، بلیو فلیس اور ادھ تینے، پٹی اور پٹیس۔ اس لئے کاغذی لباس بھی جلد ہی ممبئی کی بندرگاہ پر اترے گا۔ اور کناٹ پلیس کے تمام کاغذ مرچٹس اپنے بورڈ پر نیا درائیوئل NEWARAIVEL کے نام سے جاکے ذریعہ کاغذی لباسوں کا فہرست لکھ دیں گے۔

(۱) - آرٹ سپر کی بیش مشربی - جس پر ریٹا بیورنہ کی سرنگی نقد بر بھی چھپی ہوئی ہے۔

(۲) نیرز پر سنٹ بیش مشربی ہندوستان کے صرف مفلس باشندوں کے لئے سستی اور ایک دن کی پارٹیدا

(۳) بشر سپر کے دو ٹپے - کالج کی مکین اس میں رنگیوں کے لئے جو سستی ایک پھرتک سے ننگ کی طرح اڑ جائیں۔

(۴) پوسٹر سپر کے کرتے - سیاسی لیڈروں کے لئے جن پر سیاسی جلسے کا اعلان بھی چھپا ہوا ہوگا

نوٹ: اپنے آرڈر خود ایک کرا دیں۔ ورنہ مال ختم ہو گیا۔ تو دوسرے جہاز کا انتظار کرنا پڑے گا۔ اور خطرہ ہے کہ اسرائیل اور مصر کی جنگ شروع ہو گئی۔ تو جہاز ہنز سوز میں ڈبو دیا جائے گا۔

اگر ہندوستان میں سپیوں کی طرح کاغذی لباس کا رواج بھی عام ہو گیا تو رتوی کی صنعت پر مڑا اور کاغذ کی صنعت پر اچھا اثر پڑے گا۔ یعنی رتوی اتنی سستی ہو جائے گی کہ امیر لوگ شرم کے مارے اس کا استعمال ہی ترک کر دیں گے۔ اور بہت سے کھدو بھنڈا رجوع کل امیر زادوں کے فیشن کے بل بوتے پر چل رہے ہیں بند ہو جائیں گے۔ لیکن دوسری طرف کاغذ جو پہلے ہی مہنگا ہو چکا ہے، مزید اتنا مہنگا ہو جائے گا کہ بیک کے پیسے سے بھی نہیں ملے گا۔ اور خطرہ ہے کہ بچوں کی سکول کی کاپیاں اور سکالچ دہکی کے رمیٹ ایک سطح پر آ جائیں گے کاغذ کے فضل استعمال پر سرکار کی فصول پابندیاں لگ جائیں گی۔ اور شاید یہ ایک سخت دردناک لمحہ ہو گا کہ سرکار اپنے اوپر پابندیاں لگا کے۔ اور یہ جو سماج داد کی پلیٹی کے لئے آئے وہ خشک اور بوجھل رسالے

بھٹل اور دشتا ویزات چھاپ چھاپ کر دوی کے اخبار لگانی رہتی ہے۔  
 انہیں کلینا بند کرو۔ اور جتنا سکھ کا سامنے لے کہ سماج واو سے پٹا چھوٹا  
 اہلہ دوی کے سوداگر آہ و زاری کریں گے۔ کہ مہارا کا رو یا رچو پٹ کر دیاجی  
 دوسرا اثرا اخباروں پر پڑے گا۔ یعنی ان کے صفحات کم اور قیمت زیادہ  
 ہو جائے گی۔ صبح آپ کا اخبار کا پرچہ ملے گا۔ جو صرف رومال سائز کے دو صفحوں  
 پر مشتمل ہوگا۔ اور قیمت دو روپے ہوگی۔ امیر لوگ تو اسے پڑھ کر ہینکے میں گے  
 مگر غریب لوگ جب اسے پڑھ چکیں گے۔ تو بطور رومال جیب میں ڈال لیں  
 گے۔ اور بوقت ضرورت نکال کر پینر پر نچھ لیا کریں گے۔ اور جو غریب پائالہ  
 پلائوں کے قائل ہوں گے۔ وہ پندرہ دنوں کے اخبار جمع کر کے دوی کے  
 حوالے کر دیں گے۔ کہ ان سے ایک پاجامہ بنا دو۔ اور اگر کچھ کمزریں بچا سکے  
 تو ان سے منہ کا "انڈر ویئر" بھی سی دینا۔

ابھی کا غدی لباس نیکر زے یہ نہیں بتایا۔ کہ کاغذ۔ کا لباس کتنی دیر  
 چلے گا مثلاً صبح آپ نے کاغذ کی ایک پتلون پر سی کرائی۔ پہن کر باہر نکلے تو بارش  
 میں بھیگ گئی۔ اور کاغذ گلی کر دی بھی دھجی ہو گیا۔ لہذا ضروری ہے۔ کہ کاغذی  
 پتلون پہننے کے بعد کام میں ہی باہر نہ نکلا جائے۔ لہذا کاغذ اور کاغذی ملزوم  
 ہو جائیں گے اور بے کار لوگ آؤٹ آف پیکر زہو جائیں گے۔

مگر ایک بات ظاہر ہے۔ کہ کاغذی لباس بے حد سستا تیار ہو جائے گا۔  
 موجودہ سٹینڈرڈ کے مطابق قمیص پتلون پر دو اڑھائی روپے کا کاغذ لگے گا۔ اسے  
 دھوئے کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔ گویا صابن کی بھی بچت ہو جائے گی۔ ایک  
 کھانا پینا شخص ہر روز نیا لباس پہن سکتا ہے۔ غریب آدمی صفحے میں ایک بار  
 اور درمیانہ کلاس کے صفحے میں دو بار۔ لیکن اگر بالو صاحب بس پر چڑھنے کے لئے



دھکم پیل کا نشانہ بن گیا۔ تو قمیص اور فٹلن دونوں بچٹ جا میں گئی صرف بیلیان پہن کر ہی گھر جائے گا۔ اور انڈرووڈ لیکن کاغذ کی بھی کمی اقسام ہوتی ہیں بالکل ایسے جیسے انسانوں کی کمی اقسام ہوتی ہیں۔ مثلاً کسی سمگلر ہیں۔ کسی بیک مار کیٹے، کسی سرکاری سٹیج کسی گرسٹ افسر اور کسی غنڈے۔ اس لئے ہر قسم کا انسان اپنی ہی قسم کا کاغذی لباس پہنا کرے گا۔ اہل زر لوگ آرٹ پیپر کے سوٹ تیار کروائیں گے۔ سفید پوش سٹرافاؤسٹ پر سوٹ کاغذ جس پر سنا میں جھپتی ہیں۔ اور جنھیں پہنے ہوئے وہ انسان کی بجائے کتا میں معلوم ہوئے لکھنؤ کے بانے جو ٹھل کا کرتا، موٹے کبار اور کان میں بیڑی ٹاکائے نکلتے ہیں۔ وہ تنگ کا کاغذ استعمال کریں گے۔ لیٹر پیڈ کے کاغذ کے کوٹ صرف افسر لوگ پہنا کریں گے۔ تاکہ ذرا کلرکوں پر رعب پڑے۔ اور کلرک لوگ یا تو اخبار کا کاغذ سے ہی قمیص جو امیں گے۔ اور یا اس کرافٹ پیپر سے جن سے سودا سلعٹ لانے والے لفافے بنائے جاتے ہیں۔

البتہ وہ اپنی ننگائی ابری پیپر کی خریدیں گے۔

اور فکر تو نسوی جو نرالین کا عاشق بنا پھرنا ہے اور جس کے نام بڑے اور درشن چھوٹے ہوتے ہیں۔ وہ پوسٹر پیپر کا سہارا لے گا اور دور سے آتا ہوا یوں لگے گا۔ جیسے کسی ٹرینڈو میں کا پوسٹر چلا آ رہا ہو۔

ہاں انسانوں کی طرح کاغذی لباسوں کے بھی الگ الگ طبقے بن جائیں گے۔ دکاؤں پر کپڑوں کے نقان کی بجائے کاغذ کے تہ کے مہوئے نقان رکھے نظر آئیں گے۔ ان کاغذی کپڑوں کے بھی مختلف نام ہوں گے۔ مثلاً بزاز آپ سے پوچھ گا

”جناب آپ کو نئے کاغذ کا نامٹ سوٹ بنانا پسند کریں گے“

”اجی، جناب وہی جس پر فلمی میگزین چھپتے ہیں۔“

”فلمی میگزین تو ان پاپولر ہو گئے ہیں۔ ہم ہر کی چمک دمک زیادہ - اندر سے لکڑوں کوں آج کل تو ٹائٹل سوٹ کے لئے وہ کاغذ پسند کیا جا رہا ہے جس پر کیلنڈر چھاپے جاتے ہیں، ایک ٹائٹل سوٹ پندرہ دن چل جائے گا۔ گارنٹی ہے۔“

”چلو، وہی دے دو۔ کیا اس پر نئے سال کا کیلنڈر چھپا ہوا ہے؟“

”ہاں!“

”تو پھر ٹھیک ہے۔ کم از کم پندرہ دن تک تاریخیں دیکھنے کی آسانی ہو سکی“

# شادیوں کے سہرے

دو چار دن گزرے ، دہلی میں ہر طرف شادیوں کے منگامے تھے جسے دیکھو وہ شادی کر رہا تھا یا شادی کی دعوت پر جا رہا تھا ۔ جس گلی سے گزرتے ہیں ریکارڈ زور شور سے بھینسا سنائی دیتا ہے ۔

اب ابھی جا کہ میزبی راہ میں کھڑے ہیں ہم

یعنی مطلب یہ کہ لڑکی والے ، لڑکے والوں کو مخاطب کر کے کہہ رہے ہوتے کہ آئیے برسات کا ٹائم تو آٹھ بجے رکھا تھا مگر آپ آئے ہی نہیں — سوالونج رہے ہیں ۔ کیا کارن ہے ؟ ہم نے آپ کی سیول کے لئے پائن اپل کی پانچ سو بوتلیں منگا رکھی ہیں ۔

ادھر لڑکے والوں کے ہاں یہ جرائی ریکارڈونج رہا ہوتا ہے سے

ایک ہندی کے دو گنارے ملنے سے مجبور

یعنی مطلب یہ کہ وہ لڑکے والوں سے مخاطب ہو کر کہتے کہ لمبے ! ہم کیسے

پہنچیں ، شادیاں اتنی زیادہ ہیں کہ بہن برائی ہی نہیں ملتے ۔ دولہا کے لئے نفقہ سنگی  
 - مانگے یا ان سے گھوڑی مانگی تھی ، لیکن وہ گھوڑی دوسرے دولہوں کو ہی "منزل  
 دلہن" تک پہنچانے میں مصروف ہے ، ابھی قاریغ ہو کر ہی نہیں آئی ، مگر گھبراٹے  
 نہیں ۔ پائن ایپل کی بوتلیں واپس نہ کیجئے ، کیونکہ ہم کسی نہ کسی طرح برائی  
 اکٹھے کر کے لے ہی آئیں گے ۔ ہر طرف آدمی دوڑا رکھے ہیں ۔

برائیوں اور گھوڑیوں کی حوصلہ شکنی ————— قوت ————— تو ملتی ہی ۔  
 اگرچہ اس کے باوجود سارے بیاہ ہو گئے ، لیکن ایک اور کرائس بے حد  
 گہرا تھا اور وہ تھا سہرائیس شاعروں کا کرائس ۔ یوں نزدیکی میں کوئی سی ایٹ  
 انشا داس کے بچے سے ایک شاعر نکل آتا ہے جو اپنے ہاتھ میں چھپا ہوا سہرے  
 کا کاغذ لئے بیٹھا رہتا ہے اور ایٹ اٹھاتے ہی آپ سے پوچھتا ہے ۔

"ہاں جی فرمائیے ! آپ کو کس کا سہرا لکھوانا ہے ؟"

"برخودار طول عمر ، عزیز پر دین کمار کا ؟"

"دلہن کا نام لکھوائیے ۔"

"عزیزہ پراسول کمار کی ۔"

"تو سنئے ۔ غرض کیا ہے کہ ۔"

چاند کی مالنے لگے گوندھا سہرہ پر دین ہے

اور سہرے میں جو دھاگا ہے بڑا مہین ہے

ہے ادھر پراپھول خوش اور ادھر بچہ خوش

دونوں کی جڑی کہواک ہند ہے اک چپیا ہے

اور پھر سہرے میں دولہا کے باپ ، اماں ، ناموں ، ممانی ، کھادرج ، خالہ ، بوائے

حتیٰ کہ دولہا کے پسندیدہ سائیکل ”ریلے“ کا نام بھی ”ڈولوا“ کر سہرا لکھوانے والا چلا جاتا ہے۔ اور شاعر پندرہ روپے (شاعر ذرا ہلکا ہو تو دس روپے) حبیب میں ڈال کر پھر اسی انیٹ کے نیچے بیٹھ جاتا ہے اور یہ سوچ کر بے حد خوش ہوتا ہے کہ سہرا لکھوانے والے کو مصرعوں کے وزن کی سوجھ بوجھ کم تھی، ورنہ بڑی مشکل پیش آتی: ”کیونکہ لفظ“ مہین“ بڑی ذلیل کن حد تک بے وزن ہو گیا تھا۔ لیکن پردین کے ساتھ مہین کا ہی قافیہ چل سکتا تھا۔ کم بخت دولہوں کے بھی آج کل عجیب و اہم بات نام چل پڑے ہیں: ”پردین کمار“۔ اب پردین کے بار وزن قافیہ کہاں سے تلاش کئے جائیں؟ مہین“ کا ایک قافیہ تھا۔ اگرچہ بے وزن تھا ”دھاکے“ کے ساتھ کہنے سے بات میں بات پیدا ہو گئی، ورنہ ”ٹین“ کا قافیہ بھی چل سکتا تھا، مثلاً بوں کہ ۔۔۔ پراپھول ہے ڈیو کا آنا پردین خالی ٹین ہے

انہی دنوں میرے ایک دوست کے ناخلف بیٹے کی شادی تھی (دراصل میرا دوست اس کی شادی کروا کر اسے ناخلف بنانا چاہتا تھا) چنانچہ میرے دوست نے مجھ سے کہا ”یا زکریا قلمی! ایک سہرا سہیں بھی لکھوانا ہے۔۔۔ کوئی شاعر بتاؤ۔“

میں نے کہا ”چلو، کہیں سے ڈھونڈتے ہیں، شاعروں کی کسی نہیں تھا ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔“

چنانچہ ہم شاعر ڈھونڈنے نکلے۔ ایک پرواڑی سے پرچھا، اس نے تباہ کہ ایک شاعر صاحب گھونچہ مالدوی ہر روز میری دکان پر بیٹھا کرتا ہے۔ سنا میر سے گم ہے، مگر صاحب ایسا گجب کا سہرا لکھتا ہے کہ چاند توڑتا ہے۔“

”تو وہ کوئی روسی راکٹ ہو گا، شاعر نہیں ہو گا۔“ میں نے کہا

ہم ابھی باتیں کر رہے تھے کہ سامنے سائیکل دکشا پر سے جناب گھونچو  
 بادلوں گزرے، ہوا ڈیڑی نے آواز دی ”ارے گھونچو کے بچے! ادھر آؤ سارے!  
 یہ بابو صاحب سہرا لکھوانا چاہیں تم سے۔“

چنانچہ گھونچو نے دور ہی سے ہوا میں ہاتھ ہرایا اور بولے ”میںیں فرصت  
 نہیں پنڈت جی! کتنے روپے والا سہرا لکھوانا چاہتے ہیں؟“  
 ”پانچ روپے دیں گے“ میں نے فرخ کا اعلان کیا،

اول ہوں!۔۔۔ ابھی ساڑھے سات روپے کا ایک سہرا دے کر آ رہا  
 ہوں اور آٹھ روپے کا ایک اور سہرا دینے جا رہا ہوں۔“  
 ”تو سارے سہارے پان سگر سیٹ کی ادھار تو چکائے جا۔ اتنا کمار رہا ہے؟“  
 ہوا ڈیڑی نے موقع غنیمت سمجھا۔

”شادیان ختم ہو لیں پنڈت جی تو پھر بات کریں گے تم سے۔ ٹانا!“

دو چار اور شاعروں کی خدمت میں حاضر ہوئے مگر کسی نے کھل کر بات  
 نہ کی۔ ایک شاعر کی بیوی نے تو ہم پر حملہ بھی کر دینا چاہا اور گرج کر بولی۔ ”میں  
 نہیں جانتی کون فکر تو منسوی شو منسوی ہے۔ پیسے دو اور سہرا لکھواؤ بیس روپے  
 سے کم نہیں لگیں گے ہم نے کوئی لنگر نہیں کھول رکھا۔“

اچانک تنک ہار کر مجھے خیال آیا کہ کسی جھپا پر خانہ میں چلا جائے۔ شاید  
 وہاں سے کسی، لنگر چلانے والے شاعر کا پتہ چل جائے۔ پرسی میں پہنچے تو پرسی  
 کے میجر نے کہا،

”فکر صاحب! آپ بھی کتنے جاہل ہیں! (آجکل مجھے اس لفظ کا پل)“ پر کسی

غصہ نہیں آتا، جتنے سہرے چاہئیں ہم سے لیجئے۔ ہمارے پاس اس وقت کم از کم مختلف قسم کے ساڑھے چار سو سہرے موجود ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک انتخاب کر لیجئے۔

جیانیچہ ملی نے ساڑھے چار سو سہروں کے ہجوم میں ڈوب کر لگا دی اور ایک سہرا نکال لایا، جس پر لکھا تھا۔۔۔ ”زور نکاد سہرا“۔  
 بہ تقریب شادی خاصہ آبادی عزیزین بھوپت رائے ولد لالہ حکومت رائے ریٹائرڈ انجینئر آف تیلنگ۔

اور نیچے شاعر کا نام لکھا تھا۔ پیش کردہ از طرف جناب ایڈیٹر پانی پتوی۔ سہرے کا پہلا شعر تھا۔

واہ بھوپت رائے کی بھوکی پت بنا ہے آج سہرا

اور حکومت رائے کی پگڑی کر رہی ہے راج سہرا

میں نے کہا۔ ”مگر میٹر صاحب! ہمارے دولہا کا نام تو بھوپت رائے نہیں ہے بلکہ کل دنت سنگھ ہے۔ اس لئے یہ سہرا نہیں چل سکتا۔“

”واہ چل کیوں نہیں سکتا؟“ میٹر نے کہا۔ ”مصرعہ میں سے بھوپت رائے کو نکال کر کلونت سنگھ رکھ دیتے ہیں۔ مثلاً اب مصرعہ یوں بنے گا۔

واہ کلونت سنگھ کی کل کا دنت ہے یہ آج سہرا

میں مسکرا دیا اور بولا۔ ”بس دنت کی بجائے دنت کر دیا جائے۔ مثلاً

یوں کہ۔۔۔

واہ کلونت سنگھ کی کل کا دنت ہے یہ آج سہرا

”بالکل ٹھیک ہے۔“ میٹر نے کہا۔ ”یہی سہرا اس بار کئی آدمی لے گئے ہیں ہر ایک نے بھوپت رائے کا نام بدل کر اپنے دولہا کا نام رکھ دیا۔ اور دیکھئے

جی، ہر شاعری میں کیا کمال کی چیز ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ کسی بیڑھتیب پانی پتھری  
 نے یہ سہرا لکھ کر دیا تھا۔ اب ہر ایک دولعل کے لئے فٹ سہرا ہے۔ یہ ہے شاعری  
 کا جادو! "

شاعری کے جادو سے متاثر ہو کر ہم نے سہرا چھپنے کا آرڈر دے دیا۔ اور  
 یقیناً مانے براتیوں نے اس سہرے پر فنی تالیاں بجائیں کہ جگر مراد آبادی  
 کو بھی اتنی داد کہاں ملی ہوگی۔



# مکانوں کے نمبر

میں نے مکان نمبر سی۔ پانچ سو چار کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہاں ایک صاحب نے مجھے ڈمز پر بلایا تھا۔ یہ صاحب شاعری بھی کرتے تھے اور سکومٹروں کی بلیک مارکنگ بھی۔ مگر مجھے انھوں نے شاعری کے سلسلے میں دعوت دی تھی۔۔۔ شاعری میری کمزوری تھی اور بلیک مارکنگ ان کی۔

کھٹکھٹ سن کر ایک محترمہ برآمد ہوئی دبا لکل غزل مسلسل معلوم دے رہی تھیں) میں نے غرض کیا۔ گردور صاحب تشریف رکھتے ہیں؟ وہ مصرعہ طرح گنگناٹے ہوئے بولیں۔ یہاں کوئی گردور صاحب تشریف نہیں رکھتے۔ یہ تو رستوگی جی کا مکان ہے۔

میں نے رستوگی جی کی خوش نصیبی پر رال ٹپکائی جو اس حسین غزل میں تخلص کے طور پر لگا ہوا تھا۔ اور پوچھا۔ کیا یہ مکان نمبر سی۔ پانچ سو چار نہیں ہے؟ جی نہیں۔ یہ مکان نمبر سی بیڑ دو، پانچ سو چار ہے۔

سوری! میں نے آپ کو خرا مخواہ ڈسٹرپ کیا۔ حالانکہ جی چاہتا تھا کہ سرور کا مکان مجھے ملے یا نہ ملے لیکن اس تنازعہ کو اسی طرح ڈسٹرپ کیے جاؤں۔ لیکن وہ جلد ہی سے کواڑ بند کر کے چلی گئی۔ اور اپنے پیچھے اپنا وکٹش آسنک اور میری حسرتی چھوڑ گئی۔

میں آگے بڑھ گیا۔ سسی بڑھ دو کی پوری قطار ملے کر ڈالی۔ پھر سسی بڑھ گیا، پھر سسی بڑھ چار۔ مگر غرض سسی کہیں ملا ہی نہیں۔ ایک دو آدمیوں سے پوچھا میں کسی نے بتایا کہ سسی بلاک اس کالونی کے شروع ہوتے ہی گندے نالے کے پاس ہے کسی نے مشرندہ کرتے ہوئے کہا سسی بلاک تو اس کالونی میں ہے ہی نہیں۔

ایک صاحب نے جو شاید ایک ریشاڑو بوڑھا تھا۔ اور سوائے نظام سیدو کے اسے اور کوئی کام نہیں رہا تھا۔ میرے کاندھے پر شفقت بھری تھپکی دیتے ہوئے بولا: آپ کو سسی کالونی میں یہ مکان ڈھونڈنے کے لئے نکالے ہیں؟

”سسی کالونی میں۔“

مگر یہ تو سسی کالونی ہے۔ اور سسی اور سسی دو الگ الگ عورتوں کے نام تھے۔ ہاں یاد آیا، سسی کالونی میں واقعی ایک سسی بلاک موجود ہے۔ آپ وہاں جا کر معلوم کیجئے۔“

”سسی کالونی کہاں ہے؟“

”جہاں سسی کالونی ختم ہوتی ہے۔ سسی کالونی شروع ہو جاتی ہے۔“

اور اب یہ مت پرچھے کہ سسی کالونی کہاں ختم ہوتی ہے پھر یہ بھی کہیں اور سسی کالونی شروع ہوتی تو معلوم ہوا کہ یہ تو اس کالینیشن ایریا ہے۔ پرانی سسی کالونی ان کنڈروں کے پاس ہے جنہیں مغل بادشاہ اپنے زوال کی نشانی کے طور پر چھوڑ گئے تھے۔ یہ گھیسٹس بھی بے حد وحیشت ثابت ہوا۔ اور آخر ہوئندہ یا سیدہ، سسی

بلاک تلاش کر ہی لیا۔ اور جب سی نمبر پانچ سو نئی دسے مکان کا۔ پہنچا تو بلاک ختم ہو گیا۔ وہ سی بلاک کا آخری مکان تھا۔ اور مجھے مکان نمبر پانچ سو چار پانچ تھا۔ میں نے پھر ایک صاحب سے پوچھا۔ ”یہ مکان نمبر پانچ سو چار کہاں پر واقع ہو گا جناب!“

جناب نے اطلاع دی۔ اس سی بلاک کا یقینہ حصہ دسی بلاک کے عقب میں بنا ہوا ہے۔ پانچ سو کے بعد کے نمبر وہاں سے شروع ہوتے ہیں۔۔۔ اور وہ یقینہ حصہ اصل سی بلاک سے تین فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔

شاید تیاروں کی چال میرے ساتھ تھی۔ یا میں نے کچھلے جنم میں کسی اندھے فقیر کو سڑک پار کرائی تھی۔ کہ میں واقعی مکان نمبر سی، پانچ سو چار کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مکان سے ایک محترم باہر نکلیں۔ (کانی بے وزن شعر معذرت دے رہی تھیں)۔ میں نے پوچھا۔ ”گر دور صاحب تشریف رکھتے ہیں؟“

”جی نہیں۔ وہ سی پانچ سو آٹھ دسے گر دور صاحب کے ہمراہ تھائے گا۔“

”گئے ہیں۔ ان کا مالک مکان کے ساتھ چمبکڑا ہو گیا تھا۔ اسے ذرا لچھائے گئے ہیں۔“

”مگر جی! مجھے انھوں نے ڈنر پر بلایا تھا۔“

”ہاں، ہاں، وہ سی پانچ سو دس دسے سے کہہ تو رہے تھے کہ آج میرے گھر میں ایک بہت بڑا ادیب کھائے پرارہا ہے، اندر تشریف لائے۔ میں نے کسی پانچ سو ایک دسے کے بڑے کو مچھل لاسنے کے لئے بھیج دیا ہے، ان کی واپسی تک۔ ڈنر تیار ہو جائے گا۔“

اور مجھے مچھل اور تھائے سے زیادہ اس بات میں دلچسپی ہوئے۔ مگر۔۔۔ کہ ہم باہر لانے کے انسان اپنے نام سے نہیں پچھاتے جاتے۔ بلکہ مکان کے نمبروں سے پچھاتے جاتے بلکہ مکان کے نمبروں سے پچھاتے جاتے ہیں۔ جیسے ہم انسان نہیں ہیں مکان

ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ سامنے گر دوں صاحب کھڑے ہیں۔ بلکہ یہ کہ مکان نمبر سی پانچ سو چار والے کھڑے ہیں۔ انہیں مکان سی پانچ والے نے دھمکی دی ہے کہ اگر آپ نے کسی چھپو والے کے حق میں گواہی دی تو سی سات والا اپنے کسی آٹھ والے بہنوئی کو لے کر سی دس والے کے پاس شکایت لے کر پہنچ جائے گا۔ اور سارے باک میں آپ کی تھڑی تھڑی ہو بسائے گی۔

اں۔ یہ ہم نے زمانے میں سانس لینے والے ات لوں کی پراہم ہے کہ آپ کس ات ان کا نام لیں۔ تو آپ کے ذہن میں اس نام سے کوئی چہرہ نہیں ابھرتا لیکن مکان کا نمبر پکار میں۔ تو وہاں رہنے والے کی تصویر ابھرتی ہے۔ کہ اچھا وہ صاحب جن کی ناک پچوڑا سی ہے۔ اور انکلا ایک دانت ٹوٹا ہوا ہے۔ اس کا سام گر دو رہے۔ مگر صرف گر دوں کہنے سے غدر خال نہیں بنتے۔ کیونکہ مکان نمبر سی پانچ سو چار میں میں گر دوں رہتا ہے اور سی پانچ سو آٹھ میں بھی اور پندرہ میں بھی۔ اس لئے پندرہ نمبر مکان کا گر دوں الگ ہو گا۔ یعنی وہ اپر ڈویژن تھکر ہو گا۔ مگر دس نمبر مکان والا گر دوں نا جائز جس کا دھند کرتا ہو گا۔

غرض سہارا اصلی کیرکڑ۔ کان کے نمبر کے ساتھ مخصوص ہے نام کے ساتھ نہیں۔ اور پھر شاید سوشلزم وغیرہ لانے کے لئے نئی کانونیوں کے سبب مکان ایک ہی ٹائپ کے بنائے گئے ہیں۔ کیونکہ مکان بناتے وقت اس پر اسے شعر کو مد نظر رکھا گیا کہ :-

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی

تا کس نگوئید بعد از بس۔ من دیگرم تو دیگر

مجھے یاد ہے۔ ایک مرتبہ میرے ایک پریمی کے گھر اکبر ایک ٹیلی گرام دے گیا کہ آپ کے اہل انتقال فراگئے ہیں۔ چنانچہ اس گھر میں روئے پہنچنے کے لئے ایک اور

چھادی گئی اور ماتم پرستی کرنے والوں کا انتظار کیا جانے لگا۔ وہ دھکھٹے تک دو تھڑے پیٹے جانے کے بعد ڈاکیر لوٹ آیا۔ اور بولا۔ معاف کیجئے۔ وہ تار مکان نمبر بی تراسی کا تھا۔ مگر آپ کے مکان کا نمبر تو بی اکہیا سی ہے اور آپ کے نام کا تو ایک منی آرڈر ہے۔ غلطی سے منی آرڈر مکان نمبر بی تراسی کو دے آیا تھا۔ اور یوں انکھل کے آنسو منی آرڈر کی مسکراہٹ میں تبدیل ہو گئے۔ رونا دھونا مکان نمبر بی تراسی کی طرف منتقل ہو گیا۔

میں نے منتقل ہو کر ڈاکئے سے پوچھا۔ ایڈریٹ ؟ یہ فاسٹ غلطی تم نے کیوں کی ؟

وہ گڑگڑا کر بولا۔ اچھا کیا کریں ان مکانوں کے ٹریڈز اور رنگ۔ رنگ ایک جیسے لگتے ہیں ان کی الگ۔ الگ۔ کوئی پہچان ہی نہیں ہے۔ سوائے نمبروں کے۔ اور نمبر کم بخت بہت مدہم پڑ گئے ہیں۔ صحیح پڑھے ہی نہیں جاتے۔ مرنے والے کے گھر منی آرڈر پہنچ جاتے ہیں اور منی آرڈر والے کے گھر منی سیارہ شروع ہو جاتا ہے۔

# منی لبس

دہلی میں منی لبس چلتی ہیں تریوں گستا ہے منی سکریٹ پہنے فلم بولی ، کی  
 میروئی چھو کڑی جارہی ہے اور تشکیل شوق کی دعوت دیتے ہوئے کہہ رہی ہے ۔  
 ”اؤ آؤ! تمہیں اپنے ساتھ لے چلوں ۔ نظام الدین ، بھوگل ، لاجپت سنگر ۔“  
 اور جب آپ اپنی تمناؤں کی رال ٹیکاتے ہوئے ، اس منی سکریٹ کا دامن  
 پکڑتے ہیں اور لبس میں داخل ہو جاتے ہیں تو آپ کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ  
 خود داخل نہیں ہوئے ہیں ۔ بلکہ کسی نے آپ کو بالوں سے پکڑ کر اندر گھسیٹ لیا  
 ہے ۔ آپ چلا اٹھتے ہیں ۔ ”روکو لبس میرا دم گھٹ رہا ہے ۔ مجھے باہر نکلنے دو ۔“  
 اور کندہ کڑ جواب دیتا ۔ ”اب مشکل ہے صاحب ! سہاری منی لبس میں  
 جو ایک بار اندر آگیا وہ نہ اندر کا رہا نہ باہر کا ۔ نکالنے پیسے کہاں جاتا ہے آپ کو ؟“  
 ”جہنم میں“  
 ”تو ساتھ پیسے نکالنے ؟“

”مگر مجھے تو یہاں پاؤں دکھانے کے لئے ایک انچ جگہ نہیں مل رہی — میں باہر نکلتا چاہتا ہوں۔“

”باہر جانے کی ٹیکٹ بھی ساٹھ پیسے میں ملتی ہے۔ ٹکائے ساٹھ پیسے۔ اور آپ ٹھنڈی سانس بھرتے ہیں اور خاموش ہو جاتے ہیں۔ ٹھنڈی سانس کر بھی نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔ کیونکہ مٹی سکرت کے کئی شیدائیوں نے گیٹ کا گھیراؤ کر رکھا ہے۔ لہذا سانس شیدائیوں سے ٹکرا کر آچکے پاس ہی لوٹ آتی ہے یا آپ کے قریب کھڑی سواری کے کندھے پر جا بیٹھتی ہے۔ اور سواری کہتی ہے۔ ”یہ کیا ہے؟“

”میرا ٹھنڈا سانس!“

”اے! میں سمجھا، کوئی ممکن ہے۔ دیکھیے! اپنی چیز اپنے پاس ہی سنبھال کر رکھئے۔ دوسرے پر بوجھ مت ڈالئے۔ ورنہ میری ٹانگوں کا توازن بگڑ جائے گا دیکھتے نہیں، میں کتنی کوشش سے اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے ہوں۔“

”کند کڑ! کند کڑ صاحب جی، مجھے اس بلیک ہول سے باہر جانے دو!“  
اور کند کڑ یعنی بونی کی سپردن، منہ سے دس بجا کر گنگنائے گی۔ ہم تم، اک کمرے میں بند ہوں اور چائی کھو جائے۔“

اور آپ مایوس ہو کر اپنے گرد و پیش کلبائزہ لیں گے۔ مٹی سکرت کے طول و عرض پر نگاہ دوڑائیں گے تو آپ کو ایک دم معلوم ہو گا کہ آپ کا ایک پاؤں تو اس لوٹ پر رکھ لیا ہے جو آپ کا نہیں ہے۔ ٹھنڈی سی تشریح کے بعد آپ کو بتایا جاتا ہے کہ یہ لوٹ ایک عینک والے بوڑھے کلبے، مگر اس بوڑھے لوٹ کے نیچے تین لوٹ اور ہیں جنہوں نے ایک دوسرے کے پاؤں کو اپنے لئے سیڑھی بنا لیا ہے۔ اور جو لوٹ سب سے نیچے ہے وہ ایک ڈیڑھ کونٹل وزن والی دیو سی جی کا

ہے اور حسرت سے کہہ رہا ہے ۔

دیکھو مجھے جو دیدہٴ عبرت نگاہ ہو

اور میرا دوسرا پاؤں کہاں ہے : آپ حیران ہو کر ارد گرد گھڑے لوگوں سے پوچھتے ہیں ۔

”جی ۔ وہ میری تپلون کے پانچنے کے ساتھ لٹک گیا ہے “ ایک مہربان انسان آپ کو تسلی دیتا ہے ۔

” مگر میری گٹھری پر کس کا پاؤں ہے ؟ میری گٹھری میں کیلے نہیں “ ایک ادبیز عمر دیوانی نما شہری چلا اٹھتا ہے ۔

تپلون کے پانچنے والے کے پاؤں نے اپنے نیچے کیلوں کا گداز جسم محسوس کیا تو پہلے دو سیکنڈ کے لئے تو اپنے آپ کو مجرم محسوس کیا لیکن پھر آنکھیں پھیر لیں بلکہ آنکھیں بند کر لیں اور جیسے یاد خدا میں مصروف ہو گیا ۔

اتنے میں بس کو ایک جھٹکا سا لگا تو آپ کا ہاتھ جو بس کے ڈنڈے کی بجائے ایک نوجوان کی بغل میں دبائے ہوئے اخبار کو پکڑ کر اپنا سہارا بنائے ہوئے تھا ایک دم اخبار سے الگ ہو گیا ۔ اور وہ فارغ البال ہاتھ نیا ہمارا ڈھونڈنے کے لئے جو ہوا میں ٹانگ ٹوٹیاں مارنے لگا تو ایک محترمہ کی سائرس کی پلو کو پکڑ لیا ۔ جراس محترمہ کے خاوند نے پکڑ رکھا تھا ۔ چونکہ ایک سائرس پر وہ ہاتھ ایسے تھے جیسے ایک میان میں دو تلواریں سماسنے کی کوشش کر رہی ہوں ۔ اس لئے خاوند نے دانت پس کر کہا ۔

” آپ کو شرم نہیں آتی ! “

خاوند دانت پسنے کی بجائے دراصل آپ کے منہ پر ٹانچہ لگانا چاہتے تھے لیکن ٹانچہ والا ہاتھ منہ میں اس کی جھپٹا کر سنبھالنے میں مصروف تھا ۔



اس لئے وہ ملحقہ ملاخچہ بننے کے اہل نہیں رہا تھا۔ احمد دہلانیؒ بن جانا تو خاندان صاحب خود بھی قریب والی ایک اور کالجیٹ حسینہ پر جاگرتے اور حقیقت اور ہر گرجانی۔ اور پھر کالجیٹ حسینہ کے پہلو میں اپنے آپ کو "ایڈجسٹ" کئے ہوئے اس کا ایک برائے فریڈ بھی کھڑا تھا جس کی بغل میں ایک ہاکی بھی تھی۔

آپ نے محترمہ کے خاندان سے کہا کہ آپ کا بچہ شریفانہ اور مظلومانہ تھا، دیکھئے آپ کا یہ کتنا بجا ہے کہ مجھے شرم آئی چاہئے اور جو اب میرا یہ کہنا بھی بجا ہے کہ مجھے شرم آ رہی ہے۔ لیکن شرم ان منی بس والوں کو آئی چاہئے۔ جو ہمیں انسان نہیں بھڑ بھڑیاں سمجھتے ہیں۔

اور آپ کو حالانکہ کاشکار ہو کر واقعی شرم آگئی۔ جو کسی حد تک جنبوئی مٹی کیونکہ آپ نے سوچا کہ اگر یہ مجھ سے میری بہن یا بیوی یا بیٹی ہوتی اور اس کی ساڑھی کا پلو کسی باگڑیلے قسم کے حادثے کے باعث میں آجاتا تو . . . . . اور آپ نے ہاتھ پیچھڑ دیا جس سے توازن سنبھلنے لگا۔ آپ جیسے سہلے گئے۔ تاکہ اپنا ہاتھ منی بس کی بائیں دیوار سے لٹکا دیں۔ یہاں پہلے ہی کئی ہاتھ اپنی سلطنت قائم کئے ہوئے تھے۔ جو ہنسی آپ جیسے بیٹے تو ایک طفلانہ آواز آئی۔ "ڈیڈی! میری ٹوپی اس نیلے سوئیر والے نے نیچے خراوی۔"

ڈیڈی ٹوپی اٹھانے کے لئے نیچے جھپکا تو اس کا سر ایک اور سواری کی بغل میں جا گھسا۔ بغل میں دو تین سر پہلے بھی گھسے ہوئے تھے۔ انہوں نے پروٹ لے کیا۔ "اے اے! کدھر گیا آتا ہے۔ یہ ہماری سرحد ہے۔ مانگ ڈیورادن سرحد!"

اور پھر ننھے کی ٹوپی پر ایک نیم فوجی قسم کا زبردست بوٹ آپٹا۔ اور ٹوپی کو گھسیٹنا ہوا گھیسٹ تک لے گیا۔ کیونکہ ایک بس سٹاپ آگیا تھا اور کٹ کٹ کر رہا تھا چلو انکم ٹیکس دفتر یعنی بیرو پھیری کا دفتر۔ اور جیسے کمرے کی چابی مل گئی اور دروازہ

کھل گیا۔ ہندوہ میں سواریاں بیچنے اترنے کے لئے اور بیچ بچیں سواریاں اور ہر  
 چڑھنے کے لئے ایک دوسرے پر چاند ماری کر رہی تھیں، ایک کئی سواریوں کو تو  
 اس دھکا پھیل میں یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ انہیں اترنا ہے یا چڑھنا ہے۔ اور  
 اترنے اور چڑھنے والوں کے درمیان کندھ کمر کا ہل تھا۔ جو کہ جارہا تھا۔ "بغیر  
 ٹکٹ کے جو اترے گا، اسے شگم بودھ گھاٹ سے جاؤں گا۔ ہم بے ایمانی نہیں  
 پاتے۔ پیسے چاہتے ہیں۔"

اور وہ ٹکٹیں کم کاٹ رہا تھا اور پیسے زیادہ لے رہا تھا۔ ایک سواری کو  
 ٹرنک لے کر اتر رہی تھی دوسری سواری ٹرنک لے کر چڑھ رہی تھی۔ دونوں ٹرنک  
 میرے آگے سامنے ہوئے تو دونوں ٹرنک آپس میں ٹکرائے۔ کندھ کمر نے کھینچ کر ایک ٹرنک  
 گر ادیا، ایک چڑھا دیا۔ اور پھر سٹیوے دی۔ اور گائے لگا۔  
 "ہم تم اک کرے میں بند ہوں اور جانی کھو جائے۔"  
 اور دو منٹ بعد اچانک ٹرنک والی سواری چلائی۔ "روکو روکو بس!  
 میرا کس جہانے والے سے بدل گیا ہے جو بیچے اتر گیا ہے۔"